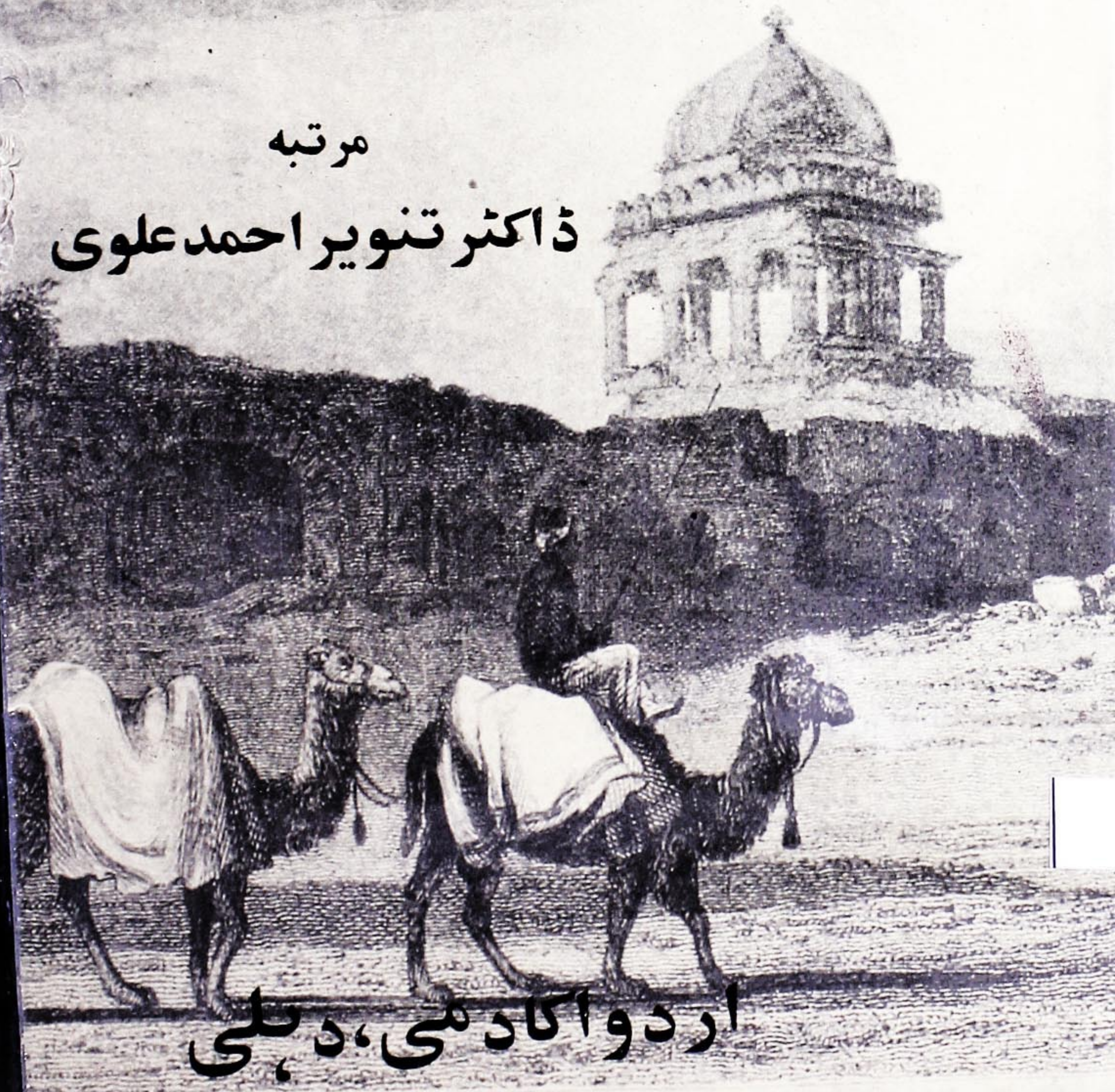


# سفر ناموں میں دہلی

(جلد اول)

مرتبہ

ڈاکٹر تنویر احمد علوی



اردو اکادمی، دہلی

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi  
Preserved in Punjab University Library.**

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ  
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ





# سفر ناموں میں دہلی

جلد اول

مرتبہ  
ڈاکٹر تنویر احمد علوی



اردو اکادمی دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی ۷۸

134152

SAFAR NAMON MIEN DELHI  
EDITED BY - DR. TANVEER AHMED ALVI  
PUBLISHED BY - URDU ACADEMY, DELHI  
PRINT - 1994  
PRICE - RS. 90.00

سنة اشاعت: ۱۹۹۴ء  
قیمت: ۹۰ روپے مکمل سیٹ (دو جلدوں میں)  
طباعت: سیما آفسیٹ پریس، دہلی  
ناشر و تقسیم کار: اردو اکادمی، دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

ISBN 81-7121-092-9 Vol. I

# نگارشات

جلد اول

صفحہ نمبر

|     |                 |   |
|-----|-----------------|---|
| ۹   | زبیر رضوی       | حرفِ آغاز   |
| ۱۴  | مرتب            | نقشِ نیم رخ   |
| ۲۵  | "               | دہلی (تاریخ و تہذیب کی ایک حسین دھنک)               |
| ۹۴  | "               | ابن بطوطہ (و) سفرنامہ ابن بطوطہ                     |
| ۱۳۴ | آغا محمد حسین   | مسالک الابصار (دارالسلطنت دہلی)                     |
| ۱۴۴ | سید زاہد علی    | جہاں آباد (مغربی سیاحوں کی نظر میں)                 |
| ۱۴۹ | مرتب            | منوچی   |
| ۱۵۲ | "               | ٹاورنیر   |
| ۱۹۶ | خلیفہ محمد حسین | برنیر کا سفرنامہ                                    |
|     | مرتب            | عہد محمد شاہی میں (شاہ جہاں آباد کی تہذیبی جھلکیاں) |



# حرفِ آغاز

● ہندوستان کے مختلف صوبوں میں قائم اردو اکادمیوں میں دہلی کی اردو اکادمی اس لیے زیادہ ہی زیرِ بحث رہتی ہے کہ وہ دارالِ خلافتِ دہلی میں سرگرم عمل ہے اور ایک طرح سے ایک ماڈل کے طور پر کام کرنے کی کوشش میں لگی ہے۔ اس اکادمی کا دائرہ کار خاصہ متنوع اور وسیع ہے۔ اس کے بنیادی مقاصد میں دہلی شہر کی ادبی تاریخ کے احوال کو، اس کی ثقافتی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر میسر اور دستیاب تاریخ اور دستاویزی مواد کو مرتب کرنے اور اسے کتابی صورت میں محفوظ کرنے کی سرگرمی خاص طور سے شامل ہے۔

اردو اکادمی کا اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ اور دستور بھی ہے۔ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر اس کے چیئرمین ہیں جو زبان و ادب میں اعتبار کے درجے کو پہنچے ہوئے اصحاب کو اکادمی کی گورننگ کونسل کے لیے نامزد کرتے ہیں۔ انہی نامزد افراد پر مشتمل اکادمی کی مختلف کمیٹیاں ہیں جو متعلقہ امور کے بارے میں فیصلے کرتی ہیں۔

اکادمی، دہلی کی ادبی، ثقافتی اور سماجی زندگی سے اپنی گہری دلچسپی کے ساتھ ملک گیر زاویے سے بھی کام کرتی ہے اور اپنی مختلف سرگرمیوں میں پوری اردو دنیا اور تخلیق کاروں سے اپنا قریبی رشتہ اور تعلق قائم رکھتی ہے۔

کل ہند نوعیت کے مشاعرے، سمینار، انعام داغراز اور ”ایوانِ اردو“ اور ”امنگ“ جیسے مقبول ماہ ناموں اور اہم عصری موضوعات پر کتابوں کی مسلسل اشاعت نے دہلی کی اردو اکادمی کو زبان و ادب کی ترویج میں مصروف ایک بے مدفعال اور متحرک اکادمی بنا دیا ہے۔



● ان جانے راستوں پر چلنے اور ان جانی سمتوں میں جا کر انسانی زندگی کی مختلف جہتوں اور کروٹوں سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے، سفر پر نکلنا انسان کا مقدر کل بھی تھا اور آج بھی ہے، پوسے نیس اگر اپنے سفر کے حوالے سے (۱۷۶-۱۷۳۳) یونان کے کھنڈر دریافت نہ کرتا تو دنیا ایک عجیب غریب انسانی تہذیب کے آثاروں سے محروم رہ جاتی۔ پرانے وقتوں میں نادیڈ جہتوں کی دریافت نہ ہوئی ہوتی تو تاریخ اور جغرافیہ کے اوراق نئی آبادیوں کے نقشوں کا آنے والے انسان کو پتہ نہ دیتے، سفر نہ ہوتے۔ راستوں کی خاک نہ اڑتی، کھلے سمندروں میں کشتیوں کے بادبان نہ کھلتے، جنگلوں اور بیابانوں میں ہاتھی، اونٹ اور گھوڑے نہ دوڑائے جاتے تو ہماری آج کی تاریخ کتنی مختلف ہوتی۔ قدیم زمانے میں انسان مختلف ثقافتی منطقوں میں بنا ہوا کہاں کس مقام اور کس خطہ ارض میں کیا کچھ تھا اس کا پتہ ہمیں کبھی نہ ملتا اگر بطلموس نے "رہنمائے جغرافیہ" کتاب نہ لکھی ہوتی، انسان نے ذیقے اور خوشبو کا راستہ SPICE TRADE ROUTE نہ دریافت کیا ہوتا، المسعودی (ابوالحسن علی المسعودی) نے تیس جلدوں میں "انبار الزمان" اور اس کا خلاصہ "مروج الذهب و معاون الجواہر" (سونے کی تلاش کے راستے اور جواہر کے معدن) نہ لکھا ہوتا، دسویں صدی عیسوی تک کے سفر نامے جسے عربوں نے ملاحتی ادب کا نام دیا ہم جوئی، جگر کاوی، حوصلہ مندی اور نڈر اور عزم کے ساتھ نئی دنیاؤں اور نئے تہذیبی منطقوں کی تلاش کرنے سے عبارت تھے مگر گیارہویں صدی ایک انقلابی صدی تھی کہ اس صدی کو ایک ایسے عہد آفریں سفر نامے کے لکھنے والے سیاح کا انتظار تھا جس کا نام البیرونی تھا۔ البیرونی کا سفر نامہ زمانہ قدیم کا ایک بے حد مستند تاریخی اور تمدنی دستاویز ہے۔ یورپ میں سفر کی پہلی جرات ہسپانوی علاقے میں پیدا ہونے والے الادرسی نے کی تھی جسے جاپان کے ساحلوں کی بے تاب موجوں کو اپنے اجنبی ہاتھوں سے چھوتے ہوئے ایک عجیب سرخوشی کا احساس ہوا تھا اور پھر مارکو پولو کی آمد ہوئی جس نے ایشیا کی پہنائیوں تک کا سفر کیا یورپ والے اسے اپنے وقت کا سب سے بڑا کذاب سمجھتے رہے لیکن یہ مارکو پولو کا سفر نامہ ہی تھا جس کو سامنے رکھ کر دنیا کے نقشے بنائے گئے اور کولبس نے ایک نئی دنیا دریافت کی۔ مارکو پولو کے بعد دوسرا اہم نام ابن بطوطہ کا ہے جس نے پچتر ہزار میل کا سفر طے کیا اور دنیا کے سیاحتی ادب میں اس کا سفر نامہ بھی مارکو پولو کے سفر نامے کی طرح

ایک سنگ میل بن گیا۔ ہندوستان کا ماضی اور اس کا جلال و جمال بہت کچھ ابن بطوطہ کے سفرنامے کے حوالے سے ہماری آنکھوں میں مجسم ہو جاتا ہے۔

یہ انکشاف یا اعتراف سفرناموں کے قارئین کے لیے دلچسپ ہے کہ دُنیا کا بہترین سیاحتی ادب جسے عربوں نے ملاحی ادب کا نام دیا ہے وہ زیادہ تر عربوں کے سفرناموں سے مالا مال ہے کہ اجنبی سرزمینوں کی طرف کوچ کرنا عربوں کی سائیکی کا حصہ تھا کیوں کہ انھوں نے بار بار یہ ارشاد ربی سنا تھا۔

” ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان جن کو ہم نے برکت دی تھی بہت بستیاں آباد کر دی تھیں جو ایک دوسرے کے سامنے اور قریب قریب تھیں اور ہم نے ایک بستی سے دوسری بستی تک کے سفر کو چھوٹا کر دیا تھا اور کہا تھا کہ راتوں کو بھی اور دن کو بھی ان میں امن کے ساتھ سفر کرو۔“

دُنیا کے نقشے پر دلی ایسی ہی ایک بستی تھی جس کی کھوج کرنے جس کے ثروت مند ثقافتی اور تاریخی ورثے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا ارمان ہر سیاح کے دل میں رہا۔ کل کا سفر بھی انسان اسی لیے کرتا تھا کہ وہ اپنے تہذیبی منطقے اور حصار سے نکل کر ایک دوسرے تہذیبی منطقے میں قدم رکھتا تھا اور تب وہ حیران رہ جاتا تھا، اور ہر طرف نئے نئے جہانوں کے دروازے کھلتے ہوئے اپنے سفر کی روداد قلم بند کرتا جاتا تھا یہ سوچ کر کہ جب وہ گھر لوٹے گا اپنے دیس لوٹے گا تو کسی برگد، الاؤ یا چوپال پر بیٹھ کر اپنے سفر کے حیرت ناک واقعات سناے گا۔

سفرناموں میں آنکھ محض سامنے پیش آنے والے واقعات کو دیکھتی اور ان کا جوں کا توں بیان نہیں کرتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر سفرنامے قدیم یا جدید زمانے کے معتبر اور مستند حوالے نہ بنتے۔ سفرنامہ منظر بھی بیان کرتا ہے اور پس منظر بھی اور ان سب کی بشارت بھی جو ابھی ظاہر نہیں ہے صرف مخفی ہے پوشیدہ ہے۔

”سفرناموں میں دلی“ برسوں پرانی دلی کی کھوج، تلاش اور اس کے دھندلے خدو خال کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش ہے کہ ماضی میں سفر معلومات کے حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا تھا اور آج سفر کے لیے پہلے سے معلومات حاصل کر لی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے سفرناموں اور اس کتاب کے حوالے سے دلی کی کوئی مربوط تہذیبی

تاریخ مرتب نہیں کی انہوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ عہدِ تعلق سے عہدِ ظفر تک دتی  
کو سیاحوں نے جس رنگ میں جس حالت میں جس آن بان اور جلال و جمال کے عالم میں دیکھا وہ  
ہمارے آنکھوں میں بھی عکس بن کر تیرنے لگے دتی نے پچھلی چھ سات صدیوں میں کیا کیا انقلابات  
دیکھے کس کروفر اور عروج و زوال کے شب و روز اس پر گزرے وہ کافی کچھ ان دو جلدوں میں  
سمٹ آیا ہے۔

اُمید ہے اردو اکادمی کی یہ پیش کش پسند کی جائے گی اور دتی کے سات آٹھ سو برس  
پڑانے ماضی کا ایک مستند تاریخی حوالہ ثابت ہوگی۔

زبیر رضوی  
سکرپٹری

حضرتِ دہلی کنشتِ دین و داد  
جنتِ عدست کو آباد باد

## نقشِ نیمِ رُخ

تہذیبی تاریخ کی داستان بھی کچھ عجیب ہے بلکہ یہ کہیے کہ عجیب تر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شہروں کی تاریخ اپنے ادواری فروغ اور توسیعی معنویت کے ساتھ اکثر ملکوں سے بڑی ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو گاہ گاہ افراد کے کارنامے جماعتوں کی کارکردگی پر تفوق رکھتے ہیں۔

جماعتی قوت عصری تقاضوں کے زیر اثر اور نئی جہتوں کے تعین کے ساتھ قومی زندگی کے دھاروں کا بہت کچھ رُخ بدل سکتی ہے لیکن بیشتر ایسی کسی قوت یا قوتوں کا اجتماع قوموں کی تاریخ اور ان کی زندگی کی اجتماعی ہیئت میں عظیم انقلاب کا باعث بن جاتا ہے۔ بعض شہروں نے اپنی حیاتِ عمرانی کے تاریخی سفر اور تدریجی ارتقار میں نمود پذیر عناصر کو زمانہ بہ زمانہ کچھ اس طرح اپنے اندر جذب کیا کہ ان کے تغیرات اور تاریخی سفر کا منظر مہ روشنی کے سفر کی کہانی سناتا ہوا نظر آتا ہے شہر دہلی مشرق کے ایسے ہی شہروں میں سے ہے۔

دہلی کی تاریخ کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ایسی بھی کچھ صدیاں شریک ہیں جن کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ اس کی محرابِ زندگی دھنک کے نیم دائرے کی طرح رنگارنگ حلقوں کی کمائیں کھینچتی ہوئی افق تاہ افق آگے بڑھتی ہیں۔

ایک تمدنی صداقت کو دوسری تہذیبی سچائی سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہوتا ہے اگرچہ دونوں میں رنگ اور فکری آہنگ کا اختلاف ضرور ہوتا ہے۔ اور اسی سے اعتباری دائرے بنتے اور اپنے امتیاز کو قائم کرتے ہیں۔ یہ عمل ان آبی دائروں سے قدرے مختلف ہوتا ہے جو ایک نقطے سے پیدا ہوتے ہیں مگر ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر سفر کرتے ہیں۔ ان میں رفتار اور سمت کا تعین تو ہو سکتا ہے لیکن ہم قدمی کا ان کے عمل کے ساتھ کوئی تصور نہیں ابھرتا۔ جب کہ تہذیبی لہریں ایک دوسرے کے ساتھ بھی سفر کرتی ہیں۔ اور گنگا جمنہ کے دھارے کی طرح ایک دوسرے سے الگ بھی بہتی رہتی ہیں۔

دہلی کی تہذیب کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا یہ تاجروں کا شہر بھی تھا۔ علماء کا مرکز بھی۔ اور صدیوں تک صوفیوں کا مرجع بھی رہا۔ صنعت کار، تجارت پیشہ بھی اس کی شہری زندگی کا ایک حصہ رہے اور انہیں کے ساتھ وہ لوگ بھی جو سپاہی پیشہ تھے اور ان سپاہیوں میں ایک بڑی تعداد تو اہیروں، جاٹوں، گوجروں اور دوسرے ایسے طبقات کی تھی جن کا پیشہ کشتا درزی بھی تھا اور شمشیر زنی بھی۔ دوسری طرف وہ ترک تاتار ایرانی و تورانی امراء اور لشکری تھے جو تلواریں چلاتے اور خنجر آزمائی کرتے ہوئے یہاں آتے تھے اور پھر اسی کی تہذیب اور شہریت کا ایک حصہ بن جاتے تھے۔ صوفیوں کے حوالہ سے دہلی بایس خواجاؤں کی چوکھٹ کہلاتی ہے اسی نسبت سے دہلی کے قدیم زمانے میں بایس دروازے بھی تھے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ دہلی سے ہر سمت بلکہ بہت سی سمتوں میں سفر کیا جاسکتا ہے۔ دہلی ہندوستان کا دل بھی تھا اور دوسرے علاقوں پر دل ہی کی طرح یہاں کے بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ جب ہم دہلی کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

محفلیں درہم کرے ہے۔ گنجفہ باز خیال

ہیں ورق گردانی سر۔ نیرنگ یک بتخانہم

اندر پرستھا کی صورت میں جو دلی کبھی جمنہ کے کنارے آباد تھی۔ اس کے نقوش

اشارہ اب بھی خال خال کہیں مل جاتے ہیں۔ لیکن قدیم زمانے کا آہنی ستون اور  
 برتوت السلام کا قدیم تعمیری نقش شمالی ہندوستان کے ماضی سے دلی کے  
 ناقابل شکست رشتوں کی بھیدوں بھری علامت کے طور پر ہنوز موجود ہے۔  
 قطب مینار سے لے کر کوٹلہ فروز شاہ کے بالائی حصار پر نصب سنگین لاٹ تک  
 تاریخ کے معلوم و نامعلوم سلسلوں کی طرف اشارہ سنج حقائق ہیں یہ ستون اس کی تاریخی  
 بلندیوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور ان زندہ حقیقتوں کی طرف بھی یہ جن کے  
 امین ہیں۔ یہاں کی خانقاہیں، مسجدیں، مدرسے، محلات اور حویلیاں اپنے گنبدوں  
 اپنی محرابوں اپنے ستونوں اور اپنے کتبوں کے ساتھ تاریخ کے منقش اوراق ہیں۔  
 وہ سنگین اوراق جو تہذیبی سچائیوں کے پھول سے زیادہ نازک پرتوں کی نشاندہی  
 کرتے ہیں۔ اس خاک کے ذروں میں جو کچھ مدفون ہے اس کو تو صرف خیال کی  
 آنکھیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ حال کی نگاہیں نہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی نے دہلی کے لیے کہا تھا

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر بکیتاں تہر خاک دفن ہو گا کہیں ایسا خزانہ ہر گز  
 یہ دیرینہ بستی کبھی جنگی قلعوں اور شاندار محلات کی صورت میں آباد تھی۔ اس کی  
 دیرینہ روایت آگے بڑھی تو شہر کھنڈر بن گئے اور سنگین حصاروں میں پیدا ہو گئے۔  
 بلند دیواریں سرنگوں ہو گئیں اور وہ وقت بھی آیا کہ ادھر سے ادھر تک قدیم دلی  
 سنگ و خشت کے ڈھیروں میں بدل گئی لیکن اس کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ خزاں  
 کی آمد بہاروں کی آمد کا پیش خیمہ ثابت ہوتی تھی۔ دہلی اجڑتی بھی رہی اور بستی  
 بھی رہی۔ رائے پتھورا کی دلی سے لے کر شاہ جہاں کی دلی تک جس کو جہان آباد بھی  
 کہا جاتا تھا اور اہل دکن جسے "ہندوستان" کہہ کر یاد کیا کرتے تھے اور پھر شاہ عالم  
 کی اجڑی ہوئی دہلی سے لے کر انگریزوں کے زمانے کی نوآباد --- دلی تک اس شہر  
 کی تاریخ اس کی تہذیب و روایت کا ایک طرف صحیفہ زریں ہے تو دوسری طرف حرف و حکایت  
 کا ایک دفتر پارینہ۔

اس کی خانقاہیں، اس کے روحانی افکار و اقدار کا سرچشمہ رہیں۔ اس کے مدرسے اس کی علمی روایت کے امین بنے رہے تو دوسری طرف اس کے دیوان خانے اس کی حویلیاں اور اس کی تکیہ گاہیں اس کے ارباب فن کی صحبتوں اور جلسہ گاہوں کی وعہد بہ عہد یاد تازہ کرتی رہیں۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر انوار سے لے کر بڑا شاہ بولاتک دہلی عشق و عقیدت کی ایک ریشمی لڑی میں پروئی ہوئی تہذیب و ثقافت کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ قلعہ مبارک اجر تے اجر تے بھی چراغِ علم و فن کا محافظ بنا رہا۔

شاہِ عالم کی دلی اپنے اثر و اقتدار کے اعتبار سے تو پالم تک ختم ہو جاتی تھی لیکن اس کی پر عظمت روایت کا احترام سندھ سے لکھنؤ اور کشمیر سے کرناٹک تک ہوتا تھا۔ حالی نے ”یادگارِ غالب“ کے آغاز میں لکھا ہے کہ ”تیرھویں صدی ہجری میں جب مسلمانوں کا تنزل اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا جاہِ ثروت کے ساتھ ان کی بڑی تہذیبی روایت کے سائے بھی سمٹ رہے تھے تو حسنِ اتفاق سے دہلی میں ایسے صاحبانِ کمال جمع ہو گئے تھے جن کے جلسوں کو دیکھ کر عہدِ اکبری اور شاہجہانی کے جلسے یاد آجاتے تھے۔“

دہلی کی تاریخ اس کی ثقافتی روایت اس کے ایسے نقوش و آثار میں بھی موجود ہے جنکا تعلق سنگ و خشت سے ہے۔ پتھروں کے سینوں کے ماسوا جہاں ہم اسے مرتسم و منقوش دیکھتے ہیں۔ وہاں زبان و ادب کے سفینوں میں بھی اس کی تاریخ اپنے اوراقِ مصور کے ساتھ آج بھی چشمِ عالم کو آئینہ دکھاتی ہے۔

ان اوراق میں جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہیں دہلی کی تہذیب اور روایت کی وہ کہانی پیش کی جا رہی ہے جو اس کے سفر ناموں اور اس کی سیاحت کے افسانوں میں ملتی ہے۔ یہ سفر نامے بھی چھ سات صدیوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلا سفر نامہ جو ان اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے وہ ابن بطوطہ کے سفر نامے سے ماخوذ ہے اور محمد بن تغلق کے زمانے کی یادگار ہے۔

غرض کہ یہ کوئی مربوط تہذیبی تاریخ نہیں ہے لیکن ان پر چھائیوں اور جھلکیوں کے ذریعہ بھی ہم کچھ وقت کے لیے اُس زمانہ زندگی میں سفر کر سکتے ہیں اور اس شہر دہلی کو دیکھ سکتے ہیں جیسے ان مسافران ہند اور مہمانِ دہلی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

یہ دہلی کی کلچرل لائف کے کچھ ایسے مرقعہ MINATURE ہیں جو تاریخ کا ایک قابل ذکر اور لائق توجہ حصہ ہے۔

سفر ناموں کا یہ سلسلہ ابن بطوطہ سے شروع ہوتا ہے جو مغربی اقصیٰ سے آنے والا ایک سیاح تھا۔ مسالک البصار مصنف خود کبھی ہندوستان نہیں آیا اس نے ہمارے اس ملک اور شہر دہلی سے متعلق معلومات و تاثرات کو سیاحوں کی زبان یا پھر ان کے سیرناموں سے اخذ کیا۔ عہد شاہ جہانی دور اورنگ زیب اور محمد شاہ بادشاہِ دہلی شاہِ عالم ثانی اکبر شاہِ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے زمانہ سے متعلق کئی سفر نامے ہیں جن میں برنیر، منوچی، ٹو نیر اور "یوننگ" کے سفر ناموں کو یہاں پیش کیا گیا ہے۔

"یوننگ" کے سفر نامہ سے متعلق ڈاکٹر محمد عمر کا مضمون شامل ہے خود یہ سفر نامہ نہیں۔ بعد کے سفر ناموں میں عبدالقادر چیف رامپوری اور مختتم الدولہ نواب عبدالغفور آف جاوارا کا سفر نامہ ہے۔ جنہیں قدر اختصار کے ساتھ ان صفحات میں شامل کیا گیا ہے۔

عہدِ محمد شاہی کا سفر نامہ مرقع دہلی ہے۔ جو نواب درگاہ علی خاں سالار جنگ اول کی تالیفِ راقم الحروف نے اب سے تقریباً بیس برس پہلے اس کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ کیا تھا۔ جس کے ایک قابل لحاظ حصے کو شاہ جہاں آباد نمبر دہلی کالج اردو میگزین میں چھاپ دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ جامعہ میں بھی چھپا تھا اب اس کا مکمل ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔



قدیم دلی کے حالات بہت سی تاریخوں میں ملتے ہیں لیکن جہاں تک سفرناموں کا تعلق ہے یہ دو سفر نامے اس دور کی دلی کا ایک جیتا جاگتا عکس اور متحرک تصویر پیش کرتا ہے۔ مغل دور کے سفر ناموں میں منوچی برنیئر ٹیورنیر مغرب کے سیاح ہیں آگے چل کر ٹاؤننگ یونگ کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ نواب درگاہ قلی خان عہد محمد شاہ میں آئے جب کہ برنیئر منوچی اور ٹیورنیر کے یہاں اورنگ زیب کی دلی کا حال موجود ہے۔ ٹیوننگ عہد شاہ عالم ثانی میں آیا تھا عبدالقادر چیف رامپوری اور نواب عبدالغفور آف جاورا، اس کے بعد اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے عہد میں آئے۔

ضمنی طور پر اس میں اس ذکر کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو میر شیر علی افسوس پرسی ول اسپر اور سی ایٹ اینڈ ریوز کی تحریروں میں ملتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں راقم الحروف کا ایک حقیر مضمون دہلی کی تہذیبی تاریخ سے متعلق ہے۔ ایک اور مضمون بھی اس کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ یہ سید زاہد علی کے نشان قلم کا نتیجہ ہے اس میں منوچی برنیئر اور بعض دوسرے مغربی سیاحوں کی تحریروں اور ان کی تاریخی نوعیت پر گفتگو کی گئی ہے، ٹیوننگ کے سفر نامے سے متعلق تاثرات ڈاکٹر محمد عمر کے ترتیب دیئے ہوئے ہیں۔ ان مضامین کو شاہ جہاں آباد نمبر دہلی کالج اردو میگزین کے صفحات سے اخذ کیا گیا ہے اسے راقم الحروف نے ہی مرتب کیا تھا۔ اور سید ضمیر حسن دہلوی نے اس کی ترتیب میں خصوصی معاونت کی تھی۔

دہلی کے ان سفر ناموں میں جو یہاں دو جلدوں میں پیش کیے جا رہے ہیں دہلی کا جو حال درج ہے وہ اس کی مکمل تاریخ نہیں ہے۔ لیکن اس شہر کی شاندار تاریخ کے کچھ ایسے حصے اور موڑ ضرور ہیں جن کے بغیر اس کی تاریخ کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ آخری مضمون ظفر الحسن صاحب کے کتابچہ سے ماخوذ ہے جو قلعہ مبارک کے محلات باغات اور دوسرے سلسلہ عمارات کے تعارف کے ضمن میں ایک رہنما روشنی کی حیثیت رکھتا ہے۔

شروع کے دو مضمون تعارفی ہیں ایک راقم الحروف کا نوشت نامہ ہے جس میں دہلی کی تہذیب و تاریخ کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے دوسرا مضمون سید زاہد علی کا ہے اس میں منوچی اور برنیر کے سفر ناموں سے متعلق تنقیدی تعارف نامہ پیش کیا گیا ہے۔

راقم الحروف نے ان مضامین کو جمع بھی کیا ہے بعض کا ترجمہ یا کسی ترجمے کی تلخیص کا کام بھی انجام دیا ہے اور بعض مضامین کو ایڈٹ کیا ہے ان میں جیسا کہ آپ دیکھیں گے بعض ترجموں کے ساتھ حواشی بھی درج کیے گئے ہیں۔

یہ حاشیے خصوصیت کے ساتھ عبدالقادر چیت رامپوری کے سفر نامے سے متعلق ہیں اور اسی کے ترجمے کے ذیل میں ان کو سپرد قلم کیا گیا ہے۔ علم و عمل کے نام سے یہ ترجمہ کراچی سے شائع ہوا ہے اس میں بہت اخذ و انتخاب سے کام لینا پڑا ہے۔

قارئین کی سہولیت کے پیش نظر تاریخی سفر ناموں میں دہلی کے ذکر کو دو جلدوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

تنویر احمد علوی

# دہلی

## تاریخ و تہذیب کی ایک حسین دھنک

شاہجہاں آباد جس کا نام رفتہ رفتہ جہاں آباد ہوا اور پھر اس کے قدیم نام دہلی یا دہلو کی مناسبت سے اسے دلی کہا جانے لگا، ایک عظیم تاریخی ارتقا کی یادگار اور ایک بے حد پُرتمول — تہذیبی ورثہ کا نشانِ ذی شان تھا۔ اس کے پُرشکوہ گنبد، پُر عظمت مینار، شان دار مسجدیں، خوب صورت مندر، حسین بولیاں، پُر رونق بازار، اور ارقِ منصور بنے ہوئے گلی کوچے۔ علم و فن کی روایتوں کے امین مدرسے اور پُر تقدیس خانقاہیں اس تمدنی مزاج اور تہذیبی روایت کا عکس پیش کرتے تھے جس نے اس کی محرابِ زندگی کو قوسِ قزح کے نیم دائرہ کی طرح ہفت رنگ بنا دیا تھا۔

مہذب انسانوں کی طرح ہر تہذیبی شہر کا بھی ایک مزاجِ زندگی بن جاتا ہے جس کا تعلق صدیوں کے بختے ہوئے تمدنی شعور اور نسلوں کے اپنائے ہوئے ذہنی رویوں سے ہوتا ہے۔ شاہجہاں آباد کو جس قطعہ زمین پر بنایا اور بسایا گیا وہ اس سرزمین ہی کا ایک حصہ تھا جہاں ہندوستان کے وسطی عہد کی تاریخ میں جنم لینے والے تہذیبی انقلاب نے اپنی نمونہ گیری اور شکفتگی کے بہت سے مراحل طے کیے تھے۔

مہرولی سے لے کر جمنائے کنارے بسی ہوئی دلی تک یہ علاقہ وہ خطہ زمین ہے جہاں ارضیاتی طور پر اگر ایک طرف عظیم ہمالیائی اور اولی پہاڑیوں کے سلسلے ملتے ہیں تو دوسری طرف تہذیبی اعتبار سے یہاں راجستھانی، میواتی ہریالوی، برج اور کھڑی بولیاں — باہمی طور پر ملتی اور مختلف اوقات میں ایک دوسرے کو متاثر کرتی نظر آتی ہیں۔ ہندوستان کا کوئی دوسرا شہر اس طرح بولیوں اور ان کے ساتھ تہذیبوں کا ایک فطری

”سنم بنا نظر نہیں آتا شاید تہذیبی سطح پر اشتراک و ہم آہنگی کے ایک بڑے مرکز کے روپ میں فروغ پانا اور ہندوستان کی تمدنی تاریخ کے بڑے نقشے میں دھنک کے سے یہ رنگ بھرنا اسی سرزمین کا مقصوم تھا جس کے لیے ایک کے بعد دوسرا بتا ہوا شہر، اور دریا کی لہروں کی طرح آگے بڑھتا ہوا سلسلہ آبادی ایک وسیلہ بن گیا۔

”دہلی سے دہلی تک“ مختلف ناموں سے آباد ہونے والے شاہی شہر اپنے تاریخی تناظر اور تہذیبی رشتوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے گہرے طور پر وابستہ تھے۔ ان کی تمدنی روح اور تہذیبی روایت ایک تھی اور ایک ہے۔ ماضی و موجود کے درمیان ثقافتی رشتوں کو سنگ و خشت سے بنی دیواریں اور دائرے تقسیم کر بھی نہیں سکتے۔ دہلی کی سرزمین سے وابستہ تاریخ کی سب سے عجیب اور نمایاں نشانی وہ فولادی ستون ہے جو مسجد قوت الاسلام کے صحن میں ایٹادہ ہے اور ہستنا پور کے ..... ایک راہ نے حضرت مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال قبل یہاں نصب کرایا تھا۔

دہلی کی سرزمین پر پانڈوؤں کی راجدھانی آندر پرستھا موجود تھی۔ پانڈوؤں نے ہند کی قدیم تاریخ میں اپنے سپاہیانہ کردار خدمت و خلوص اور قربانی و ایثار کی جو مثال پیش کی ہے اس نے عظیم مہا بھارت اور دوسری کتھاؤں اور کہانیوں کے وسیلے سے صدیوں تک ان کی یاد اور اس دیس کی تہذیبی روح کو زندہ رکھا ہے۔ عہد وسطیٰ کے شروع میں تو مرزا چوٹ دہلی میں کافی دنوں تک راج کرتے رہے (دہلی) یاد ہوا انہی کا دیا ہوا قدیم نام ہے جو آج تک چلا آتا ہے۔ اس خاندان کا آخری حکمراں پر تھوی راج تھوڑے ہی دنوں حکومت کر سکا مگر تاریخ میں اپنا نام اور دہلی کی سرزمین پر اپنی کھامت یادگار میں چھوڑ گیا۔

خوش و خوشید و لے دولت مستعمل بود

وسطی عہد میں دہلی کی تاریخ مسلمانوں کے دور حکمرانی کی تاریخ ہے جسے ہم دہلی کی ثقافتی زندگی کا سنہری دور کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت کی دہلی اپنی شان و شکوہ اور تہذیبی تمدنی

امتیازات کی وجہ سے قرطبہ، قیرواں، بغداد قاہرہ، قسطنطنیہ اور سمرقند و بخارا پر بھی فوقیت رکھتی تھی اور بڑے احترام کے ساتھ اسے حضرت دہلی کہا جاتا تھا۔

دہلی کے نئے مسلمان حکمران زیادہ تر آریائی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور اس طور پر ان کی قافلہ در قافلہ ہندوستان میں آمد اس سرزمین پر آریاؤں کی آمد کی تاریخ اور اس کی تمدنی فتوحات کو دہرا رہی تھی۔ اس کے خوش آمد ثمرات کو آج کی زندگی میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شمالی ہند کی نئی زبانیں MODERN INDIAN LANGUAGES اسی دور میں نشوونما پاتی ہیں اور ان کے فروغ میں نئے حکمران طبقہ کی تہذیبی رواداری، فراخ دلانہ سرپرستی کے ان تمدنی اثرات کو بیش از بیش دخل ہے جس نے ان بولیوں کو نیارنگ اور نیا آہنگ دیا۔ ان کی جرأت آزمائی و کشور کشائی، قلعہ شکنی و تیغ زنی کی داستانیں تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس متحرک و متحارب گروہ کی حوصلہ مندیوں نے جہاں تا تاریخوں کے خوفناک حملوں اور ان کے غارت گردانہ ارادوں سے ہندوستان کی سرزمین کو بچا یا وہاں وسط ہند کے پہاڑی عملوں، گھنے جنگلوں اور مغربی ہند کے ریگستانی علاقوں سے آگے بڑھ کر شمالی ہند کے لیے جنوبی ہند کے متمول و متمدن علاقے کے دروازے بھی کھول دیے۔ اور تیرہ چودہ سو برس کے بعد یہ ممکن ہو سکا کہ شمال اور جنوب ایک ہو جائیں صدیوں کی قائم کردہ دیواریں گر جائیں اور ایک خطہ کے تاجر، سیاح، صنایع و دستکار، صوفی عالم اور مبلغ بڑے پیمانہ پر ادھر سے ادھر آجا سکیں۔ دکن میں بولی جانے والی ہندوستانی زبان یعنی دکھنی اسی دور کی دین ہے۔

شہر دہلی کے مختلف دروازوں سے جو سڑکیں ملک کے دوسرے حصوں کو جاتی تھیں ان پر سایہ دار درخت لگائے گئے تھے۔ ابن بطوطہ کی روایت کے مطابق محمد بن تغلق کے زمانے میں دہلی سے دیوگیر جانے والی سڑک پر ایسے گنجان اور سایہ دار درخت تھے کہ باغ کا گمان ہوتا تھا۔

دہلی سلطنت کے ایسے تعمیری و تہذیبی اقدامات نے ایک نئے شہری انقلاب کو جنم دیا۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے۔

” راجپوتوں کے زمانے میں شہری زندگی کی تنظیم میں ذات پات کے تصورات کو بڑا دخل تھا۔ اعلیٰ ذات کے لوگوں کے سوا کسی کو شہر کی چار دیواری کے اندر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ نیچے طبقے کے لوگ شہر کے باہر رہتے تھے۔ ترکوں کے تسلط کے بعد شہروں کا نقشہ ایک دم سے بدلنے لگا۔ شہر کے دروازے کھول دیے گئے اور اعلیٰ و ادنیٰ ہر طبقہ کے مکانات پہلو بہ پہلو نظر آنے لگے۔ پروفیسر مجیب نے اس تبدیلی کو شہری انقلاب سے تعبیر کیا ہے۔

اس شہری انقلاب میں ایک اور بڑے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ ہے تاتاری حملوں اور وسط ایشیا کی عظیم الشان سلطنتوں اور تہذیبی مرکزوں کی تباہی کے باعث عرب، خراسان، بخارا اور چین کے بے شمار عالموں، تاجروں، صنعت کاروں کے ساتھ ارباب سیف و قلم کا دہلی میں اجتماع۔ اس زمانے میں ایشیا کا شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو جس میں اتنے مختلف ملکوں کی علیحدہ علیحدہ آبادیاں ہوں جیسی دہلی میں تھیں۔

اس کے عظیم حکمرانوں نے ان مختلف عناصر کو شہر اور شہری تہذیب کے فروغ کے لیے کام میں لانے کی سعی کی۔ شمس الدین التمش اور علاؤ الدین کا نام اس ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مگر دربار کے حلقہ تسمیر سے زیادہ یہ کام مدرسوں اور بالخصوص خانقاہوں کے دائرہ اثر میں ہوا۔ انھوں نے طبقاتی تقسیم اور رنگوں کے اختلافات کو درمیان سے ہٹانے ہوئے ذہنوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور دلوں کو محبت و خلوص کے رشتے میں جوڑنے کی سعی مشکور کی اور یہ حالت ہوئی۔

دلِ شکستہ در راں کو چہ می کنند درست  
چنانکہ خود شناسی کہ از کجا، بشکست

حضرت نظام الدین ادیباً محبوب الہی کی شخصیت اس عہد کے صوفیانہ نظام میں آفتاب تازہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ سمجھتے تھے اور یہ چاہتے تھے

کہ عقائد و نظریات کے اختلافات انسانی برادری کے مشترک رشتے پر اثر انداز نہ ہوں۔ مذہبی معاملات میں حضرت کی رواداری اور حقیقت شناسی کا کچھ اندازہ اس مشہور روایت سے بھی ہوتا ہے کہ ایک روز حضرت والاجماعت خانہ کی چھت پر ٹہل رہے تھے صبح کا وقت تھا اور اہل ہنود اپنے عقیدہ کے مطابق نکلتے ہوئے سورج کی پوجا کر رہے تھے۔ حضرت نے اسے دیکھا تو بے اختیار یہ مصرع زبان حق ترجمان سے ادا ہوا۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے  
حضرت امیر خسرو حاضر خدمت تھے فوراً ہی مصرع ثانی نذر کیا۔

من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلا سے

یہ دو لڑوں مصرعے اس عہد کی تاریخ میں ایک نئی تہذیب کی نمود اور نئے شعور زندگی کے طلوع کی طرف اشارہ کرتے اور اس تمدنی مزاج کا پتہ دیتے ہیں جو اپنے سے مختلف تہذیبی قدروں اور مذہبی عقیدوں کی قدر شناسی کی اہلیت رکھتا ہے۔ پروفیسر حبیب نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ حضرت کی خانقاہ میں اور اس سے باہر بھی ہندوی بھاشا میں ایسے گیت گائے جاتے تھے جس میں سری کرشن کی عشق آفریں شخصیت کو دجود باری کی علامت قرار دیا گیا تھا اور حضرت نے اپنے ایک مقرب بارگاہ اور مرید خاص کو یہ کام سپرد کیا تھا کہ وہ ہندی بھاشا میں عشق و تصوف کے مضامین پر مشتمل اشعار لکھیں۔

مکن ہے یہ مقرب اور ممتاز مرید حضرت امیر خسرو ہوں جن کا تہذیبی شعور اور فنی طریقہ رسانی تمدنی اشتراک اور شہری ہم آہنگی کا ایک بے مثال مرقع ہے۔ حضرت امیر کو ہندوستان سے، اس کے موسموں سے، اس کی نسلی اور تہذیبی رنگارنگی سے، اس کے پرندوں، پھولوں اور پھلوں سے۔ اس کے عوام اور خواص سے اور سب سے زیادہ دلہی زبان اور ہندوی بولی ٹھولی سے غیر معمولی عشق تھا۔ وہ ہندوستانی موسیقی میں کئی ایک انہی راگ راگینوں کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے عوامی گیت کہہ کر نیاں، ڈھکوسلے اور دو سنے صدیوں کا سفر طے کرتے

ہوئے دلوں کی چاہ اور زبان کی راہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔  
 پروفیسر خلیق احمد نظامی نے حضرت امیر کی وسیع المشربی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:  
 ”انہوں نے نہ صرف ہندو مذہب کو سمجھنے کی ہمدردانہ کوشش کی ہے، بلکہ  
 تمام مذہبی تعصبات اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر اسلام اور ہندو مذہب  
 میں مشترک عناصر کی تلاش پر بھی زور دیا ہے۔ حقیقت میں امیر خسرو کے یہ افکار  
 و نظریات معاصر صوفیوں کے طریقہ کار کی صدائے بازگشت ہیں۔“  
 ”ہم دلی پیدا کرنے کے لیے ہم زبانی ضروری تھی اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد کے  
 مسلمان صوفی اور اہل تدریس بزرگ مقامی زبانیں سیکھ رہے ہیں اور علاقائی تہذیب اور اس  
 کی ترجمانی کرنے والی لوک کتھاؤں سے اپنا ذہنی رشتہ جوڑ رہے ہیں اور ایک وسیع تر تہذیبی  
 اشتراک کی بنیادوں کو استوار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ پنجابی، کھڑی، اودھی، برج بھاشا  
 اور دکنی زبانوں اور بولیوں کی ارتقار میں مسلمان صوفیوں اور ان کے ساتھ میل جول رکھنے والے  
 سنتوں نے جو تاریخی کردار ادا کیا ہے اس ملک تہذیبی تاریخ کے مطالعہ میں اسے کسی طرح نظر انداز  
 نہیں کیا جاسکتا۔“

خالقاہوں کے مقابلے میں دربار کی حکمت عملی اگرچہ اقتدار پسندانہ تھی اور اس کے پس منظر  
 میں توسیع کی خواہش کارفرما رہتی تھی لیکن انہوں نے مذہب کے محدود تصور کے ساتھ نظام حکومت  
 چلانے کی کوشش نہیں کی اور علاؤ الدین نے تو قاضی معین الدین کے ساتھ اپنی گفتگو میں  
 مذہب کو نظام ریاست و سیاست سے الگ رکھنے کی بات کھل کر کہہ دی۔ شاہی دارالضرب  
 میں سونے کے سکے عرصے تک اسی طرح بنتے رہے جیسے راجپوتوں کے عہد میں بنتے تھے۔ اس  
 عہد کے ایک سکے ”دلی دال“ پر جو بلبن کے زمانہ تک راج رہا شیوجی اور ان کے بیل بندی کی  
 خود سلطان شہاب الدین (محمد غوری) کے عہد کے سکوں پر لکھی گئی مورق منقش ہوتی تھی

۱۔ اوراق مصود: ۴۲-۴۳

۲۔ ملاحظہ ہوا اوراق مصود: ۳۸



یہ ان فاتح حکمرانوں کی زندگی میں رواداری کے عنصر کی ایک نمایاں علامت ہے۔ اس عہد کے بعض حکمران مسلمانوں کے محلات میں النسائوں اور جائزوں کی تصویروں کی موجودگی جس طرف اہل تاریخ نے اشارہ کیا ہے۔ اس تہذیبی رویہ کی نشان دہی کرتی ہے جو فن کی قدر افزائی اور مرتبہ شناسی کو مذہبی جذبات و متقدمات سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔ جنگیں ہوئیں اور ہوتی رہیں۔ اس نوع کی سیاسی کش مکش اور عسکری مہمیں شاید اس دور میں ناگزیر تھیں لیکن بات یہیں ختم ہو گئی ہو ایسا نہیں ہے پروفیسر مجیب نے اپنے مضمون *QUTAB* میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

COMPLEX AS A SOCIAL DOCUMENT

WHILE THE WRITTEN RECORD OF HISTORY SHOWS THE ESTABLISHMENT OF AUTHORITY BY FORCE AND BLOODSHED WE HAVE IN THE ARCHITECTURAL RECORD IMPEACHABLE EVIDENCE OF UNDERSTANDING AND CO-OPERATION OF TOYFUL PARTICIPATION IN CREATIVE WORK OF THE HIGHEST QUALITY.

اس کی وضاحت پروفیسر نظامی کے ان الفاظ میں بھی موجود ہے۔ "وض شمس اور قطب مینار محض تعمیر کا نام نہیں تھے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں معماروں نے حصہ لیا تھا بلکہ یہ ایک نئے سیاسی اور تمدنی دور کے آغاز کا اعلان تھے جن کا مقصد ایک وسیع تہذیبی ڈھانچہ کی بنیادیں استوار کر کے ایک کل ہند نظام کے لیے راستہ تیار کرنا تھا۔" پروفیسر محمد مجیب نے ایسے کئی تعمیری نقوش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو تہذیبی اشتراک کے ساتھ روحانی ارتباط کے بھی مظہر ہیں۔ چنانچہ موصوف نے ان عمارتوں کے

۱۰ اوراق مصور

۱۱ ISLAMIC INFLUENCE IN INDIAN SOCIETY

۱۲ اوراق مصور، ۲۸

134152

ہندو معماروں کے ذہنی مطالعہ کو پیش کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

THE HINDI SCULPTURE DID NOT KNOW ANY THING ABOUT THE DOCTRINE OF REVELATION, HE KNEW ONLY ABOUT THE NATURE AND INSTINCTIVELY HE HAS REPRESENTED THE QURAN AS AN UTTERANCE OF NATURE. THE VOICE OF LIVES AND FLOWERS THE WHISPER OF THE WOOD.

مسجد اور مندر میں معبود کا تصور ایک نہیں ہوتا لیکن عبادت کا مقصد بہر حال ایک ہوتا ہے۔ مسجد کی محراب اور مندر کے دروازہ پر سجدہ ریزی کرنے والے کی نگاہ میں ایک ایسا روشن ہال ضرور ہوتا ہے جو اسے روحانی مسرتوں کی ایک لامحدود فضا کی طرف لے جاتا ہے۔

چنانچہ مسجد قوت الاسلام کے علاقائی دروازے کی محراب پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر مجیب نے لکھا ہے۔

ONE WOULD HAVE LOOK UP THROUGH THE CENTRAL ARCH INTO A SHADOW INTERIOR AND FELT AT PASSING THROUGH IT ONE WOULD ENTER THE WORLD OF THE SPIRIT OF THE CALM QUITE CONTEMPLATION OF THE DIVINE.

اس کے پیچھے معنی بینی اور حق اندیشی کے وہ محرکات کار فرما ہیں جو تمدنی اشتراک کو جنم دیتے ہیں جس کا ثبوت دوسرے تاریخی حقائق سے نمایاں طور پر فراہم ہوتا ہے۔ مسلمان امراء، ہندو امراء کی بیٹیوں سے شادیاں کرتے ہیں اور ہولی دیوالی جیسے ہندو تہوار شاہی محلات میں بھی منائے جاتے ہیں۔

ISLAMIC INFLUENCE IN INDIAN SOCIETY

↓ ISLAMIC INFLUENCE OF INDIAN SOCIETY

صوفیوں کی طرح بعض مسلم سلاطین بھی ہندو اور چین سادھوؤں سے مذہبی و تہذیبی مسائل پر آزادانہ گفتگو میں کرتے تھے۔ پروفیسر خلیق نظامی نے لکھا ہے۔

محمد بن تغلق جوگیوں اور چین عالموں سے گفتگوں نخلیے میں گفتگو کرتا تھا۔ جینا پر بھا  
سوری سے رات کے بارہ بجے تک بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ اس کے دربار  
میں عربی فارسی اور ہندی کے ایک ہزار شاعر تھے۔

ہلی کے بادشاہوں کی نیکی اور رعایا پروری کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ان بادشاہوں  
کے مقابر سے برسوں تک عوام اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے علاؤ الدین کے مزار پر لوگ  
منت کا دھاگہ باندھنے لگے تھے۔ رضیہ کے مزار کے ساتھ بھی عقیدت کا یہی رنگ تھا اور  
”سلطان غازی“ کے مقبرے پر تو خود راقم الحروف نے عوام کو چڑھاوا چڑھاتے دیکھا ہے۔

صوفیوں کے روحانی طریق کار کا اس سے پیشتر ذکر آچکا ہے ان میں سے بعض حلقے  
اپنی ظاہری حیثیت کے اعتبار سے بھی ہندوستانی سادھوؤں کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔  
چنانچہ اس زمانہ میں ایک سلسلہ حیدری صوفیوں کا تھا اس کے بانی سید ابو بکر حیدری قلندری  
تھے یہ لوگ گردن میں لوہے کی زنجیریں اور ہاتھوں میں لوہے کے کڑے پہنے رہتے تھے۔  
ایک اور سلسلہ ”اسحاقیہ“ تھا جس کے پیروزر دیکڑے پہنتے تھے اور اسی رنگ کے زرد جھنڈے  
ہاتھوں میں لے کر چلتے تھے۔

سیدوں اور لودیوں کا عہد ایسے سلاطین کا عہد ہے جو مذہب کے معاملات و  
مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں لیکن ان ہی کے عہد میں بھگتی تحریک اپنی پوری توانائیوں  
کے ساتھ پھیلتی ہے اور مذہب رسمی حد بندیوں کو توڑتی نظر آتی ہے ان کے دور میں اس  
تحریک کا فروغ اس امر کا ثبوت ثابت ہے کہ یہ بادشاہ کس حد تک مذہبی رواداری کے  
قابل تھے، ان نئی مذہبی اور تہذیبی تحریکوں میں ہر طبقہ کے لوگ حصہ لیتے تھے۔

چیتنہ گرو نانک کبیر داس کے نام سے، تعلیم یافتہ ہندوستانی واقف ہے۔ لیکن اس

دور میں اور بہت سے ایسے مذہبی رہنما ہوئے، میں جن کے نام زبانِ زو عام ہیں۔ مثلاً دھنا جاٹ تھا۔ رائے داس چمار تھا۔ حسین ایک نائی تھا اور ایک بنیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کسی فرقہ کا بانی تھا۔ پروفیسر حبیب نے ان سنتوں کی تعلیمات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

”ان کے مرید ہندو اور مسلمان دونوں تھے مگر وہ ان دونوں کے مذہبی شعائر کو نہیں مانتے تھے۔ ان کے نزدیک صرف وہی چیزیں قابل قبول تھیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک تھیں۔ یہ رہنما مسلم صوفیوں کی اصطلاحوں سے خوب واقف تھے اور ان اصطلاحوں کو ان کے سنسکرت کے معنی الفاظ کے ساتھ اپنی شاعری میں آزادی سے استعمال کرتے تھے۔“

پندرہویں اور سولہویں صدی کے ان بزرگوں کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام مذہبی حد بندیاں اور اختلاف ختم کر دیے جائیں۔ مذہب اور ذات پات کے عائد کیے ہوئے سب قید و بند توڑ دیے جائیں۔ سارے ہندوستانیوں بلکہ ساری انسانیت کا خدا ایک ہے۔<sup>۱۷</sup>

وحدت الوجود۔ اس عہد کا ایک اہم روحانی اور تہذیبی مرکزِ فکر ہے۔ حضرت شاد العالمین شاہ عبدالرزاق علوی القادری اس دور کے ایک مشہور صوفی بزرگ ہیں اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور شیخ سلیم چشتی کے معاصر۔ ان کے ملفوظات اور تصرفات میں جگہ جگہ اس نقطہ فکر کی شرح ملتی ہے ایک موقع پر حضرت نے اس پر والہانہ انداز میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے۔

آسمان خدا ہے زمین خدا ہے آتش خدا ہے وہی ہے جس نے افراد موجودات میں سے ایک ایک کی شکل میں ظہور فرمایا ہے اور وہی ہے جس کے نورِ ظہور کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی شے سے مخفی نہیں۔ اور اس پر بھی وہ اس طرح چھپا ہوا ہے کہ اس کی ایک بات بھی ظاہر نہیں۔<sup>۱۸</sup>

۱۷ حضرت نظام الدین اویار

۱۸ صحیفہ ابرار:

حضرت ہمہ ”اوست“ کے قابل تھے اور ہر شے میں اس کا جلوہ دیکھتے تھے اس کا ایک نہایت دلچسپ پہلو وہ زاویہ نگاہ ہے جس پر ان الفاظ سے روشنی پڑتی ہے۔ بعض ولایتیں ایسی بھی ہیں جہاں وہ مناظر جو یہاں فحشیات کے دائرے میں آتے ہیں اور فسق و فجور سے تعلق رکھتے ہیں وہاں خدا کی پرستش کے موقع پر کام آتے ہیں۔ اور انہیں کلمات عقیدت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔  
اس کے یہ معنی ہوئے کہ کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے بے حقیقت کہا جاسکے۔ اور کوئی رسم بھی ایسی نہیں جسے اسمائے الہی سے جدا کیا جاسکے۔

دہلی سلطنت کی سیاسی کمزوری کے زمانہ میں دوسرے ریاستی مرکزوں اور مقامی حکومتوں میں یہ دہلی روایت پروان چڑھتی رہی اور ہندوستان گیر ہوتی گئی۔ جون پور، برہان پور، احمد آباد، ثنادی آباد مانڈوا اور دوسری علاقائی راجدھانیوں نے مرکز سے علیحدگی اور سیاسی آزادی کے باوجود خود کو ان رشتوں کا پابند سمجھا۔ اور اس سلسلے میں اپنی بساط کے مطابق بہت کچھ کیا۔ عظیم مغل سلطنت کا بانی نور ظہیر الدین محمد بابر تھا لیکن اسے استحکام اکبر اعظم کے ہاتھوں نصیب ہوا جو امر کوٹ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے سیاسی اقتدار کی کہانی ہندوستان کی تاریخ میں جتنی اہم ہے اس سے زیادہ اہمیت اس کی ان مخلصانہ کوششوں کی ہے جو اس نے اپنی سلطنت میں بسنے والوں کے دلوں میں تہذیبی اشتراک اور مذہبی رواداری کے جذبے کو فروغ دینے کے سلسلے میں انجام دیں۔

اکبر نے مختلف مذہبی گروہوں اور تمدنی حلقوں کے مابین ذہنی اشتراک پیدا کرنے کے لیے جو مذہبی پالیسی اختیار کی اور جن عقائد و رسومات کو رواج دیا ان کی اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم اکبر کے مذہبی معتقدات کا مطالعہ اس دور کی صوفیانہ تحریکوں کی روشنی میں کرتے ہیں۔

وہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک مشترک اخلاقی نصب العین اور تہذیبی زاویہ نگاہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن اسے متوازن کے سلسلے میں اس نے تشدد کو پسند نہیں کیا اور اپنے دستور حکومت کو اس سے الگ رکھا۔ پروفیسر حبیب نے اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

”اکبر کی حکومت کی بنیاد صلح کل کے اصولوں پر تھی جس کی رو سے ہر فرقہ کو اپنے روایتی خیالات اور طریق زندگی پر قائم رہنے کی پوری آزادی تھی اور ہر فرد کو حق تھا کہ وہ اپنے فرقہ کے خیالات اور طریقوں کو خود جس طرح چاہے سمجھے اور برتے۔“

اکبر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں سب سے زیادہ مذہبی طور پر رواداری کا حامی اور وحدت ادیان کا قائل نظر آتا ہے مختلف مذاہب کے رسوم و عقائد میں دھنک کے رنگوں جیسا جو اختلاف ملتا ہے وہ ان کو تفہیم و تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کے پردے میں تھپی ہوئی سچائیوں کو بروئے کار لانا اور انہیں اپنے ملک کے مذہبی فکر و عمل کے دائرے کا جز و بنا دینا چاہتا تھا۔

اس کے اختیار کردہ مسلک کے جزئیاتی پہلوؤں میں کیوں اور کہاں کہاں اہل مذاہب کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے یہ ایک الگ سوال ہے۔ لیکن ہندوستان کی تہذیبی تاریخ اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتی کہ ہندوستان میں مذہبی رسوم کی یکجائی کی کوشش اہل ارادت اور معلمین انسانیت کی طرف سے برابر اور موقع بہ موقع عمل میں آتی رہی۔ کبیر پن্থی نانک پن্থی اور دادو پن্থی فرقوں کے عقائد و رسوم اس کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ گجرات کے امام شاہی فرقہ کے لوگوں کے مراسم و معتقدات کو اس کی ایک نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

..... ”ان میں ایک خلیفہ ہوتا ہے جسے ”کاکا“ کہا جاتا ہے یہ لوگ نہ (خالصتاً) مسلمان ہوتے ہیں نہ ہندو بلکہ دونوں مذاہب کے طریقوں پر کار بند رہتے ہیں یہ لوگ

ہولی، دیوالی بھی مناتے ہیں اور عیدین بھی گوشت اور مچھلی نہیں کھاتے اور روزے بھی رکھتے ہیں ان کے وہاں مردوں کو دفن کیا جاتا ہے مگر اس رسم میں کوئی اسلامی طریقہ نہیں ہوتا دفن کرنے وقت گجراتی میں دعائیں پڑھی جاتی ہیں جن میں خدا اور امام شاہ (بانی فرقہ) کے ناموں کے ساتھ برہمادشنو اور اندر کے نام بھی شامل ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ میں اسلامی طریقہ پر عقد خوانی کے بعد برہمن کو بلا کر ہندو کی رسم کے مطابق بھی تمام مراحل طے کیے جاتے ہیں“ ۱۔

اکبر نے مغل راجپوت اور ہندو اسلامی عناصر کو جس طرح یکجا کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے جو عملی قدم اٹھائے ان کو اس ملک گیر سماجی عمل اور مذہبی طریقہ فکر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ ان کے پر قوت گروہ مغل حکومت کے سیاسی استحکام میں مدد ملی بلکہ اس نئے معاشرتی مزاج کی تشکیل میں بھی جو برابر تقابذ پر تھا اس کے اثرات بہت کچھ دیر پا ثابت ہوئے۔

مغل حکومت کے درباری آداب و رسوم کے علاوہ اس کے زیر سایہ فروغ پذیر ہونے والے فن مصوری فن موسیقی اور فن تعمیر میں اس کی جھلکیاں آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں شعرو شعور پر اس کے دور رس اثرات کو سنسکرت کلاسیکس کما سوافارسی تراجم میں نمایاں طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے مغل دربار کی مذہبی مفاہمت پسندی کے خلاف جو کچھ کہا اسے تعصب و تنگ نظری کا نتیجہ اور اشتراک کے مقابلہ میں افتراق کی قوتوں کا اجبار نہیں کہا جانا چاہیے اس نوع کی اصلاح پسندانہ روش مغرب اور مشرق کے بعض دوسرے ملکوں میں بھی اختیار کی گئی اسے ایک طرح کا PURITONISM قرار دیا جانا چاہیے۔ یہ بہت کچھ اسی نوع کی اجبائی اور زیادہ صحیح الفاظ میں اصلاحی کوشش ہے جیسے عیسائیت میں کیتھولک طبقے کے مقابلہ میں PROTESTANTISM تحریک نے کی

ہندوستان میں سنان دھرم کے خلاف آریہ سماج کی طرف سے عمل میں آئی، جہانگیر نے اکبر کے خلاف بغاوت کی اور ابوالفضل کو قتل کرادیا اس کی نوعیت سیاسی ہے۔ تخت نشینی

۱۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو

کے بعد وہ اکبر ہی کے نقش قدم پر چلتا رہا وہ فن مصوری کا بہت بڑا قدر شناس اور سرپرست تھا۔ ہندوستانی موسیقی اور صوفیانہ ہندی شاعری سے اسے گہری دلچسپی تھی اور اکبر ہی کی طرح وہ مباحثے کرتا رہتا تھا۔

شاہجہاں کا دور اپنی تمدنی فتوحات اور شان و شکوہ کے اعتبار سے مغل حکومت کا عہد زریں ہے۔ اس عظیم مغل شہنشاہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دہلی کی مرکزی حیثیت کو پھر بحال کیا اس کے عہد میں تاج محل لال قلعہ اور شاہجہانی مسجد جیسی عظیم اور عجائب روزگار تعمیرات ہوئیں جس کی وجہ سے اسے **PRINCE BUILDER** کہا جاتا ہے شاہجہانی دور کے تمدنی اوج و عروج کا اندازہ تخت طاؤس اور دل بادل خیمے سے زیادہ اس تہذیبی نقطہ نگاہ سے ہوتا ہے جس کے لیے ہم شہزادہ داراشکوہ کو ایک ”علامت“ قرار دے سکتے ہیں۔ خود شاہجہاں کے دربار میں اگر ایک طرف ہم حاجی محمد جان قدسی مشہدی ابوطالب کلیم شاد ماں اور سوداے گیلانی جیسے شعرا کو دیکھتے ہیں تو دوسری طرف شمشو ناتھ سندروالی اور چنٹامنی جیسے سنسکرت اور ہندی کے اہل علم و ادب بھی موجود ہیں۔

بادشاہ ایک ایسے مذہبی کردار کا مالک ہے کہ کبھی اس کی تکبیر ادنیٰ قضا نہیں ہوتی مگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ صبح ہوتی ہے تو ہندوستان کا بادشاہ شاہجہاں بعد اداے نماز تسبیح و دست و طیف برب تھر کہ درشن میں رونق افروز ہوتے ہیں، اور درشن کرنے والوں کی سعادت دیدار فیض آثار سے نوازتے ہیں اس کے مقابلہ میں شہزادہ داراشکوہ کا رنگ طبیعت کچھ اور بھی گہرا ہے وہ ظاہری رنگارنگی کو باطنی ہم آہنگی میں بدل دینا چاہتا ہے۔ داراشکوہ کو ابتدا ہی سے تصوف و روحانیت سے دلچسپی تھی چنانچہ عین عالم شباب میں وہ ”سفینہ الاولیا“ جیسی کتاب ترتیب دیتا ہے ”سیر اکبر“ کے نام سے اپنی زندگی کا تذکرہ کرتا ہے اس سے مذہبی میلان اور تہذیبی زاویہ نگاہ کا پتہ چلتا ہے جس کی بہترین ترجمانی اس کی کتاب مجمع البحرین سے ہوتی ہے اپنی اس کتاب میں شہزادے نے دو نواں مذہبوں کے رسوم و عقائد کی ایسی توجیہات اور تعبیری پیش کی ہیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ اسلام مذہب اور ہندومت دو نواں اپنے حقیقی مفہوم اور روح معنی کے اعتبار سے ایک ہیں۔



یک چراغیست دریں خانہ کہ از پر تو آں  
ہر کجائی نگری انجمنے ساخته اند

شہزادہ اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ اہل تحقیق و تصوف کی خدمت میں گزارتا تھا۔ اور اپنے مرشدوں کے علاوہ ہندو جوگیوں اور سنتوں سے بھی مذہبی مسائل و پریدانت پر گفتگو کرتا تھا جس سے بالآخر اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ دونوں سچائیوں میں بس نام ہی کا فرق ہے۔

”بعد از دریافت حقیقت الحقائق و تحقیق رموز و دقائق مذہب بر حق صوفیہ و فائز گشتن بایں عطیہ عظمیٰ در پی ہاں شد کہ درک کنبہ مشرب موحدان ہندو با بعضی از ایں قوم و کاملان ایشان کہ یہ نہایت ریاضت و ادراک و فہمیدگی و غایت تصوف و خدا یابی رسیدہ بودند مگر حجتہا داشتہ و گفتگو نمودہ جز اختلاف لفظی در دریافت و شناخت حق تضاد نے ندیدہ۔ اور نگ زیب کی مذہبی پالیسی پر اہل علم و ادب تنقید کرتے آئے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ شہنشاہ نے مذہب سے الگ ہو کر یا مذہب کا سہارا لے کر جو کچھ کیا اس کا تعلق مملکت مصلحت سے تھا جس میں شاہ جہاں کی نظر بندی اور دار لشکوہ اور مراد کا قتل بھی شامل ہے۔ اس روشنی میں بعض غیر مسلموں کے ساتھ اس کے سیاسی سلوک کی توجیہ بھی ممکن ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی بقول پروفیسر حبیب ”یہ ساری کارروائی آئین حکمرانی کے مسلم اصول کے مطابق ہوئی۔۔۔ جنگ تخت نشینی میں کوئی تعصب کا پہلو نہ تھا قریب قریب ہر ہندو راجہ نے (وقت آنے پر) اور نگ زیب کی مدد کی اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔“

شیواجی کے خلاف شاہی فوجوں کے اقدام کا منشا بھی وہی تھا جو دکن کی مسلمان سلطنتوں کے خلاف عسکری مہمات میں پیش نظر رہا۔۔۔ تخت نشینی کے بعد شیواجی کے خلاف جو پہلی مہم اور نگ زیب نے روانہ کی اس کی سربراہی مرزا راجہ جے سنگھ کو سونپی گئی

اور سلطنت کے سارے لائق افسروں کو اس کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ یہی راجپوت سپہ سالار شیواجی کو مغل دربار میں لایا تھا اور ایک بار صلح صفائی ہو جانے پر خود شیواجی نے دکنی مہمت میں مغل حکمران کی مدد کی تھی۔ ایک اور موقع پر شیواجی کے خلاف جو شاہی فوج روانہ کی گئی اس کی کمان راجہ جسونت سنگھ کو دی گئی۔

خود شیواجی جو زندگی بھر مغل حکومت کے خلاف جنگ آزما رہا۔ اسلام یا مسلمانوں سے اسے کوئی خاص پر خاش نہ تھی وہ قرآن اور مسجدوں کا بہت احترام کرتا تھا۔ اور یہ بات قابل لحاظ ہے کہ شیواجی کا قاضی القضاة "حیدر بعد میں مغل سلطنت کا قاضی القضاة بنا۔"

اورنگ زیب کے زمانے میں جہاں کچھ مندر توڑے جانے کی بات کہی جاتی ہے وہاں مندروں کو جاگیریں بھی دی جاتی ہیں لال قلعہ کے سامنے کا جین مندر جو کبھی اردو مندر کہلاتا تھا اس کی ایک بہت نمایاں مثال ہے اگر بادشاہ کو مندروں سے مذہبی اختلاف ہوتا اور اس جذبے کے تحت وہ کسی مندر کو مسمار کرنے کا حکم دیتا تو لال قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے یہ مندر کیسے باقی رہتا اور اسے جاگیر کیوں عطا کی جاتی۔

وہ اپنی بیوی اودے پوری بیگم (والدہ شہزادہ کام بخش) سے بہت محبت کرتا تھا اپنی زندگی کے آخری ایام میں شہزادے کو اس نے جو خط لکھا ہے اس میں یہ فقرہ موجود ہے۔

"اودے پوری والدہ شہزادے کو بازن با من بیمار بود حال ہم ارادہ رفاقت وارد۔"

شہنشاہ کے کردار کا یہ انسانی پہلو کیا مذہبی رواداری کا آئینہ دار نہیں۔ اورنگ زیب کے جانشینوں کی دلی ڈیڑھ سو برس تک اپنے دور زوال سے گزرتی رہی لیکن اس کے مخصوص نامذہبی کردار میں فرق نہیں آیا۔ محمد شاہ رنگیلے کی بیگم قدسیہ خانم اصلاً ہندو تھی۔ فرخ سیرایشتر سنگھ راجپوت راجہ کا داماد تھا۔ ہندو امرار آخر وقت تک اپنے بادشاہوں کے وفادار رہے۔ غلام قادر روہیلے نے جب لال قلعہ میں شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال لیں اور تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کو بے حرمت کیا تو مجبور بادشاہ نے مہادی سندھیا

سے مدد طلب کی، سندھیا کی فوجوں نے مظلوم بادشاہ کو غلام قادر کی تعہدی سے نجات دلانی مگر بادشاہ کو معزول کر کے خود دہلی کے تخت پر نہیں بیٹھا۔ شاہ عالم اگرچہ عملاً مرہٹوں کے وظیفہ خوار تھے لیکن مجال ہے کہ مرہٹوں کی جانب سے آداب شاہی اور رسومات دربار کی پیروی میں کوئی فرق آجائے۔

شاہ عالم ثانی کے دربار سے اس وقت جو اہل فن وابستہ تھے ان میں اردو فارسی کے شعراء کے ساتھ بھاکا اور سنسکرت کے شاعر بھی تھے۔ صاحب مجموعہ نغز نے لکھا ہے۔

”برخے از گزراں شباروزی آل حضرت.... بدیں شغل شریف کہ عبارت از شعرو شاعری ہست فارسی باشد یا ریختہ سنسکرت بود خواہ بھاکا صرف می شود....“

اس دور ابتلا میں بھی ہندو رعایا اپنے بد نصیب بادشاہوں سے کسی قدر ہمدردی اور محبت کرتی تھی اس کا اندازہ اس واقع سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ عالمگیر ثانی کو اس کے وزیر عماد الملک ثالث نے دھوکہ سے فیروز کوئلہ میں قتل کر دیا اور لاش کو جمنائی ریت پر پھینک دیا۔ منہ اندھیرے ایک ہندو برہمن عورت جمنائی پر آئی تو دیکھا کہ بادشاہ کی لاش پڑی ہے۔ یہ دیکھ کر بہت روئی اور اس وقت تک لاش کی حفاظت کی جب تک اسے ٹھا کر قلعہ میں لے جانے والے نہ آگئے۔ شاہ عالم نے اس عورت کو اس طرح اپنے باپ کی لاش کی حفاظت کرنے پر اپنی ”منہ بولی بہن“ بنایا۔ ہر سال رکشا بندھن کے موقع پر وہ آتی بادشاہ کی کلانی پر اپنے ہاتھ سے رکشا بندھن باندھتی اور بادشاہ اسے انعام و اکرام دے کر رخصت کرتا۔ اس موقع پر شاہ عالم کے جد اعلیٰ ہمایوں بادشاہ نے جس طرح راکھی کی لاج رکھی تھی اور اس کے لیے خود اور اپنی سلطنت کو خطرے میں ڈال دیا تھا اس واقعہ کا یاد آجانا ایک فطری بات ہے۔

اس دور میں میلے ٹھیلے تیج تہوار اور جینے مرنے کی رسمیں بھی اس یگانگت کے رشتے کا پتہ دیتی ہیں جو دونوں فرقوں کے دلوں کو پریم کی ایک ڈوری میں باندھے ہوئے تھا۔ اس میں۔۔۔

راجہ اور رنگ کی کوئی قید نہ تھی بسنت پر جو میلا ہوتا تھا اس میں سبھی شریک ہوتے تھے اس موقع پر اولیاء اللہ کے مزارات پر قوالیاں ہوتیں پھول برستے اور عطر و گلاب چھڑکا جاتا۔ حضرت مرزا جان جاناں اس عہد کے مشہور اولیائے کبار میں سے تھے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مرزا مظہر جان جاناں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

”مرزا صاحب کے مذہبی عقائد میں بڑی — وسعت اور توانائی تھی انہوں نے وید کو الہامی کتاب قرار دیا اور الہند کو اہل کتاب کا مرتبہ دے کر مذہبی کتاب وید کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور جس طرح بعض ہندو رسوم کی وضاحت کی ہے اس سے مذہب فکر کا ایک نیا باب کھلتا ہے۔“

حضرت شاہ عبدالعزیز ولی اللہی مکتب فکر کے بہت ممتاز سربراہ ہیں۔ علم تفسیر، حدیث فقہ سیرت اور تاریخ میں شہرہ آفاق تھے۔ طبیعات الہیات اور منطق وغیرہ میں یکتائے زمانہ بزرگ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ کو پریشور کے نام سے یاد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں انہوں نے جس طرح ہندو راؤ کو مشورے دیے اس سے دونوں فرقوں کے ممتاز افراد اور اشخاص کے درمیان ذہنی یگانگت کا ہی نہیں آزادی کے لیے مشترک درد کا بھی پتہ چلتا ہے۔

سر سید کے نانا نواب دبیر الدولہ فرید الدین خاں نے اپنے انتقال سے قبل جو جائیداد تقسیم کی تو اپنے ایک قدیم ہندو دیوان لالہ تلوک چند کو برابر کا حصہ دیا۔ ایک اور واقعہ جو سر سید نے سیرت فریدیہ میں بھی لکھا ہے۔ بڑا دلچسپ ہے کہ ایک ہندو تیرانداز ”اللہ غنی“ کہہ کر تیر چلاتا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام ہی ”اللہ غنی“ پڑ گیا تھا۔ قدیم دلی کا بچ زمانہ عذر سے پیشتر مشترکہ ہندی اقدار اور تعلیم و تربیت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کے طلباء اور اساتذہ

۱۔ اوراق مصورہ : ۸۰

۲۔ اوراق مصورہ : ۸۱

۳۔ اوراق مصورہ : ۸۱

میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے اور دونوں ہی نے اس کی آغوش تربیت میں پرورش پائی۔  
ہندوستان بھر میں اس تاریخی ادارہ کا نام روشن کیا۔

اس ادارہ کے تربیت یافتہ لوگوں میں اگر ایک طرف مولوی ذکار اللہ۔۔۔ مولانا محمد  
حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد جیسے نابغے ہیں تو دوسری طرف ماسٹر رام چندر ماسٹر بھیروں پرشاد  
ماسٹر پیارے لال آشوب جیسی علمی ادبی اور تہذیبی شخصیتیں ہیں۔

سی ایف اینڈ ریویز نے اپنی کتاب ذکار اللہ آف دہلی میں مغلوں کے آخری زمانے کی جو  
تصویر پیش کی ہے۔ اور جس کے لیے تمام تر معلومات اس نے خود دہلی سے اکھٹی کی تھیں وہ دہلی  
میں شاہی و شہری تہذیب اور اس کی پیدا کردہ مذہبی رواداری اور تہذیبی ہم آہنگی کے لیے  
ایک نہایت اہم ثقافتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک موقع پر اس نے لکھا ہے۔

” ایک ہی شہر میں ہندو مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی وجہ سے عوام کے ایک  
دوسرے کے رسم و رواج میں نمایاں اشتراک پیدا ہو گیا تھا۔ دہلی میں بہ لحاظ تعداد  
ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں بھی غیر مساوی نہیں رہے۔ ہندوؤں کا اگر خاص  
طور پر تجارت میں نمایاں حصہ تھا تو مسلمان زیادہ تر نظم و نسق سے متعلق تھے۔

پرانہ دلی (شاہ جہاں آباد) کے مابین کسی اور بات کے بجائے اس خصوصی  
دوستانہ تعلق کی مجھے یقینی اور تصدیقی شہادتیں ملی ہیں۔

اس سے ہم اس تہذیبی روایت اور تمدنی مزاج کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ جو  
صدیوں تک ہندوستان کی مشترک تہذیب اور ملے جلے کلچر کا آئینہ دار رہا ہے۔

لے ذکار اللہ دہلی :- (تعلیمی مرکز کراچی) : ۴۳

## ابن بطوطہ

عبداللہ بن محمد جو ابن بطوطہ کے نام سے مشہور ہے، اہم سیاحتوں میں سے بیرو سفر سے اسے غیر معمولی دل چسپی تھی جہاں قیام کرتا تھا وہاں کے حالات و حادثات کو اپنی یادداشتوں میں محفوظ کر لیتا تھا۔

۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سے مقامات کا سفر کیا

اور مصر سے ہوتا ہوا عہدِ وسطیٰ کا یہ عظیم سیاح ملتان پہنچا اور ملتان سے دہلی آیا۔ دہلی میں یہ تقریباً سولہ برس قیام پذیر رہا۔ اس کے قیامِ دہلی کا زمانہ محمد بن تغلق کا دورِ حکومت ہے۔ سلطان اس سیاح کی بڑی قدر کرتا تھا اس نے اسے (ابن بطوطہ) کو دہلی کا قاضی بھی بنایا تھا اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے مقبرہ کے انتظامات بھی اس کے سپرد کیے تھے۔

انہی انتظامات کے سلسلے میں جو جائداد وقف کی گئی تھی اس سے متعلق خرچ

یا مالیانہ کو وصول کرنے کے لیے (جو بصورتِ جنس ہوتا تھا)۔ ابن بطوطہ نے امر وہم کا بھی سفر کیا تھا۔ ابن بطوطہ کے زمانہ میں اور بھی بہت سے دوسرے ممالک امیر زادے یہاں مقیم تھے اور سلطان کی عنایات اور اس کے عطیات سے بہرہ ور ہوتے تھے سلطان نے اپنے بعض معزز مہانوں کو قیام کے لیے بڑے بڑے محلات عطا کیے تھے۔ کچھ ایسی صورتِ حال مسالک الابصار میں بھی ملتی ہے۔

سلطانی بخشش دینار و درم میں بھی ہوتی تھی جس سے مراد اس زمانہ کے سکتے ہیں اور زیادہ تر آٹا، دال، گوشت، سبزی، گھی، شکر وغیرہ اشیائے ضروری کی مقدار معین ہو جاتی تھی۔ وقتاً فوقتاً مزید عنایات اور بخشش بھی ہوتی تھیں اور جن اشیاء کی بخشش ہوتی تھی ان میں مختلف چیزوں کے علاوہ بانڈیاں

اور غلام بھی ہوتے تھے گھوڑے جوڑے بھی اور دوسری قیمتی اشیاء بھی۔ سلطان کو بھی اُس کے اہل دربار اور باہر سے آنے والوں کی طرف سے نذریں پیش ہوتی تھی۔ ابن بطوطہ کے بیانات میں دو بیان بہت اہم ہیں ایک یہ کہ جب اُس کی بیٹی کا انتقال ہوا تو سووم کی رسم کے دن۔۔ بادشاہی حکم کے مطابق عزاداری کی بعض رسومات ادا کی گئیں ان میں پھول چڑھانے کی رسم خاص طور پر تھی۔ شاید اسی وجہ سے دہلی میں تیجے کی رسم کو پھول کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر سلطان کی والدہ نے اس باندی کو بھی بلایا تھا جس کی وہ بچی تھی باندی ایک رات سلطان کی والدہ کی نہان رہی واپسی میں اس کو جو کچھ دیا گیا وہ ابن بطوطہ نے اپنے قرض خواہوں کو بھیج دیا۔ باندیوں اور غلاموں کا تبادلہ یا پیش کش اس طرح ہوتی تھی جیسا کہ وہ کوئی ایسی جاندار تھے ہوں جنہیں بے تکلف بیچا اور خریدا جاسکتا ہے باندیاں اور غلام تحفہ میں بھی دیئے جاتے تھے۔

ایک بار ابن بطوطہ کو آٹھ دس لڑکیاں تحفتاً پیش کی گئیں تھیں ان میں سے ایک تو ابن بطوطہ نے لانے والے کو ہی بخش دی تھی۔ دو تین لڑکیاں جن کی عمریں بہت کم تھیں وہ کچھ لوگوں نے پالنے کے لیے لے لیں باقی کو بیچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ان کی کوئی قیمت اس لیے لگ نہیں سکتی تھی کہ وہ سیدھی سادھی لڑکیاں تھیں نہ ان کو رقص و موسیقی جیسا کوئی فن آتا تھا اور نہ وہ کسی خاص ہنرمندی سے بہرہ ور تھیں۔

دوسرا اہم واقعہ سلطان کی بہن فیروزہ خانم کی شادی ہے جو امیر سیف الدین غدا سے کی گئی تھی۔ اس موقع پر جو رسم ادا کی گئیں وہ بالکل ہندوستانی تھیں وہ دو لہا کو اچھی بھی نہیں لگیں کہ وہ اس کلچر سے واقف ہی نہیں تھا۔

ایک بار سلطان ابن بطوطہ سے ناراض ہو گیا تھا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سلطانی قہر و غضب کا شکار ہو جائے اور بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا جائے لیکن اتفاق سے اُس کی جان بچ گئی سلطان نے اسے معاف کر دیا

# سفر نامہ ابن بطوطہ

حالیہ دہلی

## از ملتان تا دہلی

ملتان سے پایہ تخت دہلی تک چالیس دن کا فاصلہ ہے جس میں بہت سی بستیاں اور آبادیاں ملتی ہیں۔ وہ حاجب اور رفیق جو خداوند زادے کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے عام لوازمات سفر کو مہیا کر دیا۔ تقریباً بیس آدمیوں نے ملتان سے خورد و نوش کا سامان اپنے ساتھ لیا۔ اس کے علاوہ حاجب رات کے وقت سفر کرتا اور جہاں فرود ہوتی وہاں ٹھہر جاتا اور استراحت کے وسائل اور کھانے پینے کا اہتمام کرتا۔ خداوند زادہ جب کسی جگہ پہنچتا تو پہلے سے کھانے کی اشیاء مہیا ہوتی تھیں۔ دوسرے لوگ بھی جو مہمان ہوتے تھے وہ علیحدہ فیوں میں اترتے تھے اور اکثر اس دسترخوان پر کھانے میں شریک ہوتے تھے جو خداوند زادہ کے لیے بچھایا جاتا تھا۔ لیکن میں صرف ایک بار شریک ہوا۔ کھانے کی ترتیب کچھ اس طرح ہوتی تھی۔ دسترخوان پر جو نان یا روٹیاں چنی جاتی تھیں وہ بہت تلی پتلی اور نازک ہوتی تھیں اور بھنا ہوا گوشت بڑے بڑے ٹکڑوں میں



تقسیم ہوتا تھا۔ چنانچہ بھیڑ یا بھری پوری کی پوری چار یا چھ ٹکڑوں سے زیادہ میں تقسیم نہیں کی جاتی تھی۔ ہر ایک آدمی ایک ٹکڑا لے لیتا تھا۔ اسی طرح سے ان کی روغنی روٹیاں بہت مخصوص ہوتی تھیں۔ جو ولایت میں بنائے جانے والے نان سے مشابہت رکھتی تھیں۔ ان کے میدے کو کچھ اس طرح خمیر کیا جاتا تھا کہ اس میں ایک گونا، بلیس پیدا ہو جاتا تھا اور اس کے اوپر اس شیرینی کے ٹکڑے لگائے جلتے تھے جسے ہم خشکی کہتے ہیں یہ لال روٹیاں، میدے، شکر اور روغن سے تیار ہوتی تھیں۔

اس کے بعد کھانے کے لیے ایک ایسا گوشت لایا جاتا جو روغن، پیاز، اور زنجبیل سبز کو ملا کر تیار کیا جاتا تھا اور چینی کے برتنوں میں کھانے کے وقت اتارا جاتا تھا۔ اس کے بعد ایک اور شے غذا کے طور پر لائی جاتی کہ جس کو سمو سک کہتے تھے اور وہ ایک ایسے گوشت سے تیار کیا جاتا ہے جسے خوب کوٹا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مغز بادام پستہ اور دوسری چیزیں اس کے اندر بھری جاتی ہیں پھر اس کو گھی میں تلا جاتا ہے اور ہر آدمی کے سامنے چار چار یا پانچ پانچ کوفتے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چاول لائے جلتے جن کو گھی میں بھون کر تیار کیا جاتا ہے۔ جسے پلاؤ کے نام سے یاد کرتے تھے اور اس کے ساتھ چوزہ ہائے مرغ ہوتے۔ سب کے آخر میں "لقیات القاضی" یا قاہرہ کو لایا جاتا۔ اس القاضی کو ہندوستان میں ہاشمی کہا جاتا ہے (جو ایک طرح کی مٹھائی ہے)۔

حاجب کھانا کھانے سے قبل دسترخوان کے کنارے کھڑا ہوتا ہے اور جس طرف سلطان کا رخ ہوتا۔۔۔ اس طرف اپنا رخ کر کے خدمت بجالاتا ہے اور تمام حاضرین جملہ طعام اسی طرح ادا کے خدمت کرتے۔۔۔ خدمت کے یہ معنی ہیں کہ اپنے سر کو روک کر کی حد تک جھکا لیتے۔۔۔ بعد ازاں بیٹھ جاتے ہیں اور سنہری اور وہیلی پیالوں میں یا پھر شیشے کے ظروف میں ان کو شربت پیش کیا جاتا۔۔۔ اسے کھانے کے بعد نوش جان کیا جاتا۔ اس کے بعد حاجب بسم اللہ کہتا۔۔۔ اور دسترخوان پر بیٹھے ہوئے لوگ کھانا شروع کرتے ہیں کھانے کے بعد ایک خاص طرح کا مشروب کوزوں میں لایا جاتا جسے فقار کہتے ہیں۔ اس کے پان اور چھالی پیش کی جاتیں بعد ازاں پھر حاجب بسم اللہ کہتا لوگ اٹھتے اور اپنی اپنی منزل کی راہ لیتے ہیں۔

## ہندوستان کے درخت اور میوے

اب میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے میوؤں اور درختوں کے بارے میں بھی کچھ کہوں۔ ام یہاں کا ایک خاص درخت ہے جو نارنج کے مانند ہوتا ہے۔ مگر اُس سے کہیں زیادہ سخت اور بڑا۔ تناور ہوتا ہے۔ ام کا سایہ بہت گھنا ہوتا ہے اور جو آدمی اُس کے نیچے سو جاتا ہے اُس کے پیچھے درد کرتے لگتے ہیں۔ ام کا پھل ایک بڑے گلاب جیسا ہوتا ہے۔ سبز رنگ کے کچے ام جو زمین پر گر پڑتے ہیں ان کو جمع کر لیتے ہیں ان کی پھانکیں کر کے ان نمک لگاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ کوئی ترش چیز ڈالتے ہیں جیسا کہ ہم لوگوں کے یہاں ولایت میں ہوتا ہے ہم میٹھے لیمو اور ترش لیمو سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح زنجبیل اور فلفل کے خوشے اُس میں ڈالتے ہیں اور اچارتیار کرتے ہیں۔ یہ ترش مرنی وہ خوراک کے ساتھ کھاتے ہیں اور ہر لقمے کے ساتھ ذرا سا اُس میں سے لیتے جاتے ہیں۔ ام کا پھل دگر میووں کے آخر میں، خوب ہوتا ہے اور جب پک جاتا ہے تو اُس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ سیب کی طرح اسے چاقو سے پھانکیں کر کے کھاتے ہیں یا پھر چوستے ہیں۔ ام میں ہلکی سی ترشی بھی ہوتی ہے اس کی گٹھلی بڑی ہوتی ہے اور اس کو نارنجی کے بیجوں کی طرح بوتے ہیں جس سے ام کا پودا نکلتا ہے۔

## شکی اور برگی

یہ ایسے درخت ہیں جن کو گھنسال کہا جاتا ہے۔ ان کے پتے ”گردو“ کے پتوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا پھل زیادہ تر درخت کی بڑی شاخوں میں لگتا ہے۔ ان درختوں میں سے جو چھوٹے قد کا ہوتا ہے اور زمین سے متصل رہتا ہے اُس کو برگی کہتے ہیں۔ وہ اپنی شیرنی اور مٹھاس میں بہت خوب ہوتا ہے اور ان میں سے جو درخت بلند ہوتے ہیں وہ ہسکی کہلاتے ہیں جن کا میوہ کدوئے قلیانی کے مشابہ ہوتا ہے اور ان کی چھال پوست کاؤ جیسی پکنے کے زمانے میں یہ میوہ زرد ہو جاتا ہے۔ اس کو کاٹ کر پھر شگاف دیتے ہیں اور اُس کے

اندروسے سو، دوسو کے قریب دانے نکلتے ہیں جو موتی جیسے ہوتے ہیں اور ہر ایک دانہ تدر رنگ کے پردے کے باعث دوسرے سے الگ ہوتا ہے اور ہر دانے کی شکل بالقلے کے بیج جیسی ہوتی ہے۔ جب اسے پکاتے ہیں یا بھونتے ہیں تو یہ بالقلے جیسا مزہ دیتا ہے۔ بالقلہ ہندوستان میں نہیں ہوتا۔ اس کے بیجوں کو سُرخ مٹی میں سال بہ سال حفاظت سے رکھتے ہیں۔ شکی اور برگی ہندوستان کے بہترین پھلوں میں سے ہیں۔

## تندو

تندو ایک آبنوسی رنگ کے درخت کا میوہ ہوتا ہے۔ اس کے بیج زرد آلو جیسے ہوتے ہیں اور اُس کا رنگ بھی کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے۔

## جون

یہ بھی گھنسال درختوں میں سے ہے۔ اُس کا میوہ زیتون کے پھل سے مشابہ ہوتا ہے اور اس کا بیج بھی زیتون کے بیج جیسا ہوتا ہے۔

## نارنج

نارنج شیریں ہندوستان میں بکثرت پیدا ہوتا ہے اور نارنج ترش بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ہندوستان میں نارنج کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے۔ یہ خوش مزہ ہوتا ہے اور درشتی میں لیمو سے مشابہ ہے۔

## مہوا

مہوا کا درخت بھی گھنسا یہ دار ہوتا ہے اور اُس کے پتے برگ گردو سے مشابہ ہوتے ہیں لیکن اُس کے پتوں میں سُرخ اور زردی ملی جلی ہوتی ہے۔ مہوا کا پھل چھوٹے سے گلاب کے مشابہ ہوتا ہے اور بہت ہی میٹھا۔ اس کے ہر دانے میں انگوڑ کے بیج کی طرح

چھوٹا سا بیج ہوتا ہے لیکن اس کا ذائقہ انگوڑی کی طرح ہوتا ہے اور اگر کوئی آدمی زیادہ کھالیتا ہے تو اُسے سرد درد ہو جاتا ہے۔ جب اس کے دانے کو دھوپ میں خشک کر لیتے ہیں تو انجیر کا سا مزہ پیدا کرتا ہے۔ چونکہ انجیر ہندوستان میں پیدا نہیں ہوتا میں اسی کو انجیر کی جگہ کھاتا رہا ہوں۔ اسے ہندوستان کا انگوڑی بھی کہتے ہیں۔ لیکن خود انگوڑی ہندوستان میں نہیں ہوتی یا بہت ہی کم ہوتی ہے اور سوائے دہلی اور چند دوسرے علاقوں کے دیکھنے میں نہیں آتا۔ ہوا سال میں دو بار پھلتا ہے اُس کے دانوں سے روغن بھی نکالا جاتا ہے اور مہو کا۔ تیل چراغ جلانے کے کام بھی آتا ہے۔

## کسیرو

یہاں کی زمینی پیداوار میں سے ہے اور بہت میٹھا ہوتا ہے۔ وہ شاہ بلوط سے مشابہہ ہوتا ہے۔ ہماری ولایت میں جو پھل پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے انار ایسا ہے جو ہندوستان میں بھی ہوتا ہے۔ میں نے جزائر دیبل میں دیکھا ہے کہ اس پھل دار درخت کے پھل زمین پر گرتے ہیں اسے انار کہتے ہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ جلنار کا لفظ بھی اسی سے نکلا ہے جو دو کلموں سے بنا ہے۔

## غذائی اجناس [جو ہندوستان میں پیدا کی جاتی ہیں]

ہندوستان کے لوگ سال بھر میں دو بار فصل پیدا کرتے ہیں۔ موسم گرما میں جس کے بعد وہاں بہت بارش ہوتی ہے۔ کاشت کاری کا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ خریف کی فصل کہلاتی ہے اور ساٹھ دن کے فاصلے پر اسے کاٹ لیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے جملہ محصولات میں سب سے زیادہ چاول کی فصل سے خریف کی آمدنی ہوتی ہے جو گاؤں دانہ کی ایک قسم ہے اور ہندوستان میں بیشتر اس کی کاشت کی جاتی ہے۔ دوسرے قسال؟ (جوار) جو گاؤں دانہ سے مشابہہ ہوتی ہے۔ تیسرے شاماخ؟ (باجرہ) جس کا دانہ قسال سے چھوٹا ہوتا ہے۔ شاماخ کبھی کبھی بغیر کاشت کاری کے اگ آتا ہے اور یہ فقیروں، درویشوں، صوفیوں اور مسکینوں کی خوراک

ہے۔ اُس کے دانوں کو جو کہ خود رو طریقے پر اُگاتے ہیں اور ایسے علاقوں میں ہوتے ہیں۔ جو کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہوتے۔ انھیں جنگل سے اکٹھا کر لیا جاتا ہے۔ جمع آوری کے لیے ایک بڑا سا ٹوکرا اپنے ساتھ لیتے ہیں۔ اُسے شاماخ کے پودے کے نیچے رکھتے ہیں اور اوپر سے چھڑی مارتے ہیں جس سے اُس کے دانے ٹوکری میں گر جاتے ہیں اور اس ترکیب سے بغیر کاشتکاری کے یہ لوگ اپنا سالانہ بزرگ جمع کر لیتے ہیں۔ شاماخ کے دانے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اُن کو جمع آوری کے بعد دھوپ میں سُکھاتے ہیں اور اُس کے بعد اوکھلی میں کوٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا چھلکا اتر جاتا ہے اور سفید گری نکل آتی ہے اور اُس سے کھیر پکائی جاتی ہے اور اُس میں پھینس کا دودھ ڈالا جاتا ہے جس سے وہ خوش ذائقہ ہو جاتی ہے۔ باجرہ کا یہ حلوہ یا کھیر اُس کی روٹی سے زیادہ مزے دار ہوتی ہے۔ میں ہندوستان میں اکثر اُسے کھاتا تھا اور بہت لطف آتا تھا۔

## چہارم ماش یعنی اُڑکی دال پنجم مونگ

یہ ایک خاص طرح کا دانہ ہوتا ہے اور اُس میں نشاستہ کافی سے زیادہ ہوتا ہے کہ وہ بھی ماش کی ایک قسم ہے اور اُس میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اُس کے دانے دراز ہوتے ہیں اور اُس کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ مونگ کو چاولوں کے ساتھ بھی پکایا جاتا ہے اور گھی ڈال کر نما جاتا ہے۔ اس غذا کو کھچڑی کہتے ہیں اور صبح کی غذا اکثر وہی ہوتی ہے اور ہندوؤں کے یہاں یہ تریہ کی شکل میں ہوتی ہے اور اس میں پانی زیادہ ہوتا ہے۔

## ششم لوبیا

یہ باقلے کی ایک قسم ہے۔

## ساتویں موٹ

یہ کزرو؟ (کی طرح ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ اُس کے دانے

زیادہ چھوٹے ہوتے ہیں۔ موٹ چوپاؤں کو بھی کھلائی جاتی ہے اور حیوانات کو خوب چاق و چوبند رکھتی ہے۔ ”جو“ ہندوستان میں بہت کم قوت ہے۔۔۔ اسے موٹ کے ساتھ کوٹتے ہیں اور پانی ملا کر اُس کا خمیر تیار کرتے ہیں اور پھر کھلاتے ہیں۔ اس میں دو بار پانی دیا جاتا ہے اور بجائے قصبیل؟ ( ) کے ماش کے پتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس ترکیب سے کہ دس دن تک روزانہ تین یا چار رطل روغن چوپایوں کو کھلاتے ہیں اور اس زمانے میں انھیں سواری کے کام میں نہیں لاتے۔ اُس کے بعد ایک ماہ تک اُسے اردھ کے پتے کھلاتے ہیں۔

جن دالوں یا فصلوں کا ذکر آیا وہ سب کے سب موسم خریف کے محصولات میں سے ہیں۔ اس فصل کو کاٹنے کے بعد زرع کی فصل بوئی جاتی ہے، فصل بہار میں کی جانے والی کاشت سے مراد گندم، جو، چنا اور مسور ہے۔ اس کی کاشت خریف کی فصل کی جگہ کی جاتی ہے۔ اس نواح کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ چاول کو سال بھر میں تین مرتبہ بویا جاتا ہے چاول کی فصل ہندوستان کی سب سے بڑی فصل ہے۔ تل اور نئے شکر کو فصل خریف کے ساتھ بویا جاتا ہے۔

## وصفِ دہلی

دہلی کا قبہ زیادہ تر آباد اور بہت معمور ہے شہر دہلی اس وقت چار شہروں سے مل کر تشکیل پاتی ہے جو ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ بلکہ بالکل ملے ہوئے ہیں ایک کا تو یہی دہلی نام ہے جو ہندوؤں کے وقت کا قدیم شہر ہے۔ شہر دہلی ۵۸۴ھ میں فتح ہوا۔ دوسرے شہر کا نام سیری ہے جسے دار الخلافہ کہہ کر بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس کو سلطان غیاث الدین تغلق نے مستقر باللہ خلیفہ بغداد کے نواسے کو دیدیا تھا۔ سلطان علاؤ الدین خلجی اور اُس کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ اسی شہر میں رہا کرتے تھے۔ تیسرا تغلق آباد ہے کہ اُس کو سلطان غیاث الدین تغلق نے (موجودہ سلطان ہند جس کا بیٹا ہے) بنایا تھا اور اس کا سبب یہ تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز وہ سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے سامنے بیٹھا تھا تب اُس

نے اُس سے کہا کہ اتھوندِ عالم کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہاں ایک شہر بسایا جاتا۔ سلطان نے ایک گونہ تنہ لہجہ میں یہ بات کہی کہ جس وقت تو میری جگہ پر تخت نشیں ہو جائے اُس وقت ایسا کرنا۔ تقدیر الہی بھی کچھ اسی طرح تھی کہ قطب الدین مبارک شاہ کے بعد سلطنتِ غیاث الدین تغلق کو مل گئی اور اس شہر کی بھی اُس نے بنیاد قائم کی اور اپنے نام پر ہی اُس کا نام رکھا۔

جو تھی دہلی جہاں پناہ ہے جو کہ مخصوص طور پر محمد بن تغلق سلطان ہند کی قیام گاہ ہے۔ ہم جس کے حضور میں پہنچے تھے۔ اس دہلی کو محمد بن تغلق نے خود بنایا۔ سلطان یہ خیال رکھتا تھا کہ چاروں شہروں کو ایک ہی شہر بنادے اور ان کے چاروں طرف ایک حصار کھینچ دیے۔ لیکن کیونکہ اس کے اخراجات بہت ہوتے تھے اس لیے اس کو مکمل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

## حصارِ دہلی

جو شہر پناہ دہلی کے گرد اگر دو واقع ہے اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس دیوار کی پہنائی گیارہ گز ہے اور اُس میں ایسے اطاق بنے ہوئے ہیں جو قراولوں اور دروازوں کے محافظ سپاہیوں کے کام آتے ہیں اور اسی کے ساتھ اُس میں ایسے ذخیرہ گاہیں (مخازن) بنے ہوئے ہیں جن میں اسلحہ وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ شہر پناہ کی حفاظت کے لیے منجنت اور اسی طرح سے آگ برسنے والے کچھ ہتھیار بنائے گئے ہیں۔ یہاں انبار کے نام سے کچھ ایسے مخازن بھی ہیں (کھیتوں کی قسم کی چیزیں) جن میں ایک لمبی مدت تک غلہ کو محفوظ رکھا جاتا ہے اور وہ خراب نہیں ہوتا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ان انباروں میں سے چاول باہر نکالے گئے۔ ان کا رنگ تو بدل گیا تھا اور سیاہ ہو گیا تھا لیکن ذائقہ اسی طرح کا تھا اور اسی طریقے سے ایک دوسرے انبار سے مکئی نکالی گئی۔ یہ تمام ذخیرے سلطان بلبن کے زمانے سے چلے آ رہے ہیں یعنی اب سے تقریباً نوے سال پہلے ان کو ذخیرہ کیا گیا تھا۔ شہر پناہ اندر سے کچھ اس طور پر بنائی گئی ہے کہ سوار اور پیادے اول شہر سے انتہائے شہر تک اُس کے ساتھ ساتھ جاسکتے ہیں۔ اس میں ایسی جالی دار کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جو شہر کی طرف کھلتی ہیں

اور ان سے روشنی شہر پناہ کے طاقوں اور تجڑوں میں پہنچتی ہے۔ شہر پناہ کا زیرین حصہ پتھر سے اور اُس کا بالائی حصہ چونے اور گنچ سے بنا ہوا ہے۔ اُس کے برج ایک دوسرے سے نزدیک نزدیک بنے ہوئے ہیں اور اچھی بڑی تعداد میں ہیں۔

شہر دہلی کے اٹھائیس در ہیں کہ ان کو دروازہ کہا جاتا ہے۔ ان میں سب سے بڑا دروازہ بدایوں دروازہ اور منڈی دروازہ ہے۔ منڈی اس لیے کہ مختلف اناجوں کی خرید و فروخت وہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک در ”دروازہ گل“ کہلاتا ہے کہ جس میں بہت سے باغات ہیں۔ اسی طرح ایک در ”دروازہ شاہ“ کہلاتا ہے کسی شاہ کے نام پر ہے۔ دروازہ پالم (ایک قریب کا نام ہے) اسی طرح دروازہ نجیب کہ یہ بھی کسی کے نام پر ہے اور دروازہ کمال کمال نامی کسی شخص سے نسبت رکھتا ہے اور اسی طرح ”دروازہ غزنہ“ جو شہر غزنی سے منسوب ہے کہ اطراف خراسان واقع ہے۔ عید گاہ اور بعض مقبرے اسی دروازے کے سامنے ہیں۔

ایک اور دروازے کا نام بجالہ (کنا) دہلی کے قبرستان اسی دروازے کے باہر واقع ہیں۔ یہ گورستان بڑی خوبی سے بنائے گئے ہیں۔ یہاں کے معمول کے مطابق قبروں پر گنبد بنائے جاتے ہیں۔ اگر کسی قبر پر گنبد نہیں ہوتا تو محراب فرور ہوتی ہے۔ گل شہو، رائے بیل جو ہی اور دوسرے طرح طرح کے پھول یہاں کے گورستانوں میں بوئے جاتے ہیں۔ یوں بھی پھول ہندوستان میں بہت پیدا ہوتا ہے۔ در کسی فصل میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ پھول دستیاب نہ ہوں۔

## مسجد جامع دہلی

دہلی کی جامع مسجد بہت وسیع ہے۔ اُس کی دیواریں اُس کے سقف و ستون اور فرش و فرش سفید پتھر سے تراشے گئے ہیں اور سنگ تراشی کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ جو بڑی مہارت کے ساتھ مسالے کی مدد سے ایک دوسرے سے جوڑے گئے ہیں بکری اس کی تعمیری ساخت میں کہیں استعمال نہیں ہوئی۔ یہ مسجد تیرہ سنگین گنبد اور چار صحن



دالان) رکھتی ہے۔ اُس کا منبر بھی پتھر ہی سے بنایا گیا ہے۔ مسجد کے وسط میں ایک بہت بڑا پُربیت ستون ہے جس کے لیے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کونسی کھان سے نکلا ہے۔ ہندوستان کے حکما میں سے ایک شخص نے مجھ سے یہ کہا کہ یہ دھات ہفت جوش کہلاتی ہے اور اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کو سات مختلف دھاتوں سے ترکیب دیتے ہیں۔ اس ستون میں ایک ایسی جگہ بھی ہے جسے ایک انگشت سبّابہ کے بقدر تراشا گیا ہے اور وہاں سے بجلی کی طرح کوئی چیز چمکتی ہے۔ لوہا اس ستون میں کارگر نہیں ہوتا اس کی لمبائی تیس گز ہے اور اس کی گولائی یا قطر کو میں نے اپنے عملے کو اس کے گرد لپیٹ کے ناپا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ سات گز ہے۔

مسجد کے شرقی دروازے کے قریب دو بہت بڑے پتھر پڑے ہوئے ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا گیا ہے جو شخص کہ یہ چاہتا ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہو تو اُس کے قدم ان پتھروں پر پڑتے ہیں۔ یہ مسجد پہلے کسی بت خانے کی شکل میں تھی کہ فتح دہلی کے بعد اُس کو مسجد بنا دیا گیا۔ مسجد کے شمالی صحن میں ایک ایسا مینار موجود ہے کہ جس کی نظیر تمام بلاد اسلامیہ میں بھی نہیں ہے۔

اس مینار کو سنگِ سُرخ سے بنایا گیا ہے۔ جبکہ مسجد کے باقی دوسرے حصے سنگِ سفید سے بنے ہیں جو پتھر اس مینار میں استعمال ہوا ہے۔ وہ بڑی بڑی سلوں کی شکل میں ہے اور یہ منقوش ہیں۔ اُس کا فرش مرمری۔ سفید سے بنا ہے جو بہت ہی روشن اور پاکیزہ ہے اور اس کے گلہ استے سنہرے کام سے آراستہ ہیں۔

## دورود ابن بطوطہ بہ دہلی

شہر دہلی میں ورود کے بعد ہم دربارِ سلطانی کی طرف روانہ ہوئے اور یکے بعد دیگرے چلے، دوسرے اور تیسرے دروازے سے گزرے ہم نے وہاں نقیبوں کو پایا اور انہوں نے ایک وسیع و عریض ہال کی طرف ہماری رہنمائی کی۔ خواجہ جہاں کہ وزیر سلطان تھا اس سے یہاں ملاقات ہوئی وہ ہمارا منتظر تھا۔ فیاض الدین خداوند زادہ سب سے آگے تھا، اس کے پیچھے اس کے بھائی توام الدین اور عماد الدین تھے۔ ان کے عقب میں خود میں تھا اور میرے بعد خداوند زادے کے بھائی برہان الدین، پھر امیر مبارک سمرقندی، ترک امیر نیز خداوند زادے کے بھانجے اور بدر الدین فصالح ترتیب کے ساتھ وارد ہوئے۔

دیرِ سووم سے گزر کر ہم اس بڑے دربار ہال میں پہنچے جس کو "قصر سزارستون" کہا جاتا ہے یہ عوام کی پزیرائی کا محل (دیوان عام تھا) وزیر یہاں پہنچ کر کورنش بجالایا۔ اور اس نے اس طرح اپنے سر کو جھکایا کہ قریب تھا کہ وہ زمین سے جا لگے۔ ہم نے بھی جھک کر اپنی انگلیوں سے زمین خدمت کو چوما اور جس جانب کہ سلطان گردن کو خم کیے بیٹھا تھا اسی سمت اپنا سر جھکا دیا۔ میرے ہمراہیوں نے بھی یہی رسم سلام ادا کی۔ بعد ازاں نقیبوں نے بلند آواز میں "بسم اللہ" کہا اور ہم باہر آگئے۔

## مادرِ سلطان سے ملاقات

سلطان کی والدہ مخدومہ جہاں دنیا کی بہترین عورتوں میں سے ہے جو صدقات و خیرات میں بہت پیش دستی کرتی ہے اور غریب غرباء، لوگوں اور مسافروں کے واسطے اس نے بہت سی قیام گاہیں بنوائی ہیں جہاں فقراء اور مساکین کو کھانا کھلایا جاتا ہے لیکن اب وہ بینائی سے محروم ہے اور اس کی کہانی یہ ہے۔

کہ جب اس کا بیٹا سریر آرائے سلطنت ہوا تو شاہی خاندان کی تمام محترم خواتین شہزادگان والا نماد، شہزادیاں اور امراء کی بیٹیاں بہترین لباس زیب تن کر کے وہاں آئیں

کہ بادشاہ کا دیدار کریں۔ سلطان کی والدہ ایک جواہر نگار و مرصع کار تخت پر رونق افروز تھیں اس وقت کچھ ایسی چکاچوند دیکھنے میں آئی کہ مخدومہ جہاں کی بینائی جاتی رہی — بہت علاج معالجہ کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔

سلطان انہیں بہت عزیز رکھتا ہے اور ان کا احترام بجا لاتا ہے ایک بار جو کب سلطان کسی منزل کی طرف عازم سفر تھا، سلطان اثنائے راہ میں اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا کہ وہ مخدومہ جہاں سے آگے پہنچ کر ان کا استقبال کرے اور جب مخدومہ جہاں کی سواری پہنچی تو سلطان گھوڑے سے اتر کر پیادہ ہو گیا اور سب ارکان دولت کے سامنے محل سے باہر آئے ہوئے ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔

جب ہم دولت سرے سلطان سے باہر آئے وزیر بھی ہمارے ساتھ آیا اور ہم کو حرم سلطان کی طرف لے گیا، یہاں مخدومہ جہاں کی اقامت گاہ تھی دروازہ کے قریب آکر ہم گھوڑوں سے اتر پڑے اور میدان چلنے لگے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی حیثیت کے مطابق ہدیہ لایا تھا۔ قاضی القضاة مالک کمال الدین بن برہان الدین، بھی ہمارے ساتھ تھے۔ قاضی اور وزیر نے زمین خدمت کو چوما، ہم بھی جائے ادب پہنچ کر حسب دستور تسلیم و آداب بجالائے۔

جو وزیر حرم سرا کے دروازے پر تھا، وہ ہمارے پیش کردہ ہدیوں پر ہرثبت کر رہا تھا۔ اس وقت پیش خدمتوں کی ایک جماعت باہر آئی اور ان میں جو سب سے محترم تھا اس نے وزیر کے کان میں سرگوشی کے انداز سے کچھ کہا اور محل سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں دوبارہ اس طرف آیا اور اسی رات دارانہ انداز سے کوئی بات کی اور مراجعت اختیار کی۔

اس آمد و شد کے دوران ہم برابر کھڑے رہے، بالآخر وہ وقت آیا کہ ہمیں بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ جن پر تکلف ظروف میں کھانا لایا گیا ان میں ایک بڑے سے برتن کا نام ”سینی“ تھا یہ دیگ سے بہت کچھ مشابہ تھا، اس پر ایک سنہری کام کا سرپوش ڈمکا ہوا تھا، اسے ”سبک“ کہتے تھے۔

ان کے علاوہ زرنکار صراحیاں، طلائی کام سے آراستہ طشت اور بلورین جام لائے گئے اور کھانے کے لیے دسترخوان چنے گئے۔ ہر دسترخوان کے ساتھ دو صغیر تھیں جو ہان بڑے درجہ کے تھے

ان کو دسترخوان کے صدر میں بٹھایا گیا۔

جب ہم سب اپنے اپنے مرتبے کے مطابق سفرہ طعام پر بیٹھ گئے تو لقیبوں اور حاجیوں نے نذرانہ سلام پیش کیا اس کے جواب میں ہم بھی آداب بجالائے۔ اس وقت شربت لایا گیا اور ہم سب نے اُسے نوش جان کیا اور حاجیوں نے ”بسم اللہ“ کہا اور ہم نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا کھانے کے خاتمہ پر الچی اور پان پیش کیا گیا جس کے بعد حاجیوں نے باواز بلند ”بسم اللہ“ کہا اور ہم سب نے بھی اس کے جواب میں نذرانہ سلام پیش کیا۔

بعد ازاں ہم کو ایک اطاق میں لایا گیا اور زربفت اور شیش پانچوں کے رومال دیے گئے اس کے بعد ہمیں محل کے دروازہ پر لایا گیا اور ہم کو ریش بجالائے حاجیوں نے بسم اللہ کہا وزیر ایستادہ ہو گیا ہم نے بھی توقف کیا اندرون قصر سے بغیر سلعے ہوئے کپڑے جواز قسم حریر وناں اور کتان ورنج وغیرہ تھے ہر شخص کو اس کے حصے کے مطابق دیے گئے۔ اس کے بعد ایک سنہرے برتن میں خشک میوے اور ایک ایسے ہی دوسرے ظرف میں، کہ وہ بھی طلاکاری سے مزین تھا، شربت پیش کیا گیا اسی کے ساتھ ظرف آب بھی تھا۔

یہاں کا طریق اور درباری دستور کچھ اس طرح پر تھا کہ جس شخص کی اس طور پر رسم پزیرائی ادا کی جائے اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس ظرف کو ایک ہاتھ میں لے اور اپنے دوش پر رکھے اور دوسرے ہاتھ سے زمین خدمت کو چھو کر سلام پیش کرے وزیر نے وہ ظرف اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مقصد یہ تھا کہ مجھے وہ یاد دلائے کہ اس موقع پر مجھے کیا کرنا ہے اور یہ بھی اس کی خوبی اور تواضع پیشگی تھی۔

جب میں یہ حسب دستور ادا کر چکا تو ایک ایسی حویلی میں ہمیں پہنچا دیا گیا جو دروازہ پالم سے قریب تھی اور جہاں ہم کو ٹھہرانا مقصود تھا، بعد ازاں ہمارے لیے تورہ ضیافت آیا۔

جب ہم مہمان خانے میں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں فرش فروش اور راحت و استراحت کے دوسرے لوازمات پہلے ہی سے مہیا تھے۔ ہندوستان میں خواب راحت کے لیے بنائے جانے والے تخت، پلنگ یا مسہری، بہت ہلکے ہوتے ہیں اور ایک آدمی کینا و تنہا اٹھا کر لے جاسکتا ہے اور جو آدمی مسافت اختیار کرتا ہے وہ اپنے سونے کے پلنگ

کو بھی بہ آسانی اٹھا کر لے جاتا ہے یا پھر اس کا غلام یا ملازم جو اس کے ساتھ چل رہا ہو۔ یہاں کے یہ تخت لکڑی کے چار پایوں اور چوبی پیٹیوں سے نیم مخروطی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ اور ان کو ریشم یا روئی وغیرہ کے بانوں سے بنا جاتا ہے جو ان ان پر سوتلے تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ سونے والا ہلکی سی نمی کا اہتمام کرے کہ یہ تو پینگوں میں خود بخود موجود ہوتی ہے اس۔ ان ہلکی ہلکی مسہریوں کے ساتھ دو تکیے اور ان کے ساتھ بستر اور لحاف بھی لائے گئے کہ ان کے ابرے غلاف اور چادریں حریر سے تیار کی گئی تھیں۔

یہاں کے لوگوں کی عادت یہ ہے کہ ان چیزوں کو روئی یا کرپاس کے تہہ پوشوں میں رکھتے ہیں کہ جب وہ میلے ہو جاتے ہیں تو ان کو دھو لیتے ہیں کہ اس کے باعث یہ سب چیزیں صاف ستھری رہتی ہیں۔ اسی رات کو دو آدمی اور بھی وہاں لائے گئے کہ ان میں سے ایک آسیابان (چکی پیسنے والا) اور دو سراقصاب تھا اور ہم سے کہا گیا کہ ایک سے ہر روز اتنا آٹا اور دوسرے سے اتنا گوشت لے لیا کریں۔ مجھے ان کا پیمانہ وزن تو یاد نہیں رہا لیکن رسم یہ ہے کہ گوشت اور آٹے کی مقدار برابر رہتی ہے۔

جو کچھ یہاں بیان کیا گیا وہ مادرِ سلطان کی طرف سے رسم ضیافت کے طور پر تھا سلطان کی طرف سے ہماری ضیافت جس طور پر ہوئی اس کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔

اگلے روز ہم سرے سلطان میں گئے ہم نے وزیر کو سلام کیا اس نے دو تھیلیاں مجھے دیں جن میں ایک ہزار دینار تھے اور کہا یہ ”سرشتی“ کے طور پر ہے جس سے مراد سرشتونی یا حمام کا خرچہ ہے اور اسی کے ساتھ ”مرغزی خلعت“ بھی مجھے مرحمت کیا اور میرے تمام ساتھیوں خادموں اور غلاموں کے نام لکھ لیے اور ان کو چار گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ گروہ اول کو دو سو دینار فی گروہ دویم کو ایک صد پنجاہ دینار گروہ سویم کو سو دینار اور گروہ چہارم کو پچھتر دینار دیے گئے۔ میرے آدمی کل ملا کر چالیس کے قریب تھے اور جو کچھ ان کو دیا گیا وہ چار ہزار اور کچھ دینار تھے۔

بعد ازاں، ضیافت سلطانی متعین ہوئی کہ وہ ہزار رطل ہندی کے برابر آٹے کی مقدار تھی ان میں ایک ثلث سفید آٹا تھا اور دو ثلث دوسری طرح کا آٹا، سفید آٹے کو ”میرا“ کہا جاتا ہے اور دوسری طرح کے آٹے کو ”خوش کار“ اسی طرح ہزار رطل گوشت اور اسی

نسبت سے شکر، روغن اور نمک بفلل وغیرہ کی مقدار معین ہوئی (جن کی صحیح مقدار اب میرے حلقے میں نہیں) نیز ہزار برگ تنبول (پان) — ہندی رطل بیس رطل مغربی (مراکشی) اور پچیس رطل مصری کے ہم وزن ہوتا ہے۔ خداوند زادہ کے واسطے جو سامان ضیافت معین ہو اوہ چہار ہزار رطل آٹا اور اسی قدر دوسری اشیاء۔

## ابن بطوطہ کی بیٹی کی وفات اور ہندوستان کی تعزیتی رسمیں

ورد دہلی کے بعد ہم پر ایک ڈیڑھ سال گزر رہا تھا کہ میری چھوٹی بیٹی کہ جس کی عمر ایک سال سے بھی کم تھی وفات پاگئی وزیر کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی اس نے اجازت دی کہ اُسے دروازہ پالم کے ایک گوشہ میں جہاں شیخ ابراہیم قونوی کا مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے دفن کریں مراسم تعزیت کی بجا آوری کے لیے اجرائے فرمان کی غرض سے سلطان کو اس سانحہ سے مطلع کیا گیا اور حکم نامہ کی اجراء کے لیے التماس شب دوم سلطان کی طرف سے جواب آگیا اس صورت میں کہ سلطان اپنی تنگ نگاہ میں تھا جو دہلی سے دس روز کی پاسبانہ مسافت کی دوری پر تھی۔

ہندوستان کی رسم یہ ہے کہ میت کو سپرد خاک کرنے کے تیسرے روز صبح کے وقت اس کی قبر پر حاضری دیتے ہیں اور قبر کے چاروں طرف فرش فرش پھلتے ہیں جو ریشمی کپڑوں کے بنے ہوتے ہیں اور پھولوں کے گل دستے قبر پر بطور نذر چڑھاتے ہیں۔ ہندوستان میں پھول ہر فصل میں کھلتے ہیں اور کبھی بھی ان کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا اور برگ ریز کاموں نہیں آتا۔ چنبلی اور گل شبوکہ زرد رنگ کا ہوتا ہے نیز ”ببول“ کہ وہ سفید ہوتا ہے۔ ان کے ماسوا سرین دنتین کے پھول ہیں کہ وہ بھی سفید اور زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔

لیمو اور نارنج کی شاخیں کہ وہ پھل دار ہوتی ہیں اور اگر شاخ میوہ دار نہیں ہوتی تو لیمو یا نارنج یا ناریج کے چند دانے ان کی شاخوں میں لٹکادیے جلتے ہیں اور انھیں قبر پر چڑھایا جاتا ہے اسی طرح خشک میوے جیسے ناریل وغیرہ قبر پر رکھتے ہیں۔ جمع ہونے والے لوگ اپنے ساتھ قرآن پاک لے کر آتے ہیں اور پارہ ہائے قرآن کی قرات میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس

کے بعد لوگوں پر عرق گلاب چھڑکا جاتا ہے ان کی شربت سے تو افصح کی جاتی ہے اور برگ تنبول پیش کیا جاتا ہے۔ ان رسوم کی ادائیگی کے بعد یہ مجمع واپس ہو جاتا ہے۔

سوم کی رسم کے دن جو میت کو دفن کے بعد کا تیسرا دن ہوتا ہے ہم لوگ بوقت صبح مرنے والی کی قبر پر گئے میں نے اپنی حیثیت کے مطابق سب چیزوں کو فراہم بھی کیا لیکن وہاں جا کر یہ دیکھا کہ وزیر مجھ سے پہلے تمام فروری سامان کے ساتھ وہاں پہنچ چکے ہیں۔ اس کے ایما پر بالائے قبر ایک چھوٹا سا شامیانہ لگا دیا گیا تھا ہم نے حاجب شمس الدین پشنگی کو وہ ہم سے پہلے سندھ آیا تھا، قاضی نظام الدین گروانی اور بزرگان شہر میں سے ایک سربراہ اور دہ شخص کو وہاں موجود پایا۔

میرے جانے سے پہلے یہ لوگ وہاں پہنچ چکے تھے اور حاجب نے ان سے بھی سبقت کی تھی، یہ لوگ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قبر کے قریب جا کر بیٹھا۔۔۔ جب لوگ قرآن پڑھ چکے تو اب قاریوں کی باری تھی کہ وہ خوش الحانی اور بلند آہنگی کے ساتھ ختم پڑھنے کا آغاز کریں۔ بعد میں قاضی اٹھا اور اس نے وفات پانے والی لڑکی کے تیس مرتبہ پڑھائیں سلطان کی تعریف میں انشائیہ گئے اشعار پڑھے جب سلطان کا نام آیا تو تمام حاضرین کھڑے ہو گئے۔ قاضی نے دعائے خیر کی۔

حاجب اور اس کے مامور کردہ سوگواران نے، گلاب دان ہاتھوں میں لیے اور لوگوں پر گلاب و بید مشک چھڑکا۔ شربت قند کے گلاسوں میں سب کو مشروب پیش کیا گیا بعد ازاں برگ تنبول نذر کئے۔ ان رسوم کی ادائیگی کے ساتھ میرے اور میرے متعلقین کے لیے گیارہ خلعت مرحمت کیے گئے۔

تعزیت کی ان رسموں کی ادائیگی کے بعد سلطان کے محل کی طرف گئے اور ہم نے سربراہ سلطانی کی طرف رخ کر کے زمین خدمت کو چوما، بعد ازاں مع اپنے احباب کے میں اپنی رہائش گاہ کی طرف واپس لوٹا میں ابھی اپنے گھر پہنچا بھی نہیں تھا کہ مخدومہ جہاں کے مطبخ سے ہمارے لیے کھانا آ گیا اتنا کہ وہ ہم سب نے سیر ہو کر کھایا۔ فقرا و مساکین کو بھی تقسیم کیا گیا اور نان و علوۃ و نیات اتنی وافر مقدار میں آیا تھا کہ اس دن کے بعد بھی کئی روز تک

باقی رہا، یہ سب کام بادشاہ کے حکم سے انجام دیا گیا۔

چند روز کے بعد مخدومہ جہاں کے غلام دولت (ڈولی) لیے ہوئے میری رہائش گاہ پر آئے ڈولا ایک خاص طرح کا کجاوا ہوتا ہے جو عورتوں کے لیے مخصوص ہے مرد بھی اس میں سوار ہوتے ہیں یہ ایک تخت کی طرح ہوتا ہے کہ جو ریشم و مخ کی طرح کی اشیاء سے بنایا جاتا ہے اور ہمارے ہاں راج "بوجہ" کی طرح چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جو ہندوستانی بالنسوں کی ہوتی ہیں ان پر لگادی جاتی ہیں اور آپس میں ان کے سرے باندھ دیے جاتے ہیں۔ ان تخت ہلے رواں کو آٹھ آدمی باری باری کھینچتے ہیں اور ایک وقت میں چار آدمی اسے اٹھانے کے کام میں مشغول ہوتے ہیں اور چار آدمی آرام کرتے ہیں۔

ہندوستان میں یہ تخت رواں دراز گوش کے مشابہ ہوتے ہیں مصر میں جہاں بیشتر آمدورفت انہی کے ذریعہ ہوتی ہے چونکہ غلام بہت ہوتے ہیں اس لیے ایسے تخت ہائے رواں کو یہی غلام اٹھاتے ہیں جن لوگوں کے پاس غلام نہیں ہوتے وہ اس کام کی انجام دہی کے لیے دوسرے لوگوں کو رکھتے ہیں اور اس طرح کا گروہ ہمیشہ بازاروں میں سلطان کے محل کے قریب اور دوسرے محلوں میں موجود رہتا ہے جو معاوضہ لے کر یہ کارگزاری قبول کرتا ہے۔

جو تخت رواں عورتوں سے مخصوص ہے اس کا پردہ ریشم سے تیار ہوتا ہے بہر نوع اس تخت کو بادشاہ کی ماں کے ہاں سے لایا گیا اور میری اس کنیز کو جو اس مرنے والی بچی کی ماں تھی اس میں سوار کیا گیا اور میں نے ایک ترک کنیز کو اس باندی کے ساتھ بطور ہدیہ مادیر سلطان مخدومہ جہاں کی خدمت میں روانہ کیا۔ وہ کنیز مادیر دختر، ایک شب وہاں رہی۔ دوسرا دن جو اس کی بازگشت کا دن تھا، اسے ایک ہزار دینار، طلائی دست بند ایک جڑاؤ گلو بند علاوہ اس کے کپڑے کا ایک ملبوس اور سنہرے کام کا ایک ریشمی خلعت اور چند دوسری طرح کے پزے اسے مرحمت کیے گئے۔

میں نے ان کو اپنے ان ساتھیوں اور ان تاجروں کے درمیان تقسیم کر دیا جن کا میں مفروض تھا، مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جو کچھ میں کرتا ہوں پرچہ نویس اس کی خبر سلطان کو دیتے



رہتے ہیں اس لیے میں اس بات پر مجبور تھا کہ اپنی جان کی امان اور اپنی آبرو کے تحفظ کا خیال رکھوں۔

## وہ عطیات جو بادشاہ کے نجات میں مجھ تک پہنچے

اس اثنا میں سلطان نے یہ فرمان جاری کیا کہ چند قریبے جن کی سالانہ آمدنی پانچ ہزار دینار ہوتی تھی میری تحویل میں دیدیے جائیں۔ وزیر اور صیغہ مالیات کے کارپروازوں نے اس سے متعلق ضروری کارروائی مکمل کی اور میں اس ملکیت پر قابض و متصرف ہوا۔ ان جملہ قریب جات میں سے ایک قریب کا نام ”بادلی“ تھا، دوسرے ”گابسی“ اور اسی طرح ایک ادھا گاؤں پاڑا تھا۔

یہ قریبے میری جائے قیام سے پندرہ سو کوہ کوس کے فاصلے پر واقع تھے اور ان کو صدی ”ہندپت“ کہتے تھے صدی سو قریوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں شہر کے مضافات میں بسے ہوئے قریب جات کو ”صدی“ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر صدی پر ایک چودھری ہوتا ہے بیشتر اس چودھری کے لمبی سفید ڈاٹھڑی ہوتی ہے یہ شخص اہل ہنود سے ہوتا ہے اس کے ماسوا جس افسریالی کی تقرری ”متصرف“ کے نام سے ہوتی ہے وہ دراصل متصدی ہوتا ہے صدی سے وابستہ قریب جات کے محاصل کی جمع آوری اور حساب داری اسی سے متعلق ہوتی ہے۔

اسی زمانے میں اہل ہند کے سربراہ اور وہ لوگوں میں سے ایک کو گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ وزیر نے اس کی بیٹیوں میں سے دس لڑکیوں کو میرے پاس بطور باندیوں کے بھیج دیا میں نے ان میں سے ایک باندی تو اسی شخص کو بخش دی جو انھیں میرے پاس لایا تھا وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ تین خور دسال لڑکیوں کو میرے اپنے آدمیوں نے لے لیا باقی کے بارے میں کوئی فیصلہ میں نہ کر سکا کہ کیا کیا جائے۔

قیدی ہندوستان میں بہت ہی کم قیمت پر خرید و فروخت ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی لڑکیوں کی قیمت اور بھی کم لگتی ہے کہ وہ ادب و تمیز سے بے بہرہ ہوتی ہیں جو کنیزیں تعلیم یافتہ ہوتی ہیں وہ بھی معمولی قیمت کی ہوتی ہیں اس لیے کوئی ان امیروں کو خریدتا نہیں۔

## ملاقات ابن بطوطہ با سلطان ہند

دوسرے روز جمعہ کے دن سلطان کے در و درہلی کے موقع پر ہم دربار سلطانی کے سامنے پہنچے اور وہاں کے مخصوص سقیفوں میں سے ہم تیسرے درجے میں جا کر بیٹھ گئے چونکہ ابھی تک ہماری حاضری و ورود کا اجازت نامہ صادر نہیں ہوا تھا۔ حاجب دربار شمس الدین پوشنگی آیا اور اس کا حکم دیا کہ دبیر ہمارا نام لکھے اور اجازت دی کہ میں اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ حاضری کے لیے آگے آؤں۔ ترتیب یہ مقرر ہوئی کہ آٹھ آدمی میرے ساتھ داخل ہوں اس وقت اشرافیوں سے بھری تھیلیاں ایک عدد دشتت میں رکھی ہوئی وہاں لائی گئیں۔ قاضی القضاة اور دیپروں نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو بلا یا اور ہر آدمی کو ان تھیلیوں میں سے ایک تھیلی اس کے حصے کے طور پر مرحمت کی ان میں سے پانچ ہزار دینار میرے حصے میں آئے۔ یہ رقم ان ایک لاکھ دیناروں میں سے تھی جنہیں سلطان کی ماں محمدہ و ماں جہاں اپنے بیٹے کے موقع پر بطور شکرانہ و بعنوان صدقہ تقسیم کرنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد سلطان ہمیں کھانے پر بلاتا تھا اور ہمارے حال احوال کی پرسش کرتا رہتا تھا اور بڑی خوشنودی کے ساتھ ہم سے گفتگو کرتا تھا۔ ایک دن اس نے کہا تم نے اپنے ورود سے ہمیں مشرف کیا میں اس کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا تمہارے بزرگ میرے باپ کی جگہ پر ہیں اور تمہارے جوان العزیز میرے بھائیوں کا سادہ جہر کہتے ہیں اور اسی طرح تمہارے بچے میرے بچے ہیں۔ میرے تمام ملک میں کوئی شہر دہلی سے بڑا شہر نہیں ہے اور یہ میں تمہیں بخشتا ہوں۔ ہم نے اظہار تشکر کیا اور سلطان کی تعریف کی سلطان نے ہمارے لیے وظائف مقرر کر دیے چنانچہ بارہ ہزار دینار سالانہ میرے لیے مقرر کیا گیا نیز دو قریبے ان تین قریوں پر جو پہلے مجھے عطا کیے گئے تھے اور اضافہ کیے ان میں سے ایک کا نام جو جوہ تھا اور دوسرے کا نام ملک پور۔

ایک دن خداوند زادہ غیاث الدین اور قطب الملک حاکم سندھ ہمارے پاس آئے انہوں نے فرمایا تم میں سے جو آدمی اپنے اندر جس ذمہ داری کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ بتلائے تاکہ اُسے وزارت فتنی گیری یا امارت یا عہدہ یا قضا یا درس و تدریس یا پھر شیخ لقت

سے متعلق اس کے حسبِ خواہش کوئی ذمہ داری اُسے سونپی جائے۔ سب خاموش رہے اس لیے کہ کہنے والے کا مقصد یہ تھا کہ ہم روپیہ جمع کریں اور اپنے وطن کی طرف واپس چلے جائیں۔

امیر بخت سید تاج الدین کے بیٹے نے جس کا ذکر اس سے پہلے اچھا ہے کہا کہ وزارت میری میراث ہے اور دبیری میرا شغل ہے۔ اس کے علاوہ میں اور کوئی اور بات نہیں جانتا عبداللہ فلکی تبریزی کے پسر نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں کیں۔ خداوند زادے نے عربی زبان میں مجھے مخاطب کیا۔ سیدی تم کیا کہتے ہو اہل ہند عربوں کو سید کہتے ہیں، میں نے کہا کہ وزارت یا دبیری میرا کام نہیں ہے۔ ہاں قاضی کے جہدہ کی ذمہ داریاں سنبھالنا اور کارِ مشیخت اختیار کرنا باپ دادا سے میرے خاندان میں چلا آ رہا ہے۔ جہاں تک امیری کا سوال ہے یہ جاننا چاہیے کہ اہل عجم اہل عرب کے سامنے بزرگ و شمشیر اسلام لائے۔ سلطان کو یہ بات اچھی لگی جب یہ اُس کے گوشہ و سماعت تک پہنچی۔

اس وقت سلطان قصر ہزار ستون میں خاصہ تناول کر رہا تھا۔ اس نے ایک آدمی ہمارے پاس بھیجا اور ہم وہاں گئے اور کھانے میں اُس کے ساتھ شریک ہوئے بعد ازاں ہزار ستون سے ہم لوگ باہر آئے۔ میرے ساتھی وہاں بیٹھ گئے، لیکن میں نے انتظار نہیں کیا اور اپنے گھر واپس آ گیا۔ میرے ایک پھوڑا نکل رہا تھا جسکی وجہ سے میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ سلطان نے مجھے دو مرتبہ بلایا تھا اور میرے ساتھیوں نے یہ بات اُس تک پہنچادی تھی کہ میں چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔ بعد نماز عصر میں محل میں آیا اور مغرب و عشاء کی نماز وہاں ادا کی اس وقت حاجبِ دیار آیا اور یہ کہا کہ ہم اندر آسکتے ہیں۔ خداوند زادہ فیاء الدین نے کہ وہ سلطان کے رشتے کے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور سلطان نے اُسے ”امیر داد“ بنایا تھا۔ جو ایک اونچا عہدہ ہے۔ امیر داد وہ شخص ہوتا ہے جو قاضی القضاة کی مجلس میں حاضر ہو کر وہ شکایات جو امراء اور ارکانِ دولت سے پہنچتی ہیں ان کو پیش کرتا ہے۔ امیر داد سے متعلق کام وہی ہوتے ہیں جو مصر و شام اور دوسرے بلادِ اسلامیہ میں اس عہدے سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا مقصد مختلف فریادوں اور شکایتوں کو پہنچانا ہوتا ہے۔

سلطان نے اپنے چچاس ہزار دینار نقد اور چچاس ہزار دینار کی قیمت کے بقدر مختلف جنس کی اشیاء ایک جامعہ تحریر کے ساتھ جس پر سونے کا کام بنایا گیا تھا اور جسے صورتِ مشیر کہتے تھے۔ اس کے لیے حق خدمت کے طور پر متعین کیا تھا۔ اس ملبوس کے آگے اور پیچھے ایک جانور کی صورت نقش تھی اور اس کے اندر سنہرے تاروں کی نقاشی کے ساتھ اُس قیمت کو اُس میں لکھ دیا گیا تھا جو اُس ملبوس کی تیاری میں صرف ہوئی تھی۔ سلطان نے اول درجے کا ایک گھوڑا بھی اُسے بخشا تھا گھوڑوں کے ہندوستان میں چار درجات مقرر کیے گئے ہیں اور ان کی زمین کو زمین سازی کے اُس اصول کے مطابق جو مصریوں میں رائج ہے بنایا جاتا ہے۔ ان میں سے دو قسمیں وہ ہیں جن کا ساز چاندی اور سونے کا ہوتا ہے۔

ضیاء الدین کے بعد امیر تخت وارد ہوا۔ سلطان نے حکم دیا کہ وہ وزیر کے ساتھ تخت پر بیٹھے اور مختلف افسرانِ دیوانی کی طرف سے جو حسابات آتے ہیں۔ ان کی عیار گیری کا عہدہ قبول کرے چالیس ہزار دینار سالانہ بہ سلسلہ جنس اور چالیس ہزار دینار نقد اُس کے لیے معین کیے اور اُسے ”ثروت الملک“ کا خطاب دیا نیز ایک سنہری ساز کا گھوڑا اُسے عنایت ہوا اور اُسی نوع کا ایک خلعت اُسے مرحمت فرمایا جس کا ذکر اس سے پیشتر کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد عبداللہ تبریزی وارد ہوا۔ جسے سلطان نے خط و کتابت یا مراسلات کی وصولیابی یا روانگی کے لیے مامور کیا اور چوبیس ہزار دینار نقد اور چالیس ہزار دینار کے برابر جنس کا دیا جانا اس کے خرچ سالانہ کے طور پر معین کیا۔ اُس کو بھی ایک خلعت اور ایک طلائی ساز سے آراستہ ایک گھوڑا عنایت ہوا۔

اُس وقت میں حاضر ہوا۔ سلطان اپنے قصر کی بالائی منزل جہاں نماز میں تخت پر تکیہ رکھنے بیٹھا تھا۔ خواجہ جہاں اور ملک کبیر اس کے جلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ ملک کبیر نے کہا زمینِ خدمت کو بوسہ دو اور کورنیش بجالو، کہ سلطان عالم نے تمہیں دہلی کا قاضی بنایا اور سالانہ بارہ ہزار دینار نقد اور بارہ ہزار دینار بصورت جنس تمہارے لیے معین فرمائے ہیں۔ نقد روپیہ تم کل خزانہ شاہی سے لے سکتے ہو اسی کے ساتھ تمہیں ایک اسپ زمین اور کام کے ساتھ اور ایک خلعت جس کو محرابین کہا جاتا ہے اور جس کے سینے اور پشت پر مہراب کی سی شکل بنی

ہوتی ہے جو اس کی بناوٹ میں شامل ہوتی ہے۔

میں نے زمینِ خدمت کو چوما اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے سلطان کے سامنے لے گیا۔ سلطان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا یہ خیال مت کرنا کہ دہلی کا عہدہ قضا کوئی چھوٹا کام ہے ہماری نظر میں یہ کام نہایت اہم ہے میں اُس کی بات کو سمجھ رہا تھا لیکن میں یہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس وقت اس کو جواب دوں۔ سلطان کو عربی آتی تھی لیکن وہ اس میں بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ بہر صورت میں نے کہا کہ میں امام مالک کے مسلک کا تابع ہوں اور اہل دہلی حنفی مذہب رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں یہاں کی زبان بھی نہیں جانتا فرمایا میں نے بہاؤ الدین ملتانی اور کمال الدین بجنوری کو تبری نیابت کے لیے مامور کر دیا کہ وہ تیرے مشیر کے طور پر رہیں اور تیرا کام یہ ہوگا کہ تو تمام اسناد کو منظم و مرتب کرے اور ان پر مہر لگائے۔ سلطان نے بڑی مہربانی سے کہا کہ تو ہمارے لیے ہمارے بیٹے کی جگہ ہے میں نے کہا کہ میں سلطان کا فرماں بردار ہوں اور اُس کی چاکری میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ اس کے بعد سلطان نے زبانِ عربی میں یہ جواب دیا کہ نہیں تم تو ہمارے آقا اور مخدوم ہو یہ فقرہ سلطان نے میری دلہی اور بطور تو اضع فرمایا تھا۔

اُس کے بعد سلطان نے امیر بخت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اس کے اخراجات زیادہ ہیں۔ اگر اس کے لیے۔۔۔ جو حقوق معین کیے گئے ہیں کافی نہ ہوں یہ بالکل ممکن ہے اگر وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کر جائے۔ میں ایک خانقاہ کا انتظام بھی اُس کے سپرد کروں گا کہ وہ وہاں کے فقرا اور صلحا کی خبر گیری اور نگہداشت کرتا رہے۔ سلطان نے یہ بھی فرمایا کہ اس بات کو عربی زبان میں امیر بخت مجھ تک پہنچائے۔ سلطان کا خیال تھا کہ امیر بخت کو عربی بخوبی آتی ہے جبکہ یہ صورت نہیں تھی۔ اور جب اُس کے مطلب کو دریافت کیا تو فارسی میں اُس سے کہا: ”بروی۔۔۔۔۔ جانشی وان حکایت بر او بگوئی و تفہیم کنی تا فردا انشاء اللہ پیش من بیانی و جواب از بگوئی“

ابن بطوطہ کی عربی عبارت میں یہ فارسی جملے آئے ہیں جن کا مطلب کچھ اس طرح ہے: ”تم جاؤ اور ایک جگہ آرام کرو اور یہ حکایت اس سے کہو اور اُسے سمجھاؤ تاکہ کل انشاء اللہ جب تم میرے

پاس آؤ تو اس کا جواب مجھ تک پہنچاؤ۔“

اس کے بعد ہم نے دربار سے مراجعت کی۔ اس وقت ایک پہر رات جا چکی تھی اور نوبت سبج رہی تھی۔ اس ملک کا قاعدہ یہ ہے کہ جب نوبت سبج جائے تو پھر کوئی شخص اپنے گھر سے باہر نہ نکلے۔ اسی وجہ سے ہم وزیر کے منتظر رہے تاکہ وہ بھی باہر آجائے اور ہم اس کے ہمراہ جائیں۔ دہلی کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ ہم سراپور خان کے کوچہ میں سید ابوالحسن عراقی کے گھر پہنچے اور وہاں ہم نے رات بسر کی۔ یہ آدمی ایک دولت مند شخص تھا اور سلطان کے لیے عراق اور خراسان سے عمدہ زرہیں۔ اسلحہ اور پوشاکیں نیز دوسرا سامان منگواتا تھا اور تجارت کرتا تھا۔

گلے دن ہم لوگوں کو پھر بلا گیا اور ہمیں گھوڑے، خلعت اور دوسرا مال و اسباب عنایت کیا گیا۔ دیناروں سے بھری تھیلیوں کو ہم نے کندھوں پر اٹھایا اور سلطان کے سامنے گئے اور اسے پیش کیا۔ جب گھوڑوں کو سامنے لایا گیا تو ہم نے ان کے سموں کے نشانات کو بوسہ دیا۔ اس وقت ان کی لگام اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر ہم سرانے سلطانی کے دروازے تک انھیں لے گئے وہاں سے سوار ہوئے اور واپس لوٹے یہ شاہی دربار کی رسم ہے جو اسی طرح ادا کی جاتی ہے۔ سلطان نے میرے ساتھیوں کو دس ہزار دینار نقد اور دس خلعت دیے۔ ایسا کوئی سلوک دوسرے لوگوں کے آدمیوں کے ساتھ نہیں ہوا۔ بظاہر میرے آدمی زیادہ گیرائی کے پہلو اپنے اندر رکھتے تھے اور یہی سلطان کے لیے دلچسپی کا باعث ہوا۔ انھوں نے ان عطیوں کو لینے کے بعد زمین خدمت کو چوما اور سلطان کی تعریف کی۔

## دوسرا عطیہ جو مجھے ملا

قاضی دہلی کے منصب کو قبول کرنے کے بعد میں ایک دن اس محل کے سامنے جو مقدمات لانے والوں کے لیے مخصوص تھا، ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا اور مولانا ناصر الدین ترمزی کے ایک دانشمند آدمی تھا اور بہت اچھا و عظیم کہتا تھا۔ میرے برابر کی نشست پر تھا۔ ایک حاجب ہمارے پاس آیا اور مولانا کو بلا یا وہ سلطان کے سامنے گئے اور سلطان نے ایک خلعت اور اسی

کے ساتھ قرآن پاک کی ایک جلد جو سنہرے کام سے آراستہ تھی ان کو عنایت کی۔ اس وقت حاجبوں میں سے ایک اور شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ مجھے کوئی چیز دے تاکہ میں ایک ”تحریر خورد“ تیرے لیے حاصل کروں کہ سلطانِ عالم نے تجھے بارہ ہزار دینار مرحمت فرمائے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ وہ جیلہ سازی کر رہا ہے اور اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ لیکن جب اس نے اپنی بات کو باصراہ کہا تو میرے آدمیوں میں سے ایک شخص کہنے لگا کہ میں اسے کچھ دیدیتا ہوں اور اس میں سے دو تین دینار نکال کر لے دے۔ حاجب نے اس چھوٹی تحریر خط خورد کو باہر نکالا۔

خط خورد وہ مختصر تحریر ہے جس کا یہ مضمون ہوتا ہے۔ سلطانِ عالم نے حکم دیا ہے کہ خزانہ موقورہ سے فلاں شخص کو اتنے دینار یا تنکے دے دیئے جائیں۔ اس تحریر کو امراء میں سے تین آدمی اپنے دستخط اور مہر سے آراستہ کرتے ہیں۔ خانِ اعظم فطوٰخاں جو سلطان کا معلم رہ چکے ہیں نیز خریطہ دار اور امیر دولت دار ان تین امراء میں شامل ہوتے ہیں۔ وہاں سے پھر اس کو دیوان وزارت میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس دیوان وزارت کے دبیر اس تحریر کی روشنی میں اپنے یہاں اندراج کرتے ہیں۔ اس کے بعد اسے دیوان اشراف بھیجا جاتا ہے کہ وہاں بھی اس پر مہر ثبت کی جاتی ہے۔ آخر میں وہ دیوان نظر پہنچتا ہے اور یہاں سے پروانہ یعنی وزیر کی طرف سے اجازت نامہ خزینہ دار کو بھیجا جاتا ہے کہ وہ اتنا روپیہ متعلق شخص کو دیدے۔ دفتر کا خزینہ دار بھی اسے اپنی یادداشتوں میں نقل کرتا ہے اور روزانہ ایسے احکامات کا خلاصہ شامل دفتر کرتا ہے۔ اس سے متعلق دستاویز وزیر کو بھیجتا ہے۔ وزیر اس کے لیے پھر حکم صادر کرتا ہے کہ آیا رقم کی تحویل فوراً کی جائے یا پھر اس میں توقف کیا جائے۔

بہر حال یہ حوالے قابلِ پرداخت ہیں یا ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ یہ بارہ ہزار روپیہ مجھے چھ ماہ توقف کے بعد ملا اور آخر کار میں نے ایک دوسرے شخص سے مدد لی میں اس کا حال آگے چل کر بیان کروں گا۔ یہاں کا قاعدہ کچھ ایسا ہے کہ اس طرح کے حوالوں میں سے دسواں حصہ کم کر دیا جاتا ہے اور تب اس کی تفویض عمل میں آتی ہے مثلاً اگر سو ہزار دینار ہوں تو اس میں سے نوے ہزار دینار ملتے ہیں اور اسی

طرح اگر دس ہزار ہوں تو نو ہزار دینا دے دیئے جلتے ہیں جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ میں نے تاجروں سے ایک رقم بطور قرض لی تھی کہ اُسے سفر کے اخراجات اور سلطان کے لیے تحائف کی خریداری میں صرف کر سکوں۔ یہاں قیام کے زمانے میں بھی آخر مجھے اپنے فروری اخراجات کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی۔ جو تجارت اپنے وطن کی طرف واپسی کے منصوبے بنا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے مطالبات کی وصولی کے لیے مجھ پر بہت دباؤ دیا۔ میں نے اس سلسلے میں سلطان کی بارگاہ میں ایک قصیدہ پیش کیا اور اُس میں قدرِ تفصیل سے اپنا حال بھی لکھا۔ ”قصیدہ ابن بطوطہ در مدح سلطان ہند“

## سلطان کی مدح میں لکھا جانے والا ابن بطوطہ کا قصیدہ

ترجمہ:- اے تو امیر المؤمنین ہے اور خداوند بزرگ و برتر نے تجھے بڑا درجہ دیا ہے میں بہت جدوجہد کرتا اور دشت و کوہ سے گزرتا ہوا تیری بارگاہ تک پہنچا ہوں۔ یہ تیرا نشیمن جلال جس کی طرف میں اُفتان و خزان آیا ہوں یعنی سلطان کی بارگاہ امیر گاہ اور جائے پناہ ہے جس کی زیارت کرنا بھی ہزار سعادتوں کا ایک نظر میں حاصل کرنا ہے۔ اگر تیری جائے گاہ خوشی سے بلند ہو تو ہر طرح اس کے لایق ہے کہ تو وہاں بھی سب کا امام اور پیشوا ہو کہ تیری بزرگی و شرف اسی کا مفتضحی ہے تو وہ امام فرزانہ اور پیشوا ہے یمان ہے کہ تیری گفتگو تیری طبیعت کے تقلص کے زیر اثر تیرے نیک عمل سے ہم اہنگ رہتی ہے۔ میں ایک ضرورت سے تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں اور تیرے فیض و بخشش سے یہ امیر رکھتا ہوں کہ میری یہ آرزو پوری ہوگی جو تیری بخششوں کے سامنے کوئی درجہ ہی نہیں رکھتی میں اپنی حاجت کو تیرے سامنے بیان کروں اس میں مجھے شرم آتی ہے اور تیری عظمت و جلال کا تصور میرے لبِ اظہار پر مہر لگا دیتا ہے۔ اے میرے آقا تو جلدی کر کہ جو شخص تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہے قرض خواہوں نے اُسے فشار میں مبتلا کر رکھا ہے۔

جب یہ قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے عرضداشت کا ایک سرا اپنے زانو پر رکھ لیا اور اُس کے ایک گوشہ کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دوسرے گوشہ کو میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا جو بھی شعر میں پڑھتا تھا قافی القفاۃ کو سنا تا تھا اور یہ خواہش



کرتا تھا کہ اُس کے معنی سلطانِ عالم سے بیان کرے قاضی القضاة کی زبان سے اُس کے معنی سن کر بادشاہ اُسے پسند کرتا تھا۔ اس لیے کہ کشور ہندوستان میں عربی زبان میں کی جانے والی شاعری کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ جب میں اُن شعروں تک پہنچا جو اوپر پیش کیے گئے ہیں۔ شاہ نے فرمایا میں نے تمہیں مرحمت کیا۔ حاجبوں نے اس وقت وہ میرے ہاتھ سے لے لیا تاکہ وہ مجھے میری جائے گاہ تک واپس پہنچا دیں

میں دربار کی رسم کے مطابق زمیں خدمت کو بوردیا سلطان نے فرمایا اسے مہلت دو تاکہ پورا قصیدہ پڑھ کر سنائے میں نے اس کا ایک کونہ اپنے ہاتھ میں لیا اور کورنیش بجالایا۔ سب نے مجھے مبارک باد دی۔ میں نے تھوڑا وقت کیا۔ بعد ازاں ایک التماس نامہ (جسے عرفاً اشت کہا جاتا ہے) لکھ کر قطب الملک کو دیا۔۔ وہ اُس نے سلطان کی نظر گاہ میں پیش کیا۔ فرمایا کہ جاؤ اُسے خواجہ جہاں کو دید و اور کہو کہ فلاں شخص کا قرضہ چکا دے وہ وہاں گیا اور سلطان کا فرمان اُس تک پہنچا یا۔ خواجہ جہاں نے بھی اُس کو قبول کیا۔ اس اثناء میں سلطان نے اس کو یہ حکم دے دیا تھا کہ وہ دولت آباد کی طرف سفر اختیار کرے اور خود سلطان شکار میں نکل گیا میرے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ تاخیر کا سبب یہ تھا کہ میں نے طلب گاروں سے یہ بات کہہ دی تھی جب میں سلطان کے محل میں جاؤں اس ملک کی رسم کے مطابق مجھ کو ”درومی“ بنا لو۔

اس صورت میں سلطان اُن کے قرضے کی رقم کو ادا کر دے گا۔ رسم یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے کسی چیز کا طلبگار ہوتا ہے اور اُس کو وصول نہیں کر سکتا تو وہ سلطان کے دروازے تک جاتا ہے اور جب وہ شخص جسے روپیہ دینا ہوتا ہے اندر داخل ہونا چاہتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ میں سلطان کے درومی کو اُس کے دروازے تک نہیں پہنچنے دوں گا جب تک کہ میرا قرضہ ادا نہ کر دیا جائے اور اس وقت تک قرض خواہ اپنے دین دار کا گریبان پکڑے رہتا ہے اور کہتا ہے جب تک تم میرا قرض ادا نہیں کرو گے میں تمہارا گریبان نہیں چھوڑوں گا۔ اب یا تو وہ شخص اُس کا قرض ادا کرتا ہے یا کوئی دوسرا آدمی اُس کو اپنے ذمہ لیتا ہے ورنہ اُس کی رہائی نہیں ہوتی۔

جس دن کے سلطان اپنے والد کے مزار کی زیارت کے لیے گیا ہوا تھا اور وہاں اُس نے

ایک محل میں قیام کیا تھا۔ میں نے اپنے قرضداروں سے یہ بات کہی کہ یہ مناسب موقع ہے کہ تم دروازہ سلطانی کے قریب رہو اور جب میں اندر داخل ہونا چاہوں تو یہ کہو اسے بادشاہ کے ”دروہی“ جب تک تم ہمارے واجباتِ قرض ادا نہ کرو گے ہم تمہیں نہ چھوڑیں گے کہ تم قرض سلطانی میں داخل ہو۔ اس وقت میں قرض خواہ جو اپنے قرض دار کا گریبان پکڑا ہوا ہے۔ جب تک کہ وہ قرض کی رقم وصول نہیں کرتا یا پھر کوئی دوسرا شخص اس کا مددگار یا ذمہ دار نہیں بنتا وہ اس شخص کو نہیں چھوڑتا جس پر قرض واجب الادا ہوتا ہے۔

جو دبیر کے قرض سلطانی کے دروازے پر تھے۔ انہوں نے جا کر سلطان کو ہمارے قضیہ کی اطلاع دی۔ شمس الدین کے مرد بزرگ اور علم فقہہ کا ماہر تھا اور بادشاہ کی طرف سے وہ شکایات کی تحقیق پر مامور تھا باہر آیا اُس نے اُن لوگوں سے کہا کہ آخر تم اس شخص کو اندر کیوں نہیں آنے دیتے جواب دیا کہ یہ ہمارا مقروض ہے۔ شمس الدین بادشاہ کے پاس گیا اور ہمارے مابین جو نزاع تھا اس کی اطلاع دی سلطان نے فرمایا یہ معلوم کرو کہ اُس پر کتنا قرض ہے۔ وہ واپس آیا تو اسے بتلایا گیا کہ پچیس ہزار دینار اس پر وہ دوبارہ ہماری طرف آیا اور کہا کہ سلطان عالم یہ فرماتے ہیں کہ تمہارا روپیہ میرے ذمہ ہے دوبارہ تم اُس سے طلب نہ کرنا۔

بعد ازاں سلطان نے حکم دیا کہ عماد الدین سمنانی اور غیاث الدین خداوندزادہ قمر ہزار ستون میں ٹھہریں اور مجھ پر جو قرض ہے اُس سے متعلق ضروری باتوں کی مناسب تحقیق کریں۔ انہوں نے اسنادِ درستی اور صحت کے بارے میں تحقیق کر کے اُس کی تصدیق کی اور سلطان کو اطلاع دی سلطان ہنسنا اور اُس نے پُرمزہ انداز میں کہا کہ وہ قاضی ہے اور اپنے فن کو اُس نے اسناد کی تنظیم میں خوبی سے استعمال کیا ہے اس کے بعد خداوندزادہ کو اجازت دی کہ یہ رقم خزانہ شاہی سے لے کر میرے سپرد کر دے۔ خداوندزادہ نے رشوت کی امید پر حوالہ لکھنے میں تاخیر کی۔ میں نے دو سوٹکے (سکے یا سنگے) اسے بھیج دیئے۔ لیکن اس نے اسے قبول نہیں کیا اور اپنے نوکروں سے کہا کہ جا کر اُس سے کہہ دو کہ وہ پانچ سوٹکے دے۔ میں نے ایسا نہیں کیا اور اپنا واقعہ عمید الملک پسر عماد الدین سمنانی سے بیان کیا۔ اس نے اس واقعہ کو وزیر تک پہنچایا۔

وزیر کی خداوندزادہ کے ساتھ کچھ ٹکڑے رنجی (اختلاف کی صورت) چل رہی تھی۔ اس نے واقعہ

کو کچھ اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ سلطان ناراض ہو گیا اور فرمایا کہ اسے قید خانے میں بند کر دو۔ آخر فلاں شخص کیوں اتنا روپیہ خداوند زادہ کو سپرد کرے۔ کیا وہ یہ بات نہیں جانتا کہ اگر میں نہ دوں تو خداوند زادہ کسی کو کچھ دے سکتا ہے؟ یا میں دے دوں تو وہ اُس کی مخالفت کر سکتا ہے۔ میرے حوالے کے معاملے میں تاخیر ہو جانے کی کہانی یہ تھی۔

## بشکارِ فتنِ سلطان

جب سلطان تشکار کے خیال سے باہر آیا۔ میں نے بھی بے تامل اس کی ملازمت اختیار کی اور اُس کے ساتھ روانہ ہوا اور اس روانگی کے سلسلے میں جن چیزوں کی ضرورت تھی ان کو نہیا کیا۔ میں نے ایک چھوٹا سا خیمہ خریدا کہ جسے اس ملک میں بڑے لوگوں کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ بادشاہ کے سرانچے کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اور دوسروں کے خیمے اسی نسبت سے سفید ہوتے ہیں اور ان پر نیلے رنگ سے کچھ نقش بنائے جاتے ہیں اور شیوانی خریدی یہ ایک ایسے خیمے سے عبارت ہے جو سرانچے کے اندر سائبان کے طور پر لگایا جاتا ہے۔ اسے دو ستونوں پر ٹنگا دیا جاتا ہے اور اُس کو دو ملازم اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ ان ملازمین کو ”یکوانی“ کہتے ہیں۔

قاعدہ کچھ ایسا ہے کہ ہر مسافر ان لوگوں کو کرایہ پر حاصل کرتا ہے جو یکوانی کہلاتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ اس خشک چارہ کے لیے ملازم رکھے جاتے ہیں جو ساتھ چلنے والے چوپایوں کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی گھوڑوں اور خچروں وغیرہ کے لیے۔ ہندوستان میں چوپایوں کو ہر گھانس نہیں کہلاتے اسی لیے خشک گھانس ساتھ رہتا ہے۔ اسی طرح ہر مسافر کچھ کہار اپنے ساتھ رکھتا ہے جو اس کے باورچی خانے کے سامان کو لے کر چلتے ہیں۔ کچھ کہار اُس کے تختہ رواں کو کاندھے پر اٹھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ ڈیرے اور تمبو وغیرہ کو نصب کرنے کے لیے روانگی کے وقت پھران کو اکھاڑ کر طے کرنے اور سوار یوں پر لادنے کے لیے ہوتے ہیں یہ سامان گدھوں، خچروں اور اونٹوں پر لاداجاتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ اس مقصد سے اجرت پر رکھے جاتے ہیں کہ وہ ڈیرے میں فرش بچھائیں۔ کچھ سپاہیوں کی طرح پیدل ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور

راتوں کو مشعل جلائے رکھتے ہیں میں نے بھی یہ سب سامان فراہم کیا اور اس کے خرچ اخراجات کی ہمت کی۔ چنانچہ جس روز سے سلطان نے شکار گاہ کی طرف حرکت کی میں بھی اسی دن عازم سفر ہوا۔ کچھ لوگ دو تین دن کے بعد روانہ ہوئے۔۔۔۔۔ غروب آفتاب کے وقت سلطان ہاتھی پر سوار ہوا اور اس نے ادھر ادھر کی سیر کی۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ وہ دیکھے کہ کون لوگ اُس کے ساتھ آ رہے ہیں اور کون تاخیر کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اُس کے بعد اس نے شاہی خیمے سے باہر ایک کرسی پر نشست اختیار کی۔ میں سلطان کے سامنے گیا اور سلام کیا اور اپنی جگہ پر بائیں ہاتھ کی سمت کھڑا ہو گیا۔

سلطان نے ملک مقبول کو (جو سرجامہ دار کہلاتا تھا) اور اس پر مامور تھا کہ جب بادشاہ بیٹھا ہو تو وہ اُس کے پیچھے کھڑا ہو اور پور چھل جھلتا رہے، میرے پاس بھیجا اور اجازت دی کہ میں بیٹھ جاؤں۔ اُس دن بجز میرے کسی اور شخص کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ اس کے بعد ایک ہاتھی لایا گیا اور اُس کی مکر کے سہارے سے ایک سیڑھی لگادی گئی تاکہ سلطان ہاتھی پر سوار ہو جائے اُس کے سر پر چتر شاہی سایہ کیے ہوئے تھا۔ سلطان نے اپنے خواص کے ساتھ کچھ دیر ادھر ادھر سیاحت کی اور اُس کے بعد سرائچ، سلطانی کی طرف چلا گیا۔

یہاں معمول کچھ اس طور پر ہے کہ جب سلطان سوار ہوتا ہے تو امیروں میں سے ہر ایک اپنی فوج اپنے نشانات اپنے تیل و نقارے اور اپنی شہنائیوں اور تفسیروں کے ساتھ سلطان کے ساتھ چلتا ہے۔ حاجب، مطرب اور تیل بجانے والے (وہ لوگ جن کے پاس بڑے بڑے ڈھول ہوتے ہیں) اور اسی نسبت سے تلشے والے کہ اُن کے گلوں میں چھوٹے چھوٹے ڈھول آویزاں ہوتے ہیں اور شہنائی نواز آگے آگے چلتے ہیں نیز چندرہ آدمی داہنی طرف ہوتے ہیں اور چندرہ بائیں طرف ان لوگوں میں قاضی القضاہ، وزیر بعض امراء اور کچھ بادشاہ کے عزیز ہوتے ہیں۔ میں بھی سلطان کے داہنی طرف چل رہا تھا۔ پیادے اور رہنما کچھ پیچھے رواں تھے۔ شاہی نشانیوں کو جو حریر و دیباے تیار ہوتے ہیں اور ان ہی ساتھ ماتھ نقارے اور تیل اونٹوں پر آراستہ کر کے لاتے ہیں۔ یہ کچھ چلتے ہیں۔ اُن کے عقب میں بادشاہ کے غلام، خواص، امراء اور دوسرے ہمسفر اسی ترتیب سے حرکت کرتے ہیں۔ جہاں سلطان پسند کرتا ہے۔ وہاں وہ قیام کرتے ہیں اور جب سلطان کسی دریا کے کنارے یا درختوں کے

سائے میں بیٹھ جاتا ہے تو بکرے، مرغ اور ہر طرح کے شکار کا گوشت اُس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور شہزادے بھی ایک ایک سیخ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ آگ سلگانی جاتی ہے اس پر گوشت کے ٹکڑوں کو کباب کر کے کھاتے ہیں۔ سلطان کے لیے ایک چھوٹا سا راجہ نصب کیا جاتا ہے وہ وہاں بیٹھتا ہے اور اُس کے خواص اُس سے باہر رہتے ہیں جب وہ سلطان کے لیے کھانا لایا جاتا ہے تو وہ جس کو چاہتا ہے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دیتا ہے۔

ایک روز سلطان جب اپنے سر راجے میں بیٹھا ہوا تھا اُس نے پوچھا کہ وہ باہر کا آدمی اب کہاں ہے۔ ناصر الدین مظاہر نے دیکھ کر بادشاہ کے ندرتوں میں سے تھا کہا کہ فلاں شخص باہر ہے اور اس کے اوقات بہت تلخ گذر رہے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا کیوں؟ اس نے کہا کہ وہ قرضدار ہے اور اُس کے قرض خواہ اُسے پریشان کیے ہوئے ہیں۔ سلطان عالم نے وزیر سے یہ فرما دیا تھا کہ اُس کے قرض کی رقم ادا کر دے لیکن وہ اس عمل کی انجام دہی سے پہلے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اب یہی بہتر ہے کہ بادشاہ حکم دے کہ اُس کے طلبکار وزیر کی بازگشت تک انتظار کریں یا پھر اس کے مطالبات ادا کر دیے جائیں۔ ملک دولت شاہ نے کہ سلطان اُسے اپنا چچا کہتا تھا سامنے آکر کہا سلطان عالم وہ ہر روز عربی زبان میں اپنے مطالبے کی بات کہتا ہے اور میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

تب سلطان نے ناصر الدین کی طرف رخ کرتے ہوئے پوچھا کہ آیا وہ کیا چاہتا ہے۔ دولت شاہ کے بیان کو سننے کے بعد بادشاہ کا مقصد یہ تھا کہ ناصر الدین دوبارہ اپنا مطلب بیان کرے۔ اس نے جواب دیا کہ اس کا موضوع تو قرضداری ہے کہ جس کی مصیبت سے وہ گزر رہا ہے۔ سلطان نے کہا کہ اے میرے چچا جیسے ہی ہم پایہ تخت کی طرف واپس لوٹیں تم شاہی خزانے سے اس کا یہ روپیہ ادا کر دو۔ خداوند زادہ اس وقت وہاں موجود تھا اس نے کہا کہ وہ شخص خرچ بہت رکھتا ہے اور میں نے اُسے اپنی ولایت میں سلطان ترمش ترین کے یہاں دیکھا تھا۔

اس گفتگو کے بعد سلطان نے مجھے کھانے میں شرکت کے لیے سر راجے میں بلوایا۔ مجھے اس واقعہ کی خبر نہ تھی جب میں باہر آیا تو ناصر الدین نے مجھ سے کہا کہ ملک دولت شاہ کا تمہیں شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ دولت شاہ نے پھر یہ کہا کہ خداوند زادہ کا شکریہ ادا کرو۔ ایک دن کہ سلطان اپنے

لاؤ لشکر کے ساتھ شکار میں جا رہا تھا میں اُس کے پیچھے چل رہا تھا اور دائیں جانب تھا میرے اصحاب بھی سلطانی لشکر کے عقب میں رواں تھے۔ میں نے سرانچے کے قریب ایک چادر تان رکھی تھی میرے ساتھی چادر کے پاس ٹھہر گئے اور سلطان کو سلام کیا۔ سلطان نے عماد الملک اور دولت شاہ کو اس بات پر مامور کیا کہ یہ معلوم کریں کہ یہ چادریں اور یہ سرانچے کس کا ہے انہوں نے جواب میں کہا کہ فلاں شخص کا ہے سلطان ہنسنے لگا اور اگلے دن اجازت دی کہ میں ناصر الدین مظاہر قاضی معر کے بیٹے اور ملک یزید کے ساتھ شہر کی طرف مراجعت کروں اور ہمیں خلعت بخشیں۔

## سلطان کو پیش کیے جانے والے اونٹ کی داستان

ان ہی ایام میں ایک روز سلطان نے مجھ سے پوچھا کہ آیا الملک الناصر شتر سوار ہوتا ہے میں نے کہا کہ ہاں حج کے ایام میں مصر سے لے کر مکہ تک کا فاصلہ دس روز میں اونٹ پر سوار ہو کر طے کرتا ہے لیکن وہ اونٹ یہاں پیدا ہونے والے اونٹوں کے مقابلے میں بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں اور اُس نوع کا ایک اونٹ میرے پاس بھی تھا جب میں پایہ تخت میں واپس لوٹا۔ میں نے مصری عربوں میں سے ایک کو بلایا اور اُسے حکم دیا کہ کالے رنگ کا جو محل اونٹ پر باندھے رہتے ہیں وہ میرے لیے بنا دے۔ اور اُسے ایک عمار کو دیا کہ اُس جیسا ایک محل مجھے بنا دے اُسے پارچے سے ڈھک دیا اور اسی کے مطابق ایک رکاب بنائی اور ایک عمدہ سی عبا اس اونٹ پر ڈالی اور ریشمی مہار اس کے لیے مہیا کی۔

میرے پاس ایک بمبئی ملازم تھا جو بہت اچھی مٹھائیاں بناتا تھا۔ اس سے میں نے کھجوریں تیار کرائیں۔ میں نے اس خیرینی کے ساتھ اس شتر کو سلطان کے پاس بھیجا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ اسے دولت شاہ کے وسیلے سے سلطان تک پہنچا دو دو اونٹ اور ایک گھوڑا خود دولت شاہ کے لیے بطور پیش کش روانہ کیے۔ چونکہ میرا پیش کیا ہوا اونٹ پہلے دولت شاہ کے پاس پہنچا تھا اس لیے دولت شاہ سلطان کے پاس گیا اور وہاں سلطان عالم میں نے آج ایک عجیب و غریب چیز دیکھی ہے۔ سلطان نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا اس نے جواب دیا کہ فلاں شخص نے ایک ایسا اونٹ بھیجا ہے جس پر زین کسی ہوئی ہے۔ شتر کو شاہی محل میں پہنچایا گیا اور سلطان اسے دیکھ کر

بہت خوش ہوا اور میرے مامیہ کیے ہوئے آدمی سے کہا کہ وہ شتر سوار ہو اور سلطان کے جلو میں چلے۔ سلطان نے دوسو دینار ایک خلعت کے ساتھ اُسے بخشے۔ جب مجھے اس صورت حال کی اطلاع ہوئی تو میں بہت خوش وقت ہوا۔

## شیرینی کے ساتھ دو اور اونٹوں کی مزید پیش کش

اس واقعہ کے بعد پھر میں نے حکم دیا کہ دو عدد پھر دوسری زمینیں تیار کریں اور ان کے سامنے اور پیچھے کے حصوں کو چاندی اور سونے کے پتروں سے آراستہ کریں۔ ان زمینوں یا محافوں پر خوبصورت کپڑا چڑھا یا گیا اسی کے ساتھ سنہری روپیلی تاروں اور ریشم سے رسیاں بنائی گئیں۔ اسی کے ساتھ دو جھولیں ریشم و مخواب کے کپڑوں سے تیار کی گئیں اور اونٹوں کے پیروں میں سونے چاندی کی گھنٹیاں بطور خلخال باندھی گئیں۔ گیارہ طبق مٹھائی کے جن پر ریشمی خوان پوش ڈھکے ہوئے تھے میں نے فراہم کیے۔ دوسرے روز کہ سلطان شکار گاہ سے واپس آ رہا تھا اور مجلس عوام میں رونق افروز تھا۔ اس کی خدمت میں پیش کیا سلطان نے حکم دیا کہ اونٹوں کو اس کے جلو میں دوڑایا جائے۔ ان میں سے ایک کے پیر میں خلخال ٹوٹ گیا اس کے بعد اس نے ان سینوں پر نظر ڈالی۔ اور پوچھا ان طبقوں میں کیا ہے میں نے کہا کہ مٹھائی ہے پھر ناصر الدین ترمیزی کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ جو مٹھائی فلاں شخص نے بھیجی تھی میں نے اُس جیسی مٹھائی نہ کھائی نہ دیکھی۔ اس کے بعد فرمایا کہ شیرینی کے ان ظروف کو محل پذیرانی میں لیجایا جائے جو ایک خاص جگہ تھی۔

بعد ازاں سلطان خود بھی اٹھ گیا اور مجھے کھانے پر مدعو کیا اور صرف غذا کے بعد مجھ سے پوچھا کہ تو نے جو شیرینی پیش کش کی ہے وہ کس طرح کی ہے میں نے کہا کہ سلطان عالم شیرینی تو ہزار طرح کی ہوتی ہے اور میں نہیں جانتا کہ آپ کا سوال کس طرح کی مٹھائی سے ہے۔ سلطان نے کہا کہ مٹھائی کے طبق لائے جائیں اور خوان پوشوں کو اٹھایا جائے۔ جب ایسا کیا گیا تو ایک مٹھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا میں نے کہا اُسے مقصد کہتے ہیں۔

اس کے بعد ایک دوسری مٹھائی کو اُس نے اٹھایا اور کہا کہ اس کا کیا نام ہے میں نے

کہا کہ اُسے ”لقیمات القاضی“ کہتے ہیں۔ بغداد کے شیوخ میں سے ایک تاجر جو سامری کے نام سے منسوب تھا اور خاندانِ عباسیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ایک مالدار شخص تھا اور اس وقت حضورِ سلطانی میں موجود تھا۔ سلطان اسے اپنے باپ کا درجہ دیتا تھا۔

اس شخص نے از روئے حسد یہ چاہا کہ مجھے سلطان کے سامنے شرمندہ کرے اور اس نے کہا کہ اس شیرینی کا نام لقیماۃ القاضی نہیں ہے ایک دوسری طرح کی شیرینی اٹھالی جس کا نام جلد الفرس تھا اور کہا کہ لقیماۃ القاضی یہ ہے۔

ملک الندمانا مرالدین کافی ہروی اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ بادشاہ کے ساتھ اس معاملے میں ایک گونہ مزاح سے پیش آیا اور اُس نے کہا کہ اے سلطان تیرا خواجہ جھوٹ بولتا ہے اور تیرا قاضی سچ کہتا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ کیسے اس نے جواب دیا سلطان عالم وہ تو خود ہی قاضی ہے اور اپنے لقمے کو خوب پہچانتا ہے۔ اس بات کو سُن کر سلطان ہنسنے لگا اور کہا تم سچ کہتے ہو۔ کھانے کے بعد شیرینی کھائی اور قہوے کی کوئی چیز پی اُس کے بعد ہم نے پان لیا اور ہم واپس لوٹ گئے۔

تھوڑی دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ خزینہ دار میرے پاس آیا اور کہا کہ اپنے آدمیوں کو میرے ساتھ بھیج دیں تاکہ وہ روپیہ لے لیں۔ میں غروب آفتاب کے بعد اپنے گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ تین تھیلیاں رکھی ہوئی ہیں اور اس میں چھ ہزار دو سو ۶۲۰۰ ٹنکے موجود ہیں اور یہ مقدار پچیس ہزار دیناروں کے برابر تھی جن کا میں نقوض تھا اور دو ہزار دینار اُس میں اور زیادہ تھے جو بادشاہ نے مجھے اس سے پہلے بخشے تھے اور جس میں سے دسواں حصہ کم کر لیا گیا تھا۔ ہر تنکے کی قیمت ڈھائی دینار درم مغربی کے برابر ہوتی ہے۔

## سلطان کے سفرِ معبر کی داستان

جمادی الاول کی نوے تاریخ کو سلطان نے بلادِ معبر کی طرف سفر کے خیال سے پایہ تخت کو خداحافظ کہا۔ اس زمانے میں میں نے قرض خواہوں کے جھگڑے سے نجات پالی تھی اور سفر کا ارادہ کر لیا تھا اور چھ مہینے کے اخراجات کہا روں، قرائتوں اور دوسرے ملازموں کو دیدیے تھے لیکن اسی درمیان میں فرمان پہنچا کہ میں باقی کچھ آدمیوں کے ساتھ پایہ تخت میں ٹھہروں۔ حاجب نے



اس بارے میں مجھ سے تحریر بھی لے لی تاکہ میں اٹنڈہ انکار نہ کروں یہ ہندوستان کی رسم ہے اور اس خیال سے ہے کہ اٹنڈہ کوئی شخص انکار نہ کرے اور یہ کہے کہ فرمان مجھ تک نہیں پہنچا۔

سلطان نے مجھ کو ہزار دینار دیئے اور دس ہزار دینار قاضی مصر کے بیٹے کو عطا کیے اور اسی طرح اُن عزیزوں کو روپیہ بھیجوا یا۔ جن کے لیے یہ کہا گیا تھا کہ وہ پایہ تخت میں ٹھہریں لیکن اہل محل کو کچھ نہ دیا۔ نیز یہ فرمان بھیجا کہ سلطان قطب الدین کے مقبرے کا حساب کتاب میرے پاس رہے۔ سلطان اس مقبرے کا بہت احترام کرتا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جب وہ اس مقبرے کی زیارت کے لیے آتا تھا تو سلطان کے جوتوں کو جو ہندوستان کی رسم کے مطابق اس کی قبر کے پاس سرہانے کی طرف رکھے ہوتے ہیں، اٹھاتا تھا اُن کو بوسہ دیتا تھا اور سر پر رکھتا تھا اور اس کے قبر کے برابر میں رسم خدمت بجالاتا تھا بالکل اسی طرح جیسا وہ اس کی زندگی میں کرتا رہا تھا۔ اور قطب الدین کی بیوی کی بہت عزت کرتا تھا۔

سلطان قطب الدین کی بیگم کو وہ اپنی بہن کہتا تھا اور اُس کو اپنے حرم میں بڑی حرمت اور حفاظت کے ساتھ رکھتا تھا۔ آخر سلطان نے اُسے قاضی مصر کے بیٹے کے جہان نکاح میں دیدیا اور اس کی خاطر داری کی وجہ سے اس کے شوہر پر بھی بڑی عنایتیں کرتا تھا اور ہر جمعہ کو اس خاتون سے ملنے جاتا تھا۔ سلطان نے دہلی سے روانگی کے وقت ہم کو خدا حافظ کہنے کے لیے بلایا۔ قاضی کا بیٹا کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا نہیں میں سلطان عالم کو خدا حافظ نہیں کہتا اور اُس سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔ اس کا فائدہ بھی ہوا اور سلطان نے کہا اچھا تم ہمارے ساتھ چلو۔

میں سلطان کے سامنے گیا اور چونکہ میرا دل یہ چاہتا تھا کہ میں دہلی میں ٹھہروں اس لیے میں نے خدا حافظ کہہ دیا۔ لیکن اس کا انجام کچھ اچھا نہیں تھا۔ سلطان نے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو میں نے ایک رُقونہ نکالا جس میں چھ باتیں بطور یادداشت لکھی ہوئی تھیں۔ سلطان نے کہا کہ تم منہ زبانی کہہ دو۔ میں نے کہا کہ سلطان عالم نے مجھے قاضی کا عہدہ سپرد کر دیا۔ اور میں نے اس فریضہ کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی لیکن اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے میرا مقصد صرف فرمانِ سلطانی کو بجالانا تھا۔ اور شاہی حکم کا احترام کرنا۔ سلطان نے فرمایا کہ میں نے دونائے بھی تو تیری خدمت کے لیے دہلی میں مقرر کر دیئے تھے اور اس کے بعد کہا کہ اب تم کہو میں نے عرض کیا کہ سلطان

قطب الدین کے مقبرے کے بارے میں اب کیا کرنا ہے۔ میں نے چار سو ساٹھ آدمی اس مقبرے کی دیکھ بھال وغیرہ کے لیے مستقل طور پر متعین کیے ہیں لیکن اوقاف کی آمدنی ان کی مستقل کفالت کے لیے کافی نہیں ہے۔ اور فقراء کو کھانا کھلانے کے اخراجات الگ ہیں۔ سلطان نے وزیر سے کہا کہ پچاس ہزار میں نے اور اضافہ کر دیا ہے کہ صد ہزار من غلہ اور چاول۔۔ دیا جائے تاکہ اوقاف کی آمدنی کے ہاتھ میں آنے تک مقبرے کے اخراجات اس سے چلیں اور ہندوستان کا ایک من بیس رطل مغربی کے برابر ہوتا ہے۔

اس کے بعد اُس نے پھر میری طرف رخ کیا اور کہا کہ اب اور کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے آدمیوں کو قرض خواہوں نے پکڑ لیا ہے اور انہیں قید خانے میں ڈال دیا ہے۔ میں نے اُن سے کچھ اور بھی اقرار کیا تھا۔ اب محکمہ دیوانی سے وابستہ لوگ ان عوام کو جو اس سے قبل میرے ہاتھ آئے تھے چاہتے ہیں کہ انہیں واپس کیا جائے۔ میں خداوندِ عالم سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ یہ حکم دیا جائے کہ یہ مطالبہ مجھ سے نہ ہو۔ سلطان نے پوچھا کہ اس سلسلے میں تجھے اور کیا ملا ہے میں نے کہا پانچ ہزار دینار۔ کہنے لگے چلو ہم اسے تمہارے انعام میں محسوب کر لیتے ہیں۔ بعد ازاں میں نے کہا کہ ایک اور مسئلہ بھی ہے۔ وہ گھر کا معاملہ ہے جو آپ نے مجھے سپرد فرمایا ہے۔ یہ گھر تو مرمت طلب ہے اور نئی تعمیر چاہتا ہے۔ سلطان نے وزیر سے کہا۔ عبارت کیند یعنی اس کو لکھ دو۔ اور اُس پر اضافہ کیا کہ آئندہ نہ رہے۔ میں نے کہا نہیں۔ سلطان نے کہا پھر دوسری وصیت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تو قرض نہ کرے۔ اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ قرض طلب کرنے والے پھر تیرے اوپر زور ڈالیں اور کوئی ایسا بھی نہ ہو کہ تیرے حال احوال کے بارے میں مجھے اطلاع دے۔ جتنا تجھے آمدنی ہو اتنا ہی خرچ کر کہ اللہ پاک نے یہ فرمایا ہے کہ اس طرح کے اخراجات نہ رکھو جو تمہارے گلے کا بار بن جائیں۔ کھاؤ پیو لیکن اصراف بیجا نہ کرو۔

میں یہ چاہتا تھا کہ بادشاہ کے قدم کو بوسہ دوں لیکن وہ مانع ہوا۔ اور اُس نے میرے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ لہذا میں نے اُس کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا اور واپس لوٹ گیا اور اپنے گھر کی تعمیر میں لگ گیا اور چار ہزار دینار اس کام پر خرچ کیے کہ اس میں سے چھ سو دینار مجھے شاہی خزانے سے ملے اور باقی کو میں نے اپنے پاس سے صرف کیا۔

ایک مسجد بھی بنائی اور مقبرے کی عمارت کو بھی درست کیا۔ سلطان نے فرمایا تھا کہ مقبرے کے اوپر ایک گنبد بنایا جائے جس کی اونچائی سو گز ہو یعنی اس قبہ سے بیس ذرع زیادہ ہو جو فزان خاں کے مقبرے (واقع عراق) کا ہے اسی کے ساتھ اس نے یہ حکم دیا تھا کہ تیس باب قریر کے موقوفات مقبرے کے عنوان سے خرید کیے جائیں اور یہ تمام موقوفات میرے ہاتھ میں ہوں کہ ان کا ایک معمول کے مطابق میں اپنے کام میں لاسکتا ہوں۔

میں نے مقبرے کے لیے ضروری تشریفات درست کیں یعنی ایسی چیزیں جن سے مقبرے کی شان اور اس کے شرف میں اضافہ ہو۔ ہندوستان میں کچھ ایسی رسم ہے کہ مردوں کے لیے بھی وہی سب تشریفات اختیار کی جاتی ہیں جو زندگی میں ان کے معمولات ہوتے ہیں اور مقبرے کے دروازے پر ہاتھی گھوڑے باندھے جاتے ہیں اور مقبرے کو زینت و زینت بخشی جاتی ہے۔ میں نے بھی سلطان قطب الدین کے مقبرے کے لیے اسی اصول کو اختیار کیا۔ ڈیڑھ سو قاری مقرر کیے جنہیں ہندوستان میں ختمی کہا جاتا ہے۔ اسی طلباء اور آٹھ فیصد جنہیں مکرر کہتے ہیں۔ ان کی خدمات حاصل کیں اور میں نے مقبرے میں ایک مدرس بھی مقرر کیا۔ اسی طرح اسی آدمی صوفیوں میں سے نیز ایک امام جماعت اور اسی طرح خوش آواز قاریوں میں سے کچھ افراد اسی طرح مدرّج، دفتر دار اور معترف لوگ خدمت پر مامور کیے جو اس ملک میں اسباب کہلاتے ہیں۔

ایک اور طرح کے لوگوں کو بھی میں نے مقبرے کے خدمت گزاروں میں شامل کیا جن کو حاشیہ کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ ان میں آشینبر، چار پایہ، آب دار، شربت دار، تنبول دار، سلاح دار، نیزہ دار، چتر دار، طشت دار، حاجب اور نقیب وغیرہ سب کو قاعدہ کے مطابق رکھا گیا اس طور پر کہ ان کی کل تعداد چار سو ساٹھ تک پہنچ گئی جو سلطان کی طرف سے مقرر تھے کہ روزانہ بارہ من گوشت اور بارہ من آٹا مقبرے کے مصارف کے لیے دیا گیا تھا جو روزانہ خرچ ہوتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اتنے لوگوں کے لیے یہ مقدار کم ہے اور مقبرے کو ذرا اعتد سے جو آمدنی ہوتی ہے اس میں گنجائش ہے۔ بس میں نے حکم دیا کہ روزانہ پینتیس من آٹا اور اتنا ہی گوشت دوسری چیزوں کے ساتھ جیسے شکر، گڑ، روغن اور تنبول وغیرہ معین کیا جائے۔ مقبرے میں جو لوگ کام کرتے تھے اور ان کے ملازمین تھے ان کے علاوہ بہت ہمانوں اور مسافروں کو بھی کھانا کھلایا

جاتا تھا۔ اُس سال بہت شدید قحط پڑا اور مقبرے کی طرف سے جو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا اُس نے لوگوں کے لیے بڑی کشائش پیدا کر دی کہ وہ اس کے وسیلے سے بھوکے مرنے سے محفوظ رہے اور اُس کی بڑی شہرت ہوئی۔

ملک صبح جو دولت آباد میں اس وقت سلطان کے ساتھ تھا اس نے سلطان کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اگر فلاں شخص یعنی ابن بطوطہ جیسے دو آدمی بھی دہلی میں ہوتے تو لوگ قحط کی شدت کی شکایت نہ کرتے۔ سلطان نے اس پر تعجب کیا اور میرے لیے اپنے لباس خاص میں سے ایک خلعت بھیجا۔

خاص خاص دنوں میں جیسے عید الفطر، عید قربان اور اسی طرح پینمبر کے یوم وفات اور ماہ شعبان کی چودھویں تاریخ اور سلطان قطب الدین کے وفات کے دن خرچ کا پیمانہ بہت بڑھ جاتا تھا اور میں سو من اٹھا اور سو من گوشت پکواتا تھا۔ فقراء اور مساکین کو کھانا کھلاتا تھا۔ لیکن خدمت گزاروں کے لیے وہی مقرر تھا جو معمولاً ان کو دیا جاتا تھا۔

## ابن بطوطہ کی مسافرتِ مروہ

وزیر نے غلہ کی اُس مقدار میں سے جو مقبرے کے معارف کے لیے مقرر کی گئی تھی کہ وہ مجھے دیتا رہے۔ اُس میں سے دس ہزار من تو اس نے میری تحویل میں دیدیا اور باقی سے لیے یہ کہا کہ میں وہ ہزار مروہا سے لوں۔ وہاں کا والی خراج یا ریٹس دار ایسی ایک شخص تھا۔ جس کو عزیز خمار کہتے تھے یعنی (مے فروش) اور وہاں کا امیر شمس الدین بدخشان تھا میں نے

اپنے ملازموں کو غلہ کی وصولیابی کی غرض سے بھیجا۔ میرے مامور کردہ لوگوں نے غلہ کی ایک مقدار اپنی تحویل میں لے لی لیکن عزیز خمار کی سخت گیری کی شکایت کی۔ مجبوراً میں نے باقی حصہ کی وصولیابی کے ارادے سے وہاں کا سفر کیا۔

دہلی سے لے کر امر و صحت تک تین دن کا فاصلہ ہے اور یہ دن موسم باراں کی آمد کے دن تھے۔ میں نے اپنے آدمیوں میں سے تین لوگوں کو اپنے ساتھ لیا اور دو اچھے گانے والے بھی میرے ہمراہ تھے کہ وہ بہت اچھے موسیقار تھے۔ وہ راستے کے طے کرنے کے دوران مجھے اشعار گا گا کر سنا تے تھے۔ میں پہلے شہر بجنور میں پہنچا اور وہاں تین بھائی اور ایسے ملے جو خوش آواز تھے ان کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ یہ تین آدمی اور دو وہ جو پہلے سے میرے ساتھ تھے۔ یہ سب میرے لیے گاتے تھے اور میں اس سے خوش وقت ہوتا تھا۔ ہم امر و صحت پہنچے۔۔۔ وہ ایک چھوٹا سا اچھا شہر ہے۔

دیوانی سے متعلق مامور کیے جانے والے لوگ جو اس شہر میں تھے میری ملاقات کے لیے آئے۔ اس کے علاوہ قاضی شہر شریف امیر علی اور شیخ علاقہ نے مجھ سے ملاقات کی۔ ان دونوں نے میری خاطر داری کے لیے ایک اچھی فیاضیت کا بھی اہتمام کیا۔ عزیز خمار اس وقت افغان پور میں تھا کہ نہر کے دوسرے کنارے پر واقع ہے اور نہر ہمارے اور اس شہر کے درمیان حائل تھی۔ ہمارے پاس اس کو عبور کرنے کے لیے کوئی وسیلہ نہیں تھا۔۔۔۔۔ ایک کشتی تختوں اور گھانس کے پولوں کی مدد سے بنائی اور اپنا سامان اس میں رکھ دیا۔ اگلے دن ہم اس ندی سے گزرے۔ نجیب جو عزیز خمار کا بھائی تھا ایک جماعت کے ساتھ (جو اس کی ہمراہی تھی) مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے وہاں ایک خیمہ بھی نصب کیا۔ اس کے بعد خود عزیز خمار آیا جو اپنے جوڑو ستم میں مشہور تھا۔ ہزار اور پانچ سو قریب اس کے زیر انتظام تھے جن کی سالانہ آمدنی ساٹھ لاکھ روپیہ تھی اور اس کا پانچواں حصہ اس سے ملتا تھا۔

جوندی وہاں سے گذرتی ہے اس کے عجائبات میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی یا جانور کوئی بھی اس کا پانی نہیں پیتا۔ ہم تین روز اس کے کنارے پر اقامت پذیر رہے اور ہم نے ایک جرعہ گھونٹ بھی اس کے پانی کا نہیں لیا۔ بلکہ اس کے قریب بھی نہیں گئے۔ یہ ندی

ہمالیائی سلسلہ کوہ سے نکلتی ہے اور ایک سرچشم کی صورت میں وہاں سے آگے بڑھتی ہے اس پہاڑی سلسلہ میں ایسے کوہسار بھی ہیں جن میں سونے کی کانیں ہیں۔ یہ ندی راستہ طے کرتی ہوئی سب آگے بڑھتی ہے تو ایسی سرزمینوں سے بھی اس کا گزر ہوتا ہے جہاں زہریلی جھاڑیاں ہوتی ہیں یا دوسری اشیاء لہذا اس کا پانی سموم ہو جاتا ہے اور اُس کو پینے والا اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

یہ کوہستانی سلسلہ کچھ اس طرح ہے کہ یہاں پہاڑ ایک دوسرے سے وابستہ اور تے دستہ ہے اور اتنی دُور تک چلے گئے ہیں کہ یہ فاصلہ تین ماہ میں طے ہو سکتا ہے۔ یہ سلسلہ کوہ بلادِ تبت سے جا کے مل جاتا ہے کہ مُشک نافہ والے ہرن وہاں بہت پیدا ہوتے ہیں۔ (میں نے اس سے پیشتر اُن نقفانات کا ذکر کیا ہے جو اس کوہستان میں مسلمانوں کے لشکر کو اٹھانا پڑے تھے)۔

یہاں حیدری درویشوں میں سے ایک جمعیت میرے پاس آئی اور سماع میں مشغول ہو گئی۔ انہوں نے آگ روشن کی اور اُس میں بے تکلف آئے گئے آگ نے اُن پر کوئی اثر نہیں کیا۔

## دادری ابن بطوطہ

شمس الدین بدخشاہ جو اس علاقے کا امیر ہے۔ اُس کے اور عزیز خمار کے درمیان ایک جھگڑا تھا۔ عزیز شمس الدین کی دست بُرد سے بچنے کے لیے اپنے گھر میں پناہ گزیں تھا۔ ان دونوں کے تنازعہ کی شکایت دہلی پہنچی اور اُس نے میرے پاس کسی آدمی کو بھیجا۔ نیز ملک شاہ کو جو یہاں غلاموں کا امیر تھا اور چار ہزار سلطانی غلام جو اس شہر میں رہتے ہیں وہ ان کا نگرانِ اعلیٰ تھا اور اسی طرح شہاب الدین رودھی کو اُس نے حکم نامہ بھیجا کہ تین شخص مل کر اس قضیہ و اختلاف کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔ اور جس شخص کو بھی ہم قصور وار پائیں اُسے گرفتار کر کے پایہ تخت روانہ کریں۔ سب میرے گھر میں جمع ہوئے عزیز نے شمس الدین کے بارے میں چند باتیں بطور دعویٰ داری کے کہلوائیں۔ اُن میں سے ایک

وجہ یہ تھی کہ شمس الدین کے خادموں میں سے ایک شخص رضیٰ ملتانی کا نام لے کر عزیز کے خزانہ دار کے گھر پہنچا۔

اُس نے وہاں جا کر شراب پی اور پانچ ہزار دینار اُس رقم میں سے جو خزانہ دار کے اختیار میں تھی چُرا لیے۔ میں نے رضیٰ کو اس معاملے میں بلایا اور اُس سے استفسار کیا۔ اُس نے کہا کہ میں جب سے ملتان سے آیا ہوں میں نے شراب نہیں پی اور اب تو مجھے آئے ہوئے بھی آٹھ سال ہو گئے۔ میں نے کہا کہ ملتان میں رہتے ہوئے شراب پی تھی اُس نے کہا ہاں۔ میں نے حکم دیا کہ اُس کے اسی کوڑے مارے جائیں۔ ورنہ چوری کے الزام میں کہ جس کے حق میں قرائن موجود تھے۔ اُسے قید خانے میں ڈال دیا۔ دو ماہ کے بعد جبکہ میری مسافرت کا زمانہ بہت طویل ہو چکا تھا۔ میں امر وھا سے واپس آ گیا۔۔۔ میں اپنے ہمراہیوں کے لیے قیام کا بندوبست کیا اور انھیں امر وھا میں چھوڑ دیا تاکہ وہ عزیز سے غلہ کی وصولیابی کر کے دہلی لے آئیں۔ عزیز نے بیس ہزار من غلہ قریے کے رہنے والوں سے جو اُس کی نگاہ میں تھا حاصل کیا اور یہ بات قرار پائی کہ اُس مقدار کو تین ہزار بیلوں پر لاد کر دہلی لایا جائے۔ ہندوستان کے لوگ نقل و حمل کے کام کو بیلوں کے ذریعے انجام دیتے ہیں اور مسافرت میں اپنے مال و اسباب وغیرہ کو اسی جانور کی پشت پر لادتے ہیں۔

گدھے کی سواری ہندوستان میں بہت عیب کی بات سمجھی جاتی ہے۔ یوں بھی ہندوستان کے گدھے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور اُن کو تو لاشہ کہا جاتا ہے۔ جب یہ چاہتے ہیں کہ کسی مجرم کو عام لوگوں کی نظر میں رسوا کریں تو اُس کو تازیانہ مارتے ہیں گدھے پر بٹھاتے ہیں اور شہر میں چکر لگواتے ہیں۔

## میرے ایک محترم دوست کی داستان

ناصر الدین اوھری ایک وقت مسافرت پر روانہ ہو رہا تھا اُس نے ایک ہزار ساٹھ تنکے میرے پاس امانت رکھے۔ میں نے اُس رقم کو خرچ کر دیا جب میں نے دہلی

مراجعت اختیار کی تو میں نے دیکھا کہ اُس نے میرے معاملے سے متعلق قوام الدین خداوند زادے جو کہ نائب وزیر کی حیثیت سے دہلی آیا تھا۔ اُس رقم کا قبالہ حوالے کر دیا۔ مجھے اس بات پر بہت شرم آئی کہ میں نے وہ روپیہ خرچ کر لیا تھا۔ اس کا تیسرا حصہ میں نے اس کو دیدیرا اور میں چند روز اپنے گھر میں خانہ نشین رہا۔ میرے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ میں بیمار ہوں۔ ناظرین میرے دیدار کے لیے آیا جب اس نے مجھے دیکھا تو یہ کہا کہ میں تو کہیں سے تمہیں بیمار نہیں پاتا۔ میں نے کہا کہ میں دل کی بیماری میں مبتلا ہوں وہ کچھ نہ سمجھا اور کہا کہ کھول کر بتلاؤ۔ میں نے کہا کہ اپنے نائب شیخ الاسلام کو میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اُس سے پوری بات کہہ دوں۔

جب شیخ الاسلام مجھ سے ملنے آیا تو میں نے سارا واقعہ اُس سے بیان کر دیا۔ وہ واپس چلا گیا اور صدر جہاں کو اطلاع دی۔ اُس نے ایک ہزار دینار میرے لیے بھیج دیئے اس سے بیشتر بھی ایک ہزار دینار کے لیے میں اُس کا مقروض تھا۔ اُس کے بعد باقی تحویل کا مجھ سے مطالبہ کیا گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب صدر جہاں ہی مجھے اس مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دولت مند آدمی تھا۔ میں نے ایک ایسا گھوڑا جس کی زین اور دوسرا ساڑھ سو دینار قیمت کے برابر تھا۔ اسی طرح سے ایک دوسرا اسپک جس کی قیمت بھی اُس کے سارے ساتھ آٹھ سو روپے تھی نیز دو اشتر جو ہزار بارہ سو قیمت کے تھے۔ اسی طرح ایک ترکش تقرنی مزید دو تلواریں کہ ان کے نیام بھی چاندی کے تھے میں نے صدر جہاں کے پاس بھیج دیئے۔

اس کے بدلے میں میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ان کی قیمت کا تعین کرے اور روپیہ مجھے دے۔ اُس نے ان کو اپنی تحویل میں رکھا اور تین ہزار دیناروں کے بدلے میں ایک ہزار دینار نقد مجھے بھیج دیئے اور دو ہزار دینار اس گاؤں کے حسابات میں شامل کر لیے جو میرے پاس تھا۔ میں پریشان ہو گیا اور مجھے بخارا گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں اس کی شکایت وزیر سے کروں تو بدنامی ہوگی اور یہ اچھا نہیں ہے۔ میں نے پانچ گھوڑے دو کنیزیں اور دو غلام ملک مغیث الدین محمد پسر ملک الملوک عماد الدین سمنانی کو بھیج دیئے۔



اُس نے مجھے یہ سب واپس کر دیا اور دو سو تنکے مجھے دیئے۔ میں نے اس رقم کے ذریعے دین داری کی مصیبت سے رہائی پائی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اس محمد اور اُس محمد کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔

## عزیمت ابن بطوطہ بہ لشکر سلطان

جب سلطان محمد بن تغلق اپنی مسافرت کے دوران مالابار کے اطراف میں تلنگانہ تک پہنچا تو اُس کے لشکر میں وبا پھیل گئی۔ سلطان دولت آباد (تغلق آباد) واپس آ گیا اور دریائے گنگا کے کنارے فروکش ہوا۔ حکم دیا کہ لوگ وہاں اپنی عمارتیں بنالیں اور گھر تعمیر کریں۔ اسی زمانے میں بادشاہ کے لشکر میں گیا اور ان ہی دنوں میں عین الملوک کی شورش کا واقعہ پیش آیا۔ بادشاہ کی خدمت میں تھا۔ جب اُس نے اعلیٰ درجے کے گھوڑوں کو اپنے خواص میں تقسیم کیا تو ان میں مجھے بھی شامل رکھا۔ میں عین الملوک کے ساتھ نبرد آزمائی اور پھر اُس کی گرفتاری کے قصبے میں شامل رہا اور سلطان کی خدمت میں حاضر اسی کے ساتھ دریائے گنگا اور سر جو ندی سے عبور کیا اور پایہ تخت واپس آ گیا۔

## ابن بطوطہ سے سلطان کی خفگی کا واقعہ

بادشاہ کے مجھ سے غصے ہونے کا سبب یہ تھا کہ میں ایک دن شیخ شہاب الدین لہری شیخ جام کی زیارت کے لیے اُس غار میں گیا جو شہر دہلی سے باہر تھا اور جہاں شیخ شہاب الدین رہا کرتے تھے۔ میرا مقصد اس سے غار کو دیکھنا تھا کہ وہ شیخ نے خود اپنے لیے بنایا تھا۔ بعد میں جب سلطان نے شیخ کو گرفتار کر لیا تو شیخ کے بیٹوں سے پوچھا کہ شیخ سے ملنے کے لیے کون لوگ آتے تھے۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کا نام بتایا۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ سلطان نے فرمایا کہ اس کے آدمیوں میں سے چار آدمی میری مجلس میں حاضر رہا کریں اور صورت حال یہ تھی کہ جس شخص پر بھی اس طرح سے سلطان کے آدمی مسلط کیے جاتے تھے۔ اُس کی نجات کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی تھی۔

پہلا دن جب ان معذور کردہ لوگوں نے مجھے اپنی نگہداری میں رکھا جمعہ کا دن تھا۔ اللہ پاک نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ میں ”حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ“ پڑھوں۔ ان دن میں نے تینتیس ہزار بار اس کلمہ مقدس کی تلاوت کی۔ رات کو اسی محل میں بسر کی اور پانچ دن تک روزہ رکھا اور روزانہ میں ایک قرآن ختم کرتا تھا اور محض پانی کا گھونٹ پی کر روزہ افطار کرتا تھا۔ میں نے پانچوے دن روزہ افطار کیا اور اُس کے بعد چار دن تک مزید روزہ رکھا۔ انجام کار یہ ہوا کہ شیخ کا قتل عمل میں آیا اور مجھے نجات ملی۔

جب ایک مُدت گزر گئی تو میں اس خدمت گزاری دل برداشتہ ہو گیا اور میری طبیعت اس ملازمت سے ادب گئی۔ میں نے کمال الدین عبداللہ غازی کو جو ایک دانش مند عابد و زاہد اور نادرہ روزگار شخص تھا اپنا پیش رو بنایا وہ اولیائے وقت میں سے تھا اور صاحب کرامت شمار کیا جاتا تھا اور میں نے اُس کی بعض کرامتیں خود بھی دیکھی تھیں، میں اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کار دنیا سے میں نے گوشہ گیری اختیار کر لی، جو کچھ میرے پاس تھا وہ میں نے راہِ خدا میں صرف کر دیا۔ شیخ دس روز پیشتر سے لگا تا روزے رکھ رہے تھے ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیس بیس دن تک وہ برابر دائم الصوم رہے میرا دل بھی برابر یہ چاہتا تھا کہ میں انھیں کی طرح ریاضت شاقہ کروں لیکن وہ مجھے اجازت دے یہ نہیں ہوتا۔ میرے اس مرشد کا کہنا تھا کہ میں ریاضت و عبادت میں اعتدال کی راہ اختیار کروں۔

میں بھی اپنے اندر اس معاملہ میں ایک گونہ کمزوری محسوس کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ابھی تک میں نے کئی طور پر ترک دنیا اختیار نہیں کیا تھا اور میرے پاس حال دنیا میں سے کچھ نہ کچھ ضرور تھا میں نے اس کو بھی تقسیم کر دیا تاکہ میں ”دار و مدار“ کے جھیلے سے نجات پاؤں یہاں تک کہ میرے تن پر جو لباس تھا میں نے وہ بھی راہِ مولا میں دیدیا۔ اور اپنے پیر کی دی ہوئی گڈری پہن لی۔ چھ ماہ تک میں اسی طرح شیخ کی خدمت میں رہا۔ سلطان اس زمانہ میں دہلی سے غائب تھا اور بلا دوسرے میں قیام فرماتا تھا۔

## سلطان کی واپسی اور میری سرفرازی کی داستان

جب میری گوشہ گیری اور ترک دنیا کی بابت سلطان نے سنا مجھے حضور میں طلب کیا اس وقت وہ سیوستان میں تھا میں اسی درویشانہ لباس میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے بڑی نرمی سے بات کی اور لطف و عنایت سے پیش آیا اور مجھ سے یہ خواہش کی کہ میں دوبارہ شاہی ملازمت سے وابستگی اختیار کروں میں نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ سلطان سے اجازت طلب کی کہ میں سفر حجاز اختیار کر سکوں۔ سلطان نے اجازت دیدی اور رخصت عطا فرمائی میں واپس ہوا اور ایک گوشہ میں کہ ملک بشیر سے منسوب قلعی زاویہ گیری اختیار کی اور یہ ماجرا اواخر جمادی الثانی ۷۲۲ھ میں پیش آیا۔

میں ماہ رجب (تمام) اور ماہ شعبان کی دس تاریخ تک اسی زاویہ میں معتکف رہا اور بات یہاں تک پہنچی کہ پانچ پانچ دن تک مسلسل روزدار رہتا تھا اور چاولوں کے پانی سے روزہ افطار کرتا تھا اور کھاتا کچھ بھی نہیں تھا، تمام دن تلاوت قرآن پاک میں مشغول رہتا یا پھر تہجد کی نفلیں پڑھتا رہتا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب میں کھانے کی اقسام غذا کوئی چیز لیتا تھا تو مجھے ایک گونہ اذیت ہوتی اور اگر کچھ نہ کھاتا تو راحت محسوس کرتا میں نے چالیس دن اسی انداز سے بسر کیے۔ تاہذا سلطان نے مجھے دوبارہ طلب کیا۔

## ابن بطوطہ کو سفیر چین بنا دیا گیا

چالیس روز کے بعد سلطان نے سائو میراق سے آراستہ ایک گھوڑا چند غلام اور کنیزیں علاوہ بریں امیرانہ پوشاک اور روپیہ مجھے بھیجا میں نے یہ لباس اس لیے پہنا کہ میں سلطان کے سامنے جاسکوں۔ اس وقت میں ایک نیلے رنگ کی گڈڑی پہنے ہوئے جو استر دار تھی۔ میں ایام اعتکاف میں اسے پہنے رہا تھا اب کہ میں نے اسے

تن سے جدا کیا اور سلطان کے بھیجے ہوئے ملبوس کو پہنا تو میں نے کچھ عجیب سا محسوس کیا۔ میں اس کے بعد جب کبھی اس خرقہ کو زیب تن کرتا تو مجھ پر ایک گریبے اختیار طاری ہو جاتا اور میں اپنے باطن میں ایک روحانی روشنی محسوس کرتا۔ اسی لیے میں ہمیشہ اُسے اپنے ساتھ رکھتا۔ یہاں تک کہ وہ راہزنوں نے لوٹ لیا۔

بہر حال جب میں سلطان کی خدمت میں گیا تو اس نے میرا اعزاز و اکرام پہلے سے کچھ زیادہ کیا اور کہا میں نے تمہیں اس لیے بلا یا ہے کہ میں اپنی طرف سے چین کے بادشاہ کے حضور میں اپنی بنا کر بھیجوں میں جانتا ہوں کہ تم سیر و سیاحت اور دریاہ پیمائی کو کس قدر دوست رکھتے ہو۔ اس کے بعد سلطان نے حکم دیا کہ اس سفارت اور عزم مسافرت کے لیے جن چیزوں کی فراہمی اور تیاری ضروری ہوگی۔ سلطان کی طرف سے دن کا اہتمام کیا جائے گا۔ نیز جو لوگ اس سفارت کے میرے ہمراہ ہوں گے سلطان نے ان کو بھی معین کیا۔

## سلطانی تحائف کو بھیجنے اور ابن بطوطہ کو سفیر بنا کر بھیجنے کے اسباب

بادشاہ چین نے سلطان الہند کو مختلف ہدیے اور تحفے بھیجے تھے جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے سو غلام اور کنیزیں پانسو پارچہ کم خواب کہ ان میں سے ایک صد شہر زیتون کی مصنوعات میں سے تھے اور ایک سو شہر کے کاریگروں کے تیار کردہ تھے۔ پانچ جواہرات سے مرصع ملبوس پانچ زرد دوزی ترکش اور پانچ قبضہ ہائے شمشیر اور یہ خواہش کی تھی کہ سلسلہ کوہستان ہمالیا واقع جنگردوں (بودھ خانقاہوں) کو جو لشکر کشوں کی دست بندوں کے دہان، غیر آباد اور ویران ہو گئے ہیں دوبارہ تعمیر کرائے جائیں۔ سلطان الہند کی طرف سے یہ کہا گیا کہ جو آبادیاں سلطان وقت کو جزیرہ ادا نہیں کرتیں ان کی طرف سے کوئی ذمہ داری سلطان الہند پر عاید نہیں اگر یہ آبادیاں ذمی کی حیثیت سے ہمارے زیر نگرانی آجائیں تو ان بٹ خانوں کی تعمیر و آبادی ممکن ہے۔

## بادشاہ چین کے لیے سلطانی ہدیے

سلطان الہند نے بادشاہ چین کے ہدیوں کے جواب میں جو تحفے ارسال کیے وہ چینی ہدیہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ بیش قیمت اور قابل قدر تھے۔ ان میں سو عمدہ قسم کے گھوڑے سو غلام اور سو ہندوستانی کینزیز جو نہ صرف یہ کہ پڑھنے کا ہنر جانتی تھیں بلکہ انھیں فن رقص بھی آتا تھا اور ایک صد پارچہ بیسری کہ روٹی کے نرم اور باریک ریشے سے تیار کیے جلتے ہیں اور خوبی و زیبائی میں بے نظیر ہوتے ہیں اور ان کے ایک " (تھان) کی قیمت سو دینار ہوتی ہے۔

اسی طرح ساتھ پارچہ ہائے حریر کے سو "شقتے" بھی تھے اس کپڑے کو خز کہا جاتا ہے یہ وہ عمدہ کپڑا ہے جو ریشم سے تیار کیا جاتا ہے اور اس کے تار پانچ رنگوں میں رنگے جاتے ہیں۔ سو جامے اس کپڑے کے تھے جو "صلاحیہ" کے نام سے مشہور ہے اور اسی طرح صد پارچہ "شیریں باف" اور ایک صد "شال باف" اور پانسو جامے "مرغزی" کپڑے کے کہ ان کے سوتھان سفید اور ایک سوتھان سیاہ تھے۔ ایک صد سُرخ اور ایک صد سبز، اور اسی عنوان سے ایک صد تھان نیلے رنگ کے تھے۔

ان تحائف کے ساتھ سو شقتے دیبائے رومی کے اور ایک سو شقتے پارچہ باف کے، نیز سراچے، چھ قبتے، چار طلائی اور چھ نقرئی شمعدان، اور چار سونے کے طشت اور ندریں صراحیوں مزید چھ طشت چاندی کے اور دس خلعت شاہی زربفت سے تیار کیے ہوئے اور اسی طرح دس عدد درباری دستاریں کہ ان میں سے ایک مرصع بجواہر تھی اور دس ترکش کہ ان پر زردوزی کی گئی تھی اور ان میں سے ایک جواہر نگار تھا اور اسی طرح دس تلواریں جن میں سے ایک کلاستہ جڑاؤ تھا اور ایک "کہ وہ بھی زردوز جواہر سے آراستہ پیراستہ تھا اور ان سب اشیاء کے ساتھ پندرہ پیش خدمت بھی تھے۔

## روانگی چین

سلطان نے اس مسافرت کے لیے ظہیر الدین زرنجانی کو دکہ وہ اصحاب علم و فضل میں سے ایک شخص تھا کا فوراً تیار کر کے اتفاق کے ساتھ کہ تمام تحفے اور ہدیے اس کے سپرد تھے، ہمارے ہمراہ کیا نیز حکم دیا کہ امیر محمد ہراتی ایک ہزار سواروں کے ساتھ ہمیں ساحلِ دریائے پہنچائے اور چین پہنچ کر دربارِ سلطانی کی نپائندگی کرنے والی جماعت کو جو پندرہ افراد پر مشتمل تھی اور ان میں سب سے بزرگ شخص نرسی نام رکھتا تھا کم و بیش ایک صد افراد، بطور خدمت گزار ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے اس ترتیب کے ساتھ ایک خاصے بڑے لشکر کی صورت میں آغاز سفر کیا۔ سلطان نے یہ حکم بھی صادر کیا تھا کہ بلادِ ہندوستان میں جہاں سے بھی ہمارا سفر دربارِ شاہی کے نمائندوں کی حیثیت سے ہماری پزیرائی عمل میں آئے۔

ہماری مسافرت کا آغاز ماہِ صفر کی سترہ تاریخ کو ہوا۔ اس روز کو خصوصاً روانگی سفر کے لیے انتخاب کیا گیا تھا اس لیے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسافرت یا دوسری تاریخ کو اختیار کی جائے یا سات تاریخ کو یا پھر بارہ یا سترہ تاریخ کو یا تیسویں یا ستائیسویں تاریخ بہت ہی مبارک خیال کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے جس مقام پر ہماری منزل ہوئی وہ ایک موضع تھا کہ دہلی سے دو فرسخ اور ایک ثلث کے فاصلے پر واقع ہے وہاں سے ”ہیلو“ اور بعد ازاں ہم ایک بڑے شہر یعنی بیانہ میں پہنچے۔ یہ شہر بہت خوبصورت ہے اس کے دو طرفہ بازار بہت پر رونق ہیں اور اس کی مسجد جامع بہت ہی خوبصورت مسجدوں میں سے ہے جس کی دیواریں اور سقف پتھر سے تیار کی گئی۔ حاکم بیانہ مظفر الدین دایہ ہے اس امیر کی ماں سلطان کی دایہ تھی۔

## سلطان ہند کی بہن کی شادی کی داستان

امیر سیف الدین محمد اجوبیت اللہ منہا کا بیٹا ہے اور ملک شام کے امراء میں سے ہے۔ وہ ان امیروں میں شامل تھا جنہیں ہندوستان کے دربار میں بہت افزا اور اکرام سے نوازا گیا۔ اُسے سلطان جلال الدین کے محل میں ٹھہرایا گیا۔ اس محل کو کوٹک محل کہتے ہیں جس کے معنی قصرِ احمر کے ہیں اور یہ ایک عظیم محل ہے۔ جس کا صحن بہت گشادہ ہے اور اس کی راہیں بہت فراق یہ محل اونچائی پر واقع ہے۔ یہ میدان اور دوسرا میدان آگے جا کر اس محل سے مل جاتے ہیں۔ سلطان جلال الدین اس ایوان میں کرسی نشین ہوتا تھا اور اس کے سامنے یہاں چوگان کھیلتے تھے۔

اس کو میں نے اُس وقت دیکھا تھا جبکہ اسے امیر سیف الدین کو رہائش کے لیے دریا جارہا تھا یہ ہر طرح کے قیمتی سامان فرش فروش اور قالین وغیرہ سے دیوار بہ دیوار آراستہ تھا۔ ہندوستان کی رسم یہ ہے کہ بادشاہ کی موت کے بعد اُس کے محل کو اسی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ اور اس کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے اور آئے والے بادشاہ اپنے لیے دوسرا محل بناتا ہے۔ میں اس محل میں خوب گھوما اس کے بالائی حصے تک گیا اور مجھے اُس وقت اس طرح سے عبرت ہوئی کہ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اس وقت فقیر ادیب جمال الدین مغربی جو غرناطہ کا رہنے والا ہے ا

مجاہد شہر میں پیدا ہوا تھا اور اس وقت ہندوستان میں زندگی گزار رہا تھا وہ بھی میرے ساتھ تھا۔ یہ شخص اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان آیا تھا اور اب یہیں صاحب خانہ ہو کر رہ رہا تھا اُس کے اولاد بھی ہے۔ اُس نے جب اس قصر کو دیکھا تھا تو اس کے تاثر کو ایک شعر میں ظاہر کیا تھا۔ اُس کا یہ مطلب ہے۔ اگر اُن۔۔۔ بادشاہوں کا جو یہاں حکومت کرتے رہے ہیں، تمہیں کوئی سُرانغ چاہیے تو خاک سے پوچھو کہ اُن کے بلند سروں کا ایب سوائے ہڈیوں کے اور کوئی نشان باقی نہیں۔ امیر سیف الدین کی شادی کا ولیمہ جس کی تفصیل میں آئندہ بیان کروں گا۔ اسی محل میں ہوا تھا

ایک بار ملک یازید نے مانک پور کی ولایت سے معتبر ہدیے سلطان کے پاس بھیجے۔ ان میں سے سلطان نے گیارہ گھوڑے جو عمدہ نسل کے تھے۔ امیر سیف الدین کو بخش دیئے۔ اسی طرح ایک دوسرے موقع پر دس گھوڑے مرصع ساز اور طلائی لکاموں کے ساتھ اس امیر کو عطا کر دیئے یہاں تک کہ اپنی بہن فیروز خاتون کو اس کے نکاح میں دیدیا۔

جب سلطان ہند کافرمان امیر سیف الدین نندا کے ساتھ اپنی خواہر کی شادی کے سلسلے میں صادر ہوا۔ تو ملک فتح اللہ جو شب نویس کے نام سے معروف ہے۔ شادی نے جشن اور اس کے لیے تمام فروری سامان کی تیاری کے واسطے ہوا، مجھے بھی اس کے لیے مقرر کیا گیا کہ میں چند روز امیر کے ساتھ رہوں ملک فتح اللہ نے حکم نامہ صادر کیا کہ چادریں تان دی جائیں اور قمر احمر کے دونوں میدانوں کے لیے سائبان یا شامیلے بنائے جائیں اور ہر ایک میدان میں ایک وسیع اور شادہ خیمہ نصب کیا جائے اور اس میں عمدہ فرش اور قالین پھائی جائیں۔

شمس الدین تبریزی کو جو رقص کرنے اور نغمہ سرائی کرنے والوں کا رئیس تھا۔ اس لیے دعوت دی گئی کہ وہ اپنی تمام رقاصہ عورتوں اور نغمہ سرا مردوں کے ساتھ اس جشن میں شریک ہو۔ کھانا پکانے، روٹیاں بنانے، بریانی تیار کرنے اور اسی طرح مٹھائی والوں، شربت داروں اور پان والوں کو جمع کیا گیا بے شمار مرغ اور بکرے ذبح کیے گئے اور لوگوں کو دعوتیں کھلائی جاتی رہیں۔

مختصی کی شب سے پہلے عورتیں شاہی محل سے اس محل تک آئیں۔ اور اس کو آراستہ کیا اور بہترین ترتیب کے ساتھ اس میں فرش پھمائے گئے۔ امیر سیف الدین کو اندر طلب کیا گیا۔ امیر تو ایک عرب کارہننے والا انسان تھا اور یہاں اس کا کوئی عزیز نہیں تھا۔ عورتوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایک خاص جگہ لیجا کر بٹھایا گیا۔ بادشاہ کے حکم مبارک خاں کی ماں امیر سیف الدین کی ماں کے طور پر متعین کیا گیا تاکہ وہ صورت پیدا ہو جائے کہ جیسے امیر اپنے خاندان کی خواتین کے درمیان ہو۔



ان خواتین نے امیر کو اس خاص جگہ پر بٹھایا جو اس موقع کے لیے تیار کی گئی تھی۔  
 ہندی لائی گئی اور اس کے ہاتھ پیر کو اس زمانے میں جنا آلود کیا گیا۔ دوسری عورتیں  
 گاتے اور رقص کرنے میں مشغول ہوئیں۔ اس کے بعد وہ اس محل کی طرف چلی گئیں جو  
 دولہا اور دلہن کی ملاقات کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اور امیر اپنے کچھ خاص احباب کے  
 یہاں رہ گیا۔ سلطان نے یہ حکم دیا تھا کہ امیروں کی ایک جماعت دولہا کے ہم قوم لوگوں  
 اور عزیزوں کے طور پر اس کے ساتھ رہے اور اسی طرح کچھ دوسرے لوگ دلہن کے  
 رشتے داروں کی حیثیت سے ان مراسم میں شرکت کریں۔ ہندوستان میں یہ رسم کچھ اس طور  
 پر ہوتی ہے کہ دلہن کے آدمی اس محل میں جہاں عروس اور نوشرہ کی ملاقات طے ہوتی ہے  
 جمع ہوتے ہیں اور جب نوشرہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ وہاں آتا ہے تو عروس کے لوگ  
 اس کا راستہ روکتے ہیں۔ دولہا اور اس کے ہمراہی یا تو بزور وہاں جانے کی کوشش  
 کرتے ہیں یا پھر بہت سا روپیہ دیتے ہیں یہاں تک کہ دولہن والے دست بردار  
 ہو جاتے ہیں اور راستہ دیدیتے ہیں۔

غروب آفتاب کے کچھ بعد کا وقت تھا کہ نیلے ریشم سے تیار کیا ہوا ایک خلعت  
 جو سنہرے کام سے مزین اور مرصع تھا اور جواہرات کے کثرت کے باعث اس کا رنگ  
 کا بھی پتہ نہ چلتا تھا۔ ایک ایسے دستار کے ساتھ کہ اسی خلعت کی نظیر پیش کرتی تھی تہانہ جوڑا  
 امیر سیف الدین کے محل میں لایا گیا۔ میں نے ان خلعتوں کو بھی دیکھا تھا جو سلطان نے اپنے  
 دوسرے دامادوں کو بھجوائے تھے۔ مثلاً عماد الدین سمنانی ملک الاعلاء، شیخ الاسلام اور  
 صدر جہاں کے بیٹوں کو ان میں سے کوئی خلعت بھی اس خلعت کے برابر خوبصورت  
 اور شاندار نہیں تھا جو امیر سیف الدین کو بھیجا گیا تھا امیر، اس خلعت کے حصول کے  
 بعد اپنے ہمراہیوں اور غلاموں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوا ان ملازموں اور غلاموں میں سے  
 ہر ایک اپنے ہاتھ میں چھوٹا سا عصا لیے ہوئے تھا۔

اس وقت اک پھولوں سے بنا ہوا ہار لایا گیا جس میں چنبیلی، موگر اور ایسے ہی چھوٹے  
 چھوٹے پھول سجے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ ایک بدھی اور سہرے جیسی پھولوں کی لڑیاں بھی

تھیں جس سے سر اور سینے کو چھپاتے ہیں۔ امیر نے ان کو پہننے میں تامل کا اظہار کیا۔ اس لیے کہ وہ عرب کے بادشاہینوں میں سے تھا اور ان چیزوں سے انھیں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ میں اُس کے پاس گیا اور میں نے اُس کو قسم دی جس کے بعد اُس نے ہار کو لے لیا۔ اپنے سر پر رکھا اور محل شاہی کے دروازے تک آیا۔ یہاں دلہن کے لوگوں نے باڑھوں کا کی۔ امیر نے ان آدمیوں کے ساتھ مل کر جو چھوٹے چھوٹے عصا ہاتھ میں لیے ہوئے آئے تھے۔ اُن پر حملہ کیا اور جو آدمی اُس کا راستہ روک رہے تھے انھیں ادھر ادھر بھاگایا۔ جب یہ خبر بادشاہ کے کانوں تک پہنچی تو اسے اچھا لگا۔ نو شاہ اس ترتیب سے دلہن کے محل تک پہنچا عروس ایک اونچی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جو دیباہ حریر کے صندوقی پوتھوں سے آراستہ تھی اور اس پر سنہرے ہاروں سے پھول بوٹے بنائے گئے تھے۔ وہ محل سراخورتوں اور گانے والیوں سے بھری ہوئی تھی ہر طرح کے آلات موسیقی وہاں حاضر تھے تمام آدمی دو لہا کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور وہ اُس جگہ تک سوار آیا جہاں دو لہن بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں سے گھوڑے سے اتر کر پیادہ ہو گیا اس کو دو لہن کے کرسی کے قریب میں جگہ دی گئی عروس اُس کی آمد پر کھڑی ہو گئی یہاں تک کی داماد تخت پر آ گیا پس دو لہن نے پان لیا اور وہ دو لہا کو پیش کیا۔ دو لہن جس جگہ بیٹھی ہوئی تھی وہ اُس سے نچلی کرسی پر بیٹھا۔ دو لہا کے لوگوں نے سنہرے سکتے اظہار شادمانی کے طور پر لوگوں پر بچھا کر کیے ان طلائی سکوں کو عورتوں نے جمع کیا۔

جب یہ رسمیں ادا کی جا رہی تھیں تو گانے والی عورتیں برابر بلند آواز سے گارہی تھیں اور باہر نقارے نفیریاں اور دوسرے ساز بجائے جا رہے تھے اُس وقت امیر اٹھا اور دو لہن کا ہاتھ پکڑا اور تخت سے نیچے اور عروس دو لہا کے پیچھے روانہ ہوئی۔ امیر گھوڑے پر سوار ہو کر فرش فروش اور قالین اور وہاں جو باٹھ بھی ہوئی تھی اُس کے اوپر سے گزرتا ہوا وہاں سے واپس ہو گیا۔ اس مرتبہ اس پر اور اُس کے آدمیوں پر دو لہن کے آدمیوں کی طرف سے پھر سکتے بچھا کر کیے گئے۔ دو لہن کو ایک محل میں بٹھایا گیا اور غلاموں نے اس کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور امیر سیف الدین کے محل کی طرف روانہ ہوئے۔

ساتھ والی خواتین دلہن کے محل کے سامنے گھوڑوں پر سوار چل رہی تھی اور دوسری عورتیں پیادہ پاد دلہن کے ساتھ تھی اور جب دلہن امیر کے گللو خانے یا پھر کسی بزرگ کے سامنے سے گزرتی تھی یا پھر کسی بزرگ کی رہائش گاہ کے سامنے سے گزرتی تھی تو صاحب خانہ باہر آتا تھا اور اپنے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر دہم و دینار دلہن پر نثار کرتا تھا اور اس ترکیب سے عروس کو نوشتہ کے محل تک پہنچایا گیا۔

اُس سے اگلے روز عروس کی طرف سے اُس کے شوہر کے آدمیوں کو روپے اور تحفے بھیجے گئے۔ سلطان نے ان لوگوں میں سے ہر ایک کو زین و لگام کے ساتھ گھوڑے عنایت کیے اور اسی کے ساتھ دوسو سے لے کر ہزار دینار تک کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلیاں ان لوگوں کو بخشی گئیں۔ ملک فتح اللہ نے بھی خواتین کو رنگارنگ لیشمی جوڑے اور سیم و زر کی تھیلیاں بھیجیں اور گانے بجانے والی ظائفوں کو بھی جوڑے اور دہم و دینار عطا کیے۔

ہندوستان میں رسم کچھ اس طرح ہے کہ گانے والوں کو کوئی شخص روپیہ پیشہ نہیں دیتا۔ انھیں جو بھی انعام و اکرام ملتا ہے وہ نوشتہ کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اُس روز سب لوگوں کو کھانا کھلایا گیا اور سلطان نے یہ فرمان نافذ کیا کہ بلاد مالوا و گجرات کھمبایت اور نہروالا کی صوبہ داری امیر سیف الدین کو دی گئی اور ملک فتح اللہ کا مکہ کوہ کو امیر سیف الدین کی نیابت پر مامور کیا گیا۔ سلطان امیر کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا لیکن وہ ایک آزاد مزاج عرب تھا ان سب چیزوں کی قدر نہیں کرتا تھا اور صحرائی تمدن کی درشت مزاجی اُس پر غالب رہی۔ نتیجہ یہ کہ شہائے عروسی کے کچھ دن گزرنے کے بعد اُس کی جہاں دہی کا دن بے نور ہو گیا۔

## انعامات در قحط سالی

جس زمانے میں کہ ولایت ہندوستان میں خشک سالی کا دورہ دورہ ہوا اور قحط اس حد تک آگے بڑھا کہ ایک من گہیوں چھ دینار میں فروخت ہوتا تھا تو سلطان نے

حکم دیا کہ تمام اہل دہلی کو شش ماہ غلہ اور دوسری اجناس شاہی انبار خانے سے مہیا کی جائیں اور ان کی مقدار ایک اور ادھار مل رکھی گئی کہ روزانہ ہر شخص کو چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا آزاد ہو یا غلام، عورت ہو یا مرد شاہی انبار خانے سے دی جاتی تھیں۔ فقہی اور قاضی شہر کے محلوں میں لوگوں کے ناموں کی فہرستیں تیار کرتے تھے اور چھ مہینے تک کام میں آنے والا ذخیرہ اجناس ان کو سوچتے تھے۔

دہلی کی تخریب اور اس کے شہریوں کی آوارہ سازی بادشاہ پر جو اعتراضات ہوتے ہیں ان میں سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ سلطان نے دہلی کے باشندوں کو ان کے شہر سے نکال کر بہت دور پہنچایا اور اس اقدام کا سبب یہ تھا کہ دہلی کے لوگ سلطان کے بارے میں خفیہ خط لکھتے تھے اور اس میں سلطان کو طرح طرح کے فحش کلمات اور بد گوئی سے بھرے فقرات سے یاد کرتے تھے ان پر مہر لگاتے تھے اور لفافے پر یہ لکھ دیتے تھے برائے سلطان عالم نیز یہ کہ اس خط کو کوئی دوسرا نہ پڑھے اور رات کے وقت یہ خط کسی نہ کسی صورت سے سلطانی محل میں بھیج دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ خط بادشاہ کے ہاتھوں میں پہنچتے تھے اور اسی کے نتیجے میں بادشاہ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ دہلی کو ویران کر دے گا اس نے تمام گھروں، حویلیوں اور مندروں کو خرید لیا۔ اور اس شرط کے ساتھ خریدا کہ ان کے مالک انھیں خالی کر دیں۔ اس کے بعد یہ حکم دیا کہ شہر کے تمام آدمی دولت آباد کے لیے کوچ کریں۔ لوگوں نے اس حکم پر عمل نہ کیا۔ حکومت کی طرف سے شہر کے گلی کوچوں میں یہ منادی کرادی گئی کہ تین روز کے اندر اندر اب شہر میں کوئی نہ رہے۔ کافی تعداد میں لوگوں نے اپنا رخت سفر باندھ لیا لیکن کچھ ایسے تھے کہ وہ اپنے گھروں میں چھپ گئے۔ سلطان نے حکم دیا کہ گھروں کی تلاشی لی جائے اور جو لوگ گھروں میں چھپ گئے ہیں ان کو باہر لایا جائے۔ بادشاہ کے غلام دہلی کے کوچہ و بزمین میں پھرے۔ صرف ان کو دو آدمی ملے۔ ایک اندھا تھا اور دوسرا ننگرا۔ دونوں کو بادشاہ کے سامنے لایا گیا حکم دیا کہ جو زمین گچ ہے اسے منجھتیق سے باندھ کر پھینک دیا جائے اور اندھے کے لیے کہا کہ اس کو گھوڑے کی دم سے باندھ دیا جائے اور دولت آباد تک کہ چالیس دن کا راستہ ہے۔ اسی طرح

اُس کو گھسیٹتے ہوئے لے جائیں۔ اس غریب کا پیکر راہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور فقط اُس کا پیر وہاں پہنچا۔

اس واقعہ کے بعد دہلی کے شہریوں نے ترک وطن اختیار کیا اور اپنا مال و اسباب گھروں سے باہر نکال دیا۔ شہر بالکل ویرانہ ہو گیا۔ یہ سب باتیں میں نے اُس شخص سے سنی ہیں جن کی باتوں پر مجھے پورا اعتماد ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن بادشاہ رات کے وقت بالاحصا تک پہنچا اور اس پر چڑھ کر اُس نے دیکھا کہ اس کا تمام پایہ تخت ویران ہے نہ کسی کے گھر میں آگ روشن ہوتی تھی نہ دھواں اُٹھتا تھا۔ لوگوں کے آنے جانے کے کوئی آثار شہر میں بالکل نہ تھے۔ بادشاہ نے کہا کہ اب میرا دل ٹھنڈا ہوا میری خاطر جمع ہوئی اس وقت یہ حکم دیا کہ دوسرے شہر کے لوگ دہلی آجائیں تاکہ یہ شہر دوبارہ آباد ہو جائے لیکن اس حکم نامہ کے نتیجے میں بھی دہلی آباد نہ ہوا اور وہ شہر بھی ویران ہو گئے اس لیے کہ دہلی کی آباد کاری کے بارے میں کوئی یوں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ یہ شہر اپنی وسعت اور عظمت کے لحاظ سے دنیا کے عظیم ترین شہروں میں سے ہے جس وقت کہ ہم اس شہر میں وارد ہوئے اس کا تھوڑا سا ہی حصہ آباد تھا باقی ویران پڑا ہوا تھا۔

اہل ہندو یہاں مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی منطقہ میں زندگی گزارتے ہیں۔ مقابلہ کے وقت غلبہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کا رہتا ہے۔ ہندوستان کے مقامی لوگ، ایسے مواقع پر اُدھر اُدھر جنگلوں، نیتانوں اور پہاڑوں میں جا کر پناہ گزیں ہو جاتے ہیں نیزہ نے ہندوستان میں مجوف نہیں ہوتا کڈا، پھر بانس کے بڑے بڑے پودے نیتانوں میں ایک دوسرے سے گونج گونج رہتے ہیں۔ پہلے جنگل کا ٹو پھران سے جنگ کروا لیا کرتے تھے ان کا کچھ نہیں بنا سکتے کہ دہرے بانسوں میں آگ نہیں لگتی۔ ایک دوسرے کے ساتھ حلقہ در حلقہ ہونے کی وجہ سے انھیں کاٹنا بھی آسان نہیں ہوتا، یہ بہت محکم ہوتے ہیں جو ہندو لوگ ان جنگلوں میں رہتے ہیں وہ ان کے ذریعہ اپنا تحفظ کرتے ہیں اور ان کے میوٹیوں کی چراگاہیں اور ان کے کھیت کھاران جنگلوں یا ان کے آس پاس ہی کہیں ہوتے ہیں وہ بارش کا پانی اکٹھا کر کے ذخیرہ آب تیار وہاں کر لیتے ہیں ان تک دسترس اور ان پر تسلط آسان نہیں۔

## مراسم ولیمہ

ولیمہ کی رسمیں ہندوستان اور شاہی شہر میں کچھ ایسی ہیں کہ کھانا کھانے کے بعد سادات، مشائخ اور قاضیوں کے سامنے ایک خاص طرح کا برتن رکھتے ہیں۔ جس کی شکل چار پاؤں کے کھانے کے برتن سے بہت مشابہہ ہوتی ہے۔ ان کے اوپر کا حقہ کھجور یا ناریل یا ایسے ہی دوسرے درختوں کے خشک پتوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس ٹوکری یا برتنی سی چنگیر میں توڑے کی روٹیاں بٹھا ہوا بکریا بھینڈ اور چار روغنی روٹیاں رکھتے ہیں اور باقی کو ایک خاص طرح کے حلوی سے پُر کرتے ہیں جو تلوں کے تیل، - - - یا شہد سے بنایا جاتا ہے۔ - - اس پر چار برفی کے ٹکڑے رکھتے ہیں اور اس پر ایک چمڑے کا بنا ہوا چھوٹا سا طبق حلوی اور سموسوں سے پُر کر کے رکھتے ہیں کہ اس کی شکل بھی کشتی نما ہو جاتی ہے اور اس کو ریشم کے ایک خوان پوش سے دھکتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے لیے جو اس سے نچلے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ - - - بکری کے بجائے گوشت کی مقدار نصف کر دیتے ہیں اور اسے ذلہ کہتے ہیں اور اسی طرح ان تمام کھانے والوں کو جن کا ذکر اوپر آیا ان کی مقدار ان کے مقابلے میں نصف ہو جاتی ہے اور جو اس سے بھی نچلا طبقہ ہے اسے چوتھائی ملتا ہے بعد ازاں ہر آدمی خوراک کی اس مقدار کو اٹھا لیتا ہے جو اسے پیش کی گئی ہے۔

جب میں نے اس رسم کو پہلے پہل دیکھا تھا تو میں شہر سرای یعنی سلطان کے پایہ تخت میں مقیم تھا اور نیا تھا چونکہ اس سے پیشتر اس سے کوئی واسطہ نہ پڑا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے خادموں سے یہ نہیں کہا کہ جو غذا مجھے کھانا کھانے کے بعد پیش کی گئی تھی وہ بھی اٹھا کر لے چلیں ولیمہ کے کھانے میں سے محترم اشخاص کے یہاں بھی حقہ بھیجا جاتا ہے۔

## مسالک الابصار

مسالک الابصار عربی زبان میں ترتیب دی ہوئی ایک ایسی روداد سفر یا شاہدات پر مبنی سر نوشت ہے جس کا مرتب شہاب الدین احمد عباس ہے۔ یہ روایتیں مصنف کو ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوئیں جو ہندوستان کی سیر کر چکے تھے اور وہی کے کوائف جن کی یادداشتوں میں شامل تھے۔

مرتب نے ایسے اصحاب کے ناموں کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً ابو صفاعر ابن شبلی کی زبانی دہلی والوں کے حالات کا علم ہوا تھا کہ وہ لوگ تیز فہم اور عقل مند ہیں فارسی اور ہندی زبانیں خوب بولتے ہیں ان کی عقلیں تیز اور ذہن صاف ہوتے ہیں ان میں سے اکثر فارسی اور ہندی زبانوں میں شعر بھی کہتے ہیں اور بعض عربی میں بھی شعر کہہ لیتے ہیں۔

اس کا ایک سماعی ماخذ شیخ مبارک کے بیانات بھی ہیں جس سے اُسے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں تلوار، تیرکمان، نیزے اور قسم قسم کے ہتھیار بنانے والے بھی ہیں زرہ اور زین بنانے والے بھی۔ یہاں کے لوگوں میں صاحبِ قلم بھی ہیں اور صاحبِ سیف بھی۔ ابن بطوطہ کے سفر نامے سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے اور ایک سے زیادہ موقعوں پر اس کی روایتیں پیش کی ہیں مثلاً یہ کہ ہندوستان میں ہندو تمام ملک میں مسلمانوں سے ملے جُلے رہتے ہیں۔

کسی راوی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں کو روپیہ پیدا کرنے اور دولت جمع کرنے کا شوق ہے وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ تم نے کتنی روکڑ اکٹھی کر لی ہے۔ لین دین میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔

بعض دوسرے راوی بھی اس کے رشتہ معلومات سے وابستہ ہیں جن کے نام مذکور نہیں لیکن ان کے بیانات اس سلسلہء حروف و حکایات کی زینت ہیں۔۔۔۔۔ مرتب کا کہنا ہے بعض راویوں نے یہ بیان کیا کہ دہلی میں کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہزاروں عمدہ عمدہ غلام سستی قیمت پر نہ بکتے ہوں۔۔۔۔۔ خدمت کرنے والی لونڈیوں کی قیمت دہلی شہر میں آٹھ آنے یا ننگہ سے بھی کم ہے۔

اس میں حافظ ابن تاج ملتانی کا بھی ذکر آیا ہے ناصر الدین محمد قرمزی۔۔۔۔۔ شیخ ابو بکر بن خلال کا بھی اور عبدالکریم غزناطی کا بھی وغیرہ وغیرہ۔  
راقم الحروف نے مسالک الابصار کے ان بیانات کو پروفیسر آغا ہدی حسین کی کتاب سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق سے اخذ کیا ہے۔

آغا صاحب نے اس طرف اشارہ، مقدمہ کتاب میں بھی کیا ہے اور اپنی تصنیف کے باب ہشتم (آٹھواں باب تہذیب اور معاشرت) میں اس کی ان روایتوں کو نقل کیا ہے یہ سلسلہ اس کتاب کے صفحہ ۲۱۲ سے ۲۴۵ تک پھیلا ہوا ہے۔ کتاب کی اشاعت ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد یوپی سے عمل میں آئی۔ اس وقت آغا صاحب آگرہ کالج، ہسٹری ڈپارٹمنٹ سے وابستہ تھے۔



## عظیم الشان سلطنت

(دہلی)

”مسائلک البصار“ میں لکھا ہے کہ سرزمین کی وسعت، دولت کی بہتات، اور لشکر کی کثرت کے اعتبار سے ہندوستان ایسی عظیم الشان سلطنت ہے کہ اس کے مقابلے میں روئے زمین پر کوئی دوسری سلطنت نہیں۔ ہندوستان ایسا ملک ہے کہ جس کے سمندروں سے موتی نکلتے ہیں، جس کی زمین سونا اگلتی ہے، جس کے پہاڑوں میں یاقوت اور الماس کی کانیں ہیں، جس کے درختوں میں عود اور کافور لگتا ہے جس کے شہر بڑے بڑے بادشاہوں کے پایہ تخت ہیں، جس کے وحشی جانوروں میں ہاتھی اور گینڈے جیسے جانور پائے جاتے ہیں، جس کے لوہے سے ہندی تلوار بنتی ہے، جس میں لوہے پارے اور سیسے کی کانیں ہیں، جہاں زعفران کی کاشت ہوتی ہے۔ جس کی بعض وادیوں میں نئے نئے میوے پیدا ہوتے ہیں، جس کی خوبیاں بہت زیادہ ہیں، جس کے نرخ سستے ہیں، جس کی فوجیں بے شمار ہیں اور جس کے شہر اور علاقے بے حد ہیں، جن کے درمیان کہیں ویرانہ نہیں۔

عبدالرحیم قلینشی غرناطی نے تحفۃ الباب میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے پہاڑوں اور جزیروں میں ایسے درخت ہیں جن سے عود اور کافور پیدا ہوتا ہے اور سب طرح کی خوشبوئیں بھی مثلاً لونگ، جاکفل، بادام، الاچی، دارچینی، بیج پات کبابہ، جوتری اور طرح طرح کی جڑی بوٹیاں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں مشک، ہرن بھی ہیں اور طرح طرح کے یاقوت بھی۔

## سدا بہار

”مسالک الابصار“ میں لکھا ہے کہ شیخ مبارک سے پوچھا گیا ”تم نے ہندوستان کو اور اس کے میدلوں کو کیسا پایا؟“ اس نے جواب دیا کہ اس ملک میں دریا ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں۔ چھوٹے بڑے سب ملا کر ہزار ہوں گے۔ بڑائی میں بعض تو دریائے نیل کے برابر ہیں اور بعض اس سے کم ہیں۔ جیسے ہندوستان میں دریا چھوٹے بڑے ہیں ویسے ہی گاؤں اور شہر بھی چھوٹے بڑے ہر انداز کے ہیں۔ اور وہاں بھنگ کی کاشت بھی بہت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ایسے معتدل آب و ہوا والے شہر بھی ہیں جہاں موسموں کا اختلاف نہیں۔ نہ وہاں گرمی ہی زیادہ ہوتی ہے نہ سردی۔ گویا وہاں کا کل زمانہ موسم بہار ہے۔

## پیداوار

ہندوستان میں طرح طرح کے غلے مثلاً گہوں، چاول، جو، چنا، مسور، ماش، لوبیا وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن باقلہ کم پایا جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ باقلہ کی کمی اس سبب سے ہے کہ یہاں حکیم زیادہ ہیں اور حکیموں کے نزدیک باقلہ عقل کو کند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پیشواؤں نے اسے حرام کر دیا ہے۔

ہندوستان میں میوے بھی ملتے ہیں مثلاً انجیر، انگور، انار، جوڑا اور سیٹھا ہوتا ہے۔ بڑالیموں اور کاغذی لیمو، گولر، کالا شہتوت، کھٹھے، کیلے، شنگھالو، نارنگیاں، خرپوزے، تربوز، ککڑیاں، کھیرا اور پھولیں۔ یہ سب ہندوستان کے پھل ہیں۔ مگر انجیر اور انگور بہ نسبت اور میووں کے کم پائے جاتے ہیں ہی ہندوستان میں بھی ہوتی ہے اور باہر سے بھی لائی جاتی ہے امرود اور سیب بھی پیدا ہوتے ہیں،

مگر یہی سے مقدار میں کم پائے جاتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ ہندوستان میں ایسے میوے بھی ہوتے ہیں جو مصر، شام اور عراق میں نہیں ہوتے، مثلاً آم، مہوا، لوکاٹ، کسیر وغیرہ۔۔۔۔۔ اور ناریل تو جسے ہند کا اخروٹ کہنا چاہیے لاجواب ٹر ہے۔ وہ سبز ہوتا ہے اور دودھ سے بھرا ہوتا ہے۔ ناریل اور کیلے دہلی میں اس کی گرد و نواح کی نسبت کم ہیں مگر دہلی میں یہ پھل دس اور سے بہت آتے ہیں۔ دہلی کی نواح میں گنا بہت ملتا ہے اور بہتات کے سبب اس کی بے قدری ہے۔ ایک قسم کا کالا گنا بھی ہوتا ہے، جس کا چھلکا کم سخت ہوتا ہے، وہ جو سننے ہی کے مصرف کا ہے۔ رس نکالنے کے مطلب کا نہیں۔ اس قسم کے گنے کا مول تول کھیت پر نہیں ہوتا۔ باقی قسم کے گنوں سے گڑ بنتا ہے جو مصری سے سستا ہوتا ہے اور جس سے پورا بنتا ہے۔ اس میں مٹھاس کم ہوتی ہے۔ اور دیکھنے میں سفید میدا سا معلوم ہوتا ہے۔ دہلی کی نواح میں چاول بھی ملتے ہیں اور وہاں شلم، گاجر، کرو، بیکن، ہلیون، سونٹھ، کی بھی پیداوار ہے۔ سونٹھ جب سبز ہوتی ہے تو لوگ اسے گاجر کی طرح پکاتے ہیں۔ مزے میں لاجواب ہوتی ہے۔ وہاں چقدر بھی ہوتا ہے۔ سیم کی پھلیاں بھی اور پودینہ بھی اور قسم قسم کے پھول بھی جیسے گلاب، نیلوفر، بنفٹہ، بید سادہ، نرگس اور گل مہندی۔۔۔۔۔ روغن زیتون وہاں نہیں پیدا ہوتا، باہر سے آتا ہے۔ شہد کثرت سے پایا جاتا ہے۔ شمعیں صرف بادشاہ کے محل میں جلتی ہیں۔ ہر شخص ان کو آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا۔

## جانور اور پرندے

چرنے والے جانور جیسے گائیں، بھینسیں، بھیتریں، بکریاں بے شمار ہیں اور پرندے

لہ ایک گھاس کا نام ہے۔ جس کا بیج دوا میں پڑتا ہے فارسی میں اسے مارچوبہ کہتے ہیں۔

مثلاً مرغ اور کبوتر بھی بڑی کثرت سے ہیں، سوائے بطخ کے جو کم پائی جاتی ہے۔ بہت سی قسم کے پرندے تو ایسے ہیں جنہیں کوئی مفت بھی نہیں پوچھتا۔ ہندی مرغ بڑے جتنے کا پرندہ ہے۔ اور اپنے بڑے جتنے کے سبب بطخ کے مانند معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب پرند بہت سستے بکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ابن بطوطہ سفنقورا اور گینڈے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ ”سیوستان یعنی سیہوان کے باشندے سفنقور یا ریگ ماہی کھاتے ہیں۔ یہ جانور پیروں پر چلتا ہے اور گوہ کے مشابہ ہوتا ہے لیکن اس کے دم نہیں ہوتی۔ وہاں کے لوگ ریت سے کھود کر اسے نکالتے ہیں اور اس کا پیٹ چیر کر صاف کر کے اس میں بجائے زعفران کے ہلدی بھر دیتے ہیں۔ مجھے اس جانور کو دیکھ کر گھن آگئی اور میں نے اسے نہیں کھایا، اس نے ہندوستان کے جنگلوں میں کئی مرتبہ گینڈے دیکھے۔ پہلی مرتبہ دریائے سندھ کے قریب ایک بانس کے جنگل میں دیکھا۔ دوسری مرتبہ اس وقت دیکھا جب کہ وہ بادشاہ کی سواری کے ساتھ کسی اور بانس کے جنگل میں چلا جا رہا تھا۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھا اور ابن بطوطہ بھی ہاتھی پر سوار تھا۔

## ہاتھی اور گھوڑے

سفر نامے میں ہاتھیوں اور گھوڑوں کا بھی ذکر ہے مگر اس بارے میں مسالک الا بصار میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہتر ہے۔ اس میں شیخ مبارک کی زبانی لکھا ہے ”کہ سلطان محمد ہر سال چار ہزار داغ لگاتے ہوئے عربی گھوڑے تقسیم کرتا ہے جن میں کچھ تو مع زین اور مع لگام کے ہوتے ہیں اور کچھ بغیر زین اور بغیر لگام کے۔ جو گھوڑے مع زین اور مع لگام کے دئے ہیں ان میں اکثر صرف زین پہنے ہوتے ہیں۔ بعض زیور سے بھی آراستہ ہوتے ہیں۔ بعض کے زین پوتوں پر سونے کا کام کیا ہوا ہوتا ہے اور بعض زین پوش پر چاندی کا۔ تاتاری گھوڑوں کا جنہیں بادشاہ تقسیم کر دیتا ہے کوئی

حساب ہی نہیں۔ ان کی ٹکڑیاں کی ٹکڑیاں دے دی جاتی ہیں، یا سیکڑے کے سیکڑے بخش دئے جاتے ہیں۔ گھوڑے ہندوستان میں بکثرت ہیں اور باہر سے بھی بڑی تعداد میں آتے ہیں، پھر بھی بادشاہ ملکوں ملکوں سے بڑی قیمتیں دے دے کر انہیں منگواتا ہے اور بطور عطیہ و تحفے کے دے ڈالتا ہے۔ گھوڑوں کا نرخ ہندوستان میں چڑھا ہوا ہے اور گھوڑوں کی تجارت کرنے والے خوب روپیہ کما لیتے ہیں۔“

”مسالک الابصار“ میں شیخ مبارک ہی کی زبانی ایک اور مقام پر یہ لکھا ہے کہ یوں تو گھوڑے بہت قسم کے پائے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر جن گھوڑوں کی عادتیں اچھی ہوتی ہیں جن کے کرتب قابل تعریف ہوتے ہیں وہی سب سے اعلیٰ اور اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے گھوڑے ہندوستان میں ترکستان کے ان تمام علاقوں سے لائے جاتے ہیں جو ہندوستان کے آس پاس ہیں۔ عربی گھوڑے ہندوستان میں بحرین سے، یمن سے اور عراق سے لائے جاتے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان کے اندر بھی بڑے قیمتی قیمتی اور اچھی نسل والے عربی گھوڑے پائے جاتے ہیں۔ مگر بہت کم اور جب کبھی ہندوستان میں عربی گھوڑوں کو رہتے ہوئے بہت زمانہ گزر جاتا ہے تو ان کی نسل میں خلل آ جاتا ہے۔۔۔۔۔ بیل کی ناک میں چھید کر کے نکیل ڈال، دیتے ہیں اور پھر اس پر لادنا شروع کرتے ہیں۔ بیل چوڑے چوڑے قدم رکھتا ہے، اور جلدی جلدی چلتا ہے۔

بحرین کے ایک امیر علی بن منصور عقیلی کی زبانی شہاب الدین احمد عباس نے یہ سنا کہ ہندوستانیوں نے اچھے گھوڑوں کی ایک خاص پہچان مقرر کر رکھی ہے، اسی پہچان سے گھوڑوں کو پسند کرتے ہیں، اور جس قیمت کا ملتا ہے خرید لیتے ہیں۔“

”مسالک الابصار“ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں عام سواری کا جانور گھوڑا ہی ہے۔ سواری کے وقت عام لوگ اس پر جھول ڈال لیتے ہیں، اور خاص لوگ

اس کو چاندی کے زیور پہناتے ہیں۔ ہاتھی کی سواری بادشاہ کے لیے مخصوص ہے۔ شیخ مبارک کا اندازہ ہے کہ شاہی ہاتھیوں کی فوج میں کم و بیش تین ہزار ہاتھی ہوں گے جن کے لیے ایک صوبہ کی آمدنی بھی کافی نہیں ہوتی۔ جب مسالک الالبصار کے مولف نے مصارف کی ٹھیک ٹھیک رقم دریافت کی تو شیخ نے کہا ”بات یہ ہے کہ ان ہاتھیوں کی جنسیں مختلف ہیں، شکلیں مختلف ہیں اور اسی طرح سے ان کی خوراکیں بھی مختلف ہیں۔ ایک ہاتھی ایک دن میں بیس سیر چاول تیس پیر جو اور دس سیر گھی اور آدھا گٹھر گھاس کھا لیتا ہے۔ اپنی غذا ملنے پر ہاتھی بھاری بھاری بوجھ اٹھانے اور بڑے بڑے کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے“

## ہندوستان کی دولت اور خزانے

”مسالک الالبصار“ کے راوی ہندوستان کی دولت کو اور سلطان محمد کی بخششوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ ایک نے لکھا ہے ”کہ سلطان محمد اس قدر خرچ کرتا ہے مگر اس کے ملک کی آدمی آمدنی بھی صرف نہیں ہوتی۔ اسی راوی نے لکھا ہے کہ سلطان محمد کے باپ نے کوئی ریاست فتح کی تھی جس کے ذریعہ اس قدر سونا ہاتھ لگا تھا کہ کہ تیرہ ہزار بیلوں پر لاد کر لایا گیا تھا“

شیخ برہان الدین ابو بکر بن کلہ محمد بزمی صوفی کا بیان ہے کہ ”سلطان محمد بن تغلق نے ایک مرتبہ دیوگرھ کے قریب کسی شہر پر دھاوا کرنے کی غرض سے لشکر بھیجا۔ دیوگرھ میں ہندو رہتے ہیں اور وہاں کے حاکم رائے کہلاتے ہیں۔ جب اس علاقے کا راہ نشاہی لشکر کے مقابلے سے عاجز ہو گیا تو اس نے بادشاہ کی خدمت میں یہ کہلا بھیجا ”اگر بادشاہ مجھے امن سے رہنے دے اور میرا علاقہ چھوڑ کر اپنے پایہ تخت کو واپس چلا جائے تو جتنی دولت وہ مجھ سے چاہے میں اس کے پایہ تخت تک بھیج دینے کو تیار ہوں۔ میرے پاس بادشاہ صرف بار برداری کے جانور بھیج دے ان پر خزانہ

لاڈکر میں اس کے ملک میں روانہ کر دوں گا“ جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ لڑائی بند کر دی جائے اور راجہ کو صحیح سالم ہمارے دربار میں لایا جائے۔ جب راجہ بادشاہ کی خدمت میں آیا تو بادشاہ نے اس کا بڑا احترام کیا اور کہا ”یہ تو بتاؤ کتنا روپیہ جانوروں پر لاڈ کر تم میرے پاس بھیج سکتے ہو“ رائے نے جواب دیا۔ ”مجھ سے پہلے اس گدی پر سات راجہ اور بیٹھ چکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے ایک خزانہ چھوڑا ہے۔ ہر خزانہ ستر بیس لاکھ ہے اور یہ سب خزانے اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہ سن کر بادشاہ خوش ہوا اور اس نے حکم دیا کہ ان سب خزانوں پر شاہی مہر لگا دی جائے۔ پھر اس نے راجہ سے کہا تم دہلی چل کر رہو اور اس علاقے میں اپنے نائب اور والی مقرر کر دو۔ اور بہتر یہ ہے کہ اسلام بھی قبول کر لو۔ راجہ نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تو بادشاہ نے اس کو اپنے قدیم مذہب پر رہنے کی اجازت دے دی۔ راجہ نے اپنے علاقے کے انتظام کے لیے حاکم مقرر کر دئے اور خود بادشاہ کے ساتھ چلا گیا اور اس کے دربار میں رہنے لگا۔ بادشاہ نے راجہ کے لیے ایک معقول رقم مقرر کر دی اور اس کے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ چوں کہ اب راجہ کے (علاقے کے) آدمی بادشاہ ہی کی رعایا بن گئے تھے اس لیے بادشاہ نے بہت سی رقم ان کے درمیان تقسیم کیے جانے کی غرض سے وہاں بھیج دی مگر بادشاہ نے بیس بیس میں سے یعنی راجہ کے خزانوں میں سے کچھ صرف نہیں کیا۔ ان سب کو شاہی مہریں لگا کر چھوڑ دیا۔

## ہندوستانیوں کے اخلاق اور عادتیں

”مسالک الا بصار“ میں لکھا ہے کہ ”ہندوستان کے باشندے نہایت تیز عقل مند

۱۰۔ بیس سے ایک بڑا حوض مراد ہے جس کے اندر اترنے کے لیے چاروں کونوں پر سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں۔

اور ہنرمند ہیں، اور سب قوموں کے مقابلے میں اپنے نفسوں پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں، اور اپنے معبودوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سب سے زیادہ قربانیاں کرتے ہیں۔ محمد بن عبدالرحیم قلینشی غرناطی نے "تحفۃ الباب" میں لکھا ہے کہ ہندوستانی علوم و فنون کے اعتبار سے دنیا بھر میں سب سے زیادہ ماہر ہیں۔ طب میں بھی ریاضی میں بھی اور طرح طرح کی صنعتوں اور کاریگریوں میں بھی۔

ابوصفا عمر شبلی کا بیان ہے کہ ہندوستانی خوب ہیں وہ نہ شراب پیتے ہیں نہ اور کسی نشیلی چیز کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ تو پان ہی کھا کھا کر اپنا جی خوش کر لیتے ہیں۔ اور پان ہے بھی عمدہ چیز اور حلال بھی ہے۔ اس میں حرام کا کوئی شبہ تک نہیں۔ پھر لطف یہ کہ پان کے اندر بہت سے مصالح پڑتے ہیں جو بہت ہی مزے کے ہوتے ہیں۔ شراب میں تو ایسے ذائقے کی ایک چیز بھی نہیں ہوتی۔ علاوہ ذائقے دار مصالحوں کے پان میں اور چند خوبیاں ہیں۔ اول تو اس کے کھانے سے منہ میں خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے کھانا جلد ہضم ہوتا ہے۔ تیسرے سانس کی آمد و رفت میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ دل کو فرحت ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ پان کے کھانے سے نہ عقل بگڑتی ہے نہ ذہن خراب ہوتا ہے نہ کھانوں کا مزا زائل ہوتا ہے۔ پان میں چھالیہ ڈال کر خاص طور سے اس کی گھوریاں بنائی جاتی ہیں۔ خاطر تواضع کے موقعوں پر ہندوستان میں پان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ یہاں تک کہ مہمان کی خاطر میں کھانے پینے کی کل نعمتیں ٹھایاں، شربت، پھول اور خوشبوئیں وغیرہ غرض دنیا کی کل اچھی چیزیں موجود کر دی جائیں مگر پان نہ دیا جائے تو ایسی مہمانی، ذکر اور قابل قدر نہیں سمجھی جاتی اور مہمان بھی یہ سمجھتا ہے کہ میری کچھ عزت ہی نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے رئیس اپنی محفلوں میں جب کسی کو سرفراز کرنا چاہتے ہیں تو اس کو اپنے ہاتھ سے پان دیتے ہیں۔

ولایت میں شراب یا کھجور جس کا یہ دستور تھا کہ رئیس اپنے اپنے دیوان قانون میں پیالوں کے اندر شراب یا کھجور بھرا کر رکھ لیتے تھے جس کسی کی عزت



بڑھائی جانی منظور ہوتی تھی اس کے سامنے شراب کا یا کھجور کا پیالہ پیش کر دیتے تھے۔ رییسوں کے علاوہ معمولی درجہ کے آدمیوں میں بھی میں ہی رسم تھی اور چھوٹے بڑے سب اسی قسم کی خاطر داری کو انتہا درجے کی خاطر تواضع سمجھتے تھے۔“

جب ابن بطوطہ سلطان محمد کے محل میں پہنچا اور وہاں اس کی خاطر تواضع ہوئی تو اور بہت سی کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ ہزار پان آئے اور بہت سی چھالیاں آئیں۔

جب وہ دولت آباد سے چل کر احاطہ زمینی میں مالا بار میں پہنچا تو وہاں اُس نے برہمن اور کھتری ذات کے ہندوؤں کو دیکھا۔ سفر نامہ میں لکھا ہے کہ ”مالا بار کے باشندے اکثر مرہٹے ہیں دستکاری میں مشہور ہیں۔ وہ طبیب اور منجم بھی ہیں۔ اچھا علم اور بڑی واقفیت رکھتے ہیں۔ شریف مرہٹے برہمن اور کھتری ہوتے ہیں۔ چاول، سبزی اور سرسوں کا تیل ان کی غذا ہے۔ گوشت بالکل نہیں کھاتے کسی حیوان کو تکلیف نہیں دیتے۔ کھانے سے پہلے اسی طرح غسل کرنا لازمی سمجھتے ہیں جس طرح مسلمان خلوت کے بعد اپنے قریبی رشتہ داروں میں جب تک کہ سات پشتوں کا فرق نہ ہو جائے شادی بیاہ نہیں کرتے۔ شراب پینا سخت عیب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان شراب پی لیتا ہے تو اس کے انٹی کوڑے لگائے جاتے ہیں اور تین دن تک ایک تہ خانے میں قید کر دیا جاتا ہے، جسے سوائے کھانے کے وقت کے کبھی نہیں کھولتے“

”مسالک الابصار“ کے مولف شہاب الدین احمد عباس نے ابو صفاء عمر ابن شبلی کی زبانی دہلی والوں کے ذکر میں لکھا ہے کہ ”وہ لوگ تیز اور عقل مند ہوتے ہیں۔ فارسی اور ہندی زبانیں خوب بولتے ہیں۔ ان کی عقلیں روشن اور ذہن صاف ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر فارسی اور ہندی زبانوں میں شعر بھی کہتے ہیں۔ اور بعض عربی میں بھی شعر کہہ لیتے ہیں۔ اور اچھے شعر کہتے ہیں۔ بہتیرے ایسے ہیں جو بادشاہ کے وظیفہ خوار نہیں ہیں، پھر بھی بادشاہ کی مدح میں وہ شعر کہتے ہیں۔ بادشاہ ان سے خوش ہوتا ہے اور

انہیں انعام دیتا ہے“

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ ”ہندوستان میں تلوار، کمان، نیزے اور قسم قسم کے ہتھیار بنانے والے بھی۔ ہیں۔ زرہ اور زین بنانے والے بھی اور ان سب کے علاوہ مختلف قسم کے کام کرنے والے مرد بھی ہیں، اور عورتیں بھی صاحب شمشیر بھی ہیں اور صاحب قلم بھی“

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ”ہندوستان میں ہندو تمام ملک میں مسلمانوں سے ملے جلے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ بہت سے ہندو دشوار گزار پہاڑوں اور بانسوں کے جنگلوں میں حفاظت کی جگہ دیکھ کر رہتے ہیں۔ بانس فصیل کا کام دیتے ہیں۔ اس کے اندر ان کے مویشی اور کھیت ہوتے ہیں۔ اور بارش کا پانی جمع کیا ہوا ہوتا ہے“

## ہندو دولت مند ہیں اور انہیں روپیہ جمع کرنا ہی عادت ہے

”مسالک الابصار کے ایک راوی کا بیان ہے کہ ”ہندوؤں کو روپیہ پیدا کرنے اور جمع کرنے کا شوق ہے۔ جب وہ آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں ”کہو تم نے کتنی روکڑا کھٹی کر لی“ کوئی کہتا ہے کہ میرے گھرانے میں میرے دادا کے وقت سے روپیہ جمع ہو رہا ہے اور میں روپیہ جمع کرنے والوں کی دوسری پشت میں ہوں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ ”میرے خاندان میں میرے پردادا کے وقت سے روپیہ جمع ہوتا چلا آیا ہے اور میں روپیہ جمع کرنے والوں کی تیسری پشت میں ہوں۔ جو روپیہ کئی پشتوں سے جمع ہوتا آ رہا ہے اس کا شمار کیا بتاؤں“ ہندوؤں کی عادت ہے کہ روپیہ جمع کرنے کی غرض سے اپنے گھروں میں گڑھا کھود لیتے ہیں۔ دیواروں میں موکھے سے بنا لیتے ہیں جن کا منہ بند کر دیتے ہیں، بس ایک چھوٹا سا سوراخ کھلا رہنے دیتے ہیں جس کے ذریعے اس میں روپیہ ڈال تو سکیں مگر نکالنا ممکن نہ ہو۔ اور لین دین کے وقت وہ بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اس خوف سے کہ

کہیں کھوٹا مال نہ آجائے۔ وہ نہ تو چاندی سونے کی بنی ہوئی چیز لیتے ہیں اور نہ ٹکڑے لیتے ہیں تو چاندی سونے کے سکے لیتے ہیں۔ ہندوؤں کی بعض بستیوں میں یہ دستور ہے کہ جب کسی گھر میں اشرفیوں کی ایک دیگ بھر جاتی ہے تو گھر کا مالک چھت کے اوپر ایک جھنڈا گاڑ دیتا ہے۔ اس طرح سے دس دس جھنڈیاں تک گڑ جاتی ہیں بعض مکانوں کی چھتوں پر دس سے بھی زیادہ جھنڈیاں ہیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں“

## غلام

”مسالک الابصار“ کے مصنف شہاب الدین احمد عباس نے لکھا ہے کہ ”سلطان محمد جنگ سے اس قدر قیدی گرفتار کر کے لاتا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ دہلی میں ہزاروں عمدہ عمدہ غلام سستی قیمت پر نہ بکتے ہوں۔ مجھ سے راویوں نے بھی بیان کیا کہ خدمت کرنے والی لونڈی کی قیمت دہلی شہر میں آٹھ ٹنکے سے زیادہ نہیں ہے اور جو لونڈیاں خانہ داری کے مطلب کی ہوتی ہیں ان کی قیمت پندرہ ٹنکے اور بعض کی بیس ٹنکے یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے“ لیکن حافظ ابن تاج ملتانی نے راوی پر اعتراض کیا اور کہا کہ جب ہندی لونڈیوں کی قیمت اتنی زیادہ ہے تو پھر وہ سستی کہاں سے ہوئیں؟ راوی نے جواب دیا کہ ان کی خوب صورتی کی وجہ سے اور بھلی عادتوں کے سبب ہر شخص خریدنے کے لیے ان پر گزرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ میں ہی خرید لوں۔ اس سبب ان کا بھاؤ تیز ہو جاتا ہے۔ ان لونڈیوں میں یہ بھی خوبی ہوتی ہے کہ اکثر پڑھی لکھی اور قرآن کی حافظ ہوتی ہیں اور مذہب سے بھی واقف ہوتی ہیں اور حدیث سے بھی سینکڑوں شعرا انھیں حفظ یاد ہوتے ہیں۔ اور حدیثیں ان کی نوک زبان ہوتی ہیں۔ وہ گانے بجانے میں یکتا ہوتی ہیں۔ اور شطرنج اور چوہر خوب کھیلتی ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ جب آپس میں اپنے ہنر بیان کرتی ہیں تو

ایک کہتی ہے ” میں تین دن میں اپنے مالک کے دل کو مٹھی میں لے لوں “ دوسری کہتی ہے ” واہ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ بہن — میں تو دو ہی دن میں اُس کے دل میں گھر کر لوں : تیسری کہتی ہے ” اجی . تمہاری بات بھی کچھ نہیں . میں تو گھڑی بھر میں اس کے دل پر قبضہ کر لوں “ چوتھی کہتی ہے . ” واہ بھینا . یہ بھی کیا کمال ہوا ! مجھے تو اپنے مالک کے دل پر قابو کرنے میں بس اتنی دیر لگے جتنی کہ پلک جھپکانے میں لگتی ہے “

ابن بطوطہ نے لونڈیوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ” مسالک الابصار “ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جو لونڈیاں لوٹ میں آتی ہیں وہ ہندوستان میں بہت سستی ملتی ہیں۔ کیوں کہ وہ صاف ستھری نہیں ہوتیں۔ تہذیب سے واقف نہیں ہوتیں۔ مگر یہاں سیکھی سکھائی لونڈیاں بھی سستی ہوتی ہیں اس لیے لوٹ کی لونڈیوں کوئی نہیں خریدتا۔

## ہندو عورتیں

” مسالک الابصار “ میں لکھا ہے کہ عام طور سے ہندوستان کی عورتوں کو ترکی اور قبچاتی عورتوں کی نسبت زیادہ حسین اور ملیح بتایا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حسن و ملاحظت کے علاوہ بعض خوبیاں ہندی عورتوں میں ایسی ہیں جو کسی اور ملک کی عورتوں میں نہیں پائی جاتیں۔ ہندوستان کی اکثر عورتیں سبزہ رنگ ہوتی ہیں اور بعض گورے رنگ کی ہوتی ہیں۔ اُن کے گورے رنگ میں سرخی جھلکا کرتی ہے۔ اور باوجودیکہ لوگوں کے پاس ترکی، قبچاتی، رومی اور ہر صنف کی عورتیں موجود ہیں مگر ان میں سے کوئی حسن و خوبی میں ہندی عورت کو نہیں پہنچتی۔ میرے خیال میں دنیا کے کسی خطے کی عورت ہندی عورت کے مقابلے میں بڑھ نہیں سکتی، اور بڑھ سکتی ہے تو ہندی عورت سے کوئی ہندوستان ہی کی عورت بڑھ سکتی ہے۔ یہ عورتیں تمام دنیا کی

عورتوں سے صرف حسن و حلاوت ہی میں بڑھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ان میں اور بے شمار خوبیاں ہیں جن کے لیے تحریر کے دامن میں گنجائش نہیں۔

## ستی

ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد ابن بطوطہ ملتان سے اجودھن ہوتا ہوا سرستی اور ہانسی کی طرف جا رہا تھا راستے میں اس نے ایک عورت کے سستی ہونے کی خبر سنی۔ اس کا بیان ہے کہ ”ایک“ دو دفعہ میں نے دیکھا کہ ایک ہندو عورت بناؤ سنگار کیے ہوئے گھوڑے پر چڑھی چلی جاتی تھی۔ ہندو مسلمان اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ آگے آگے نوبت بجاتی جاتی تھی۔ برہمن لوگ بھی ساتھ ساتھ تھے۔ ایسا اتفاق ہوا کہ میں ابوہر میں تھا ابوہر کے اکثر باشندے ہندو ہیں۔ اس کا حاکم سامرہ قوم کا مسلمان تھا۔ ابوہر کے نواح میں نافرمان ہندو رہتے تھے ایک دفعہ انھوں نے رہزنی کی۔ ابوہر کا حاکم ہندو مسلمانوں کے ایک دستے کو ساتھ لے کر ان سے لڑنے کو گیا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ بادشاہ کی فوج کے ساتھ ہندو مارے گئے۔ ان میں سے تین کی عورتیں تھیں۔ عورتوں نے سستی ہونے کا ارادہ کیا سستی ہونے سے تین دن پہلے وہ گانے بجانے اور کھانے پینے میں مشغول ہو گئیں۔ ان کے پاس ہر طرف سے عورتیں آنے لگیں اور ان سے مل کر رخصت ہونے لگیں۔ چوتھے دن صبح کو ان کے پاس گھوڑے لائے گئے۔ ہر ایک بیوہ بناؤ سنگار کر کے اور خوشبو میں لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ناریل تھا جس کو اچھالتی چلی جاتی تھی اور بائیں ہاتھ میں آئینہ تھا جس میں منہ دیکھتی جاتی تھی۔ برہمن اس کے ارد گرد جمع تھے اس کے رشتے دار اس کے ساتھ تھے آگے آگے نکارے بجنے جاتے تھے ہر ایک ہندو آگے بڑھ بڑھ کر اس سے کہتا تھا کہ ”میرا سلام میرے ماں باپ کو، اور فلاں فلاں دوست کو کہنا۔ وہ کہتی تھی ”اچھا“ اور منہستی جاتی

تھی۔ میں بھی اپنے دوستوں کو لے کر اسی طرف چلا۔ تین کوس نکل گئے تو ایک ایسی جگہ آئی جہاں بیچ میں چار گنبدوں تھے۔ ہر گنبدوں میں ایک ایک بت رکھا تھا۔ گنبدوں کے بیچ میں پانی کا حوض تھا جس پر درختوں کے سایہ کے سبب دھوپ نہ پڑتی تھی۔۔۔۔۔ جب یہ عورتیں ان گنبدوں کے پاس پہنچیں تو حوض میں اتر کر انہوں نے غسل کیا اور غوطہ لگایا اور اپنے کپڑے اور زیور اتار کر علیحدہ رکھ دئے۔ صرف ایک موٹی ساڑھی باندھ لی۔ اس وقت حوض کے پاس نشیب میں آدھکا دی گئی جس پر برسوں کا تیل ڈال دیا گیا شعلے اٹھنے لگے۔ پندرہ ایک آدمی لکڑی کے بندھے ہوئے گھٹے لیے ہوئے تھے اور دس ایک آدمی لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے تھامے کھڑے تھے۔ نقارے اور نفیری والے بیوہ کے انتظار میں تھے۔ آگ کو ایک چادر کے اوٹ میں کر لیا گیا تھا تاکہ ان عورتوں کی نظر نہ پڑے۔ ایک عورت نے بڑھ کر زبردستی چادر کو چھین لیا۔ کہنے لگی، کیا میں جانتی نہیں کہ یہ آگ ہے مجھے ڈرانے ہو، پھر اس نے آگ کو ڈنڈوت کی اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کے اندر جا پڑی۔ عورت کا آگ میں گرنا تھا کہ نقاروں کا شور اٹھا اور نفیریاں بجنے لگیں۔ لوگوں نے تیلی لکڑیاں جو ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے آگ میں ڈالنی شروع کیں اور اوپر سے بڑے بڑے کندے ڈال دئے تاکہ وہ عورت ہل بھی نہ سکے۔ دیکھتے والے چیخ اٹھے میں عورت کو جلتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ بے ہوش ہو گیا۔ گھوڑے پر سے گرنے کو تھا کہ مجھ میرے دوستوں نے سنبھال لیا۔۔۔۔۔“

## غمی کی رسمیں

ابن بطوطہ کو دہلی میں آئے ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا کہ ایک سہمی کا انتقال ہو گیا اس کفن دین کا بڑا اہتمام کیا گیا۔ بادشاہ اس وقت دارالمنانے میں نہ تھا۔ وزیر کو خبر ہوئی تو پہلے تو اس نے پالم دروازے کے باہر ایک خانقاہ میں قبر کی جگہ تجویز کی اور اس کے بعد بادشاہ

کو لکھا۔ بادشاہ کا جواب دوسرے دن شام کو آ گیا۔ سفر نامے میں لکھا ہے کہ ”ہندوستان میں تیسرے دن صبح ہوتے ہی میت کی قبر پر جاتے۔ اور قبر کی ارد گرد ریشمی کپڑے اور گدے بچھاتے ہیں اور قبر پر پھول رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ نارنج اور لیموں کی ٹہنیاں بھی مع پھلوں کے قبر پر رکھتے ہیں۔ اگر ان میں پھل موجود نہ ہوں تو دھاگے کے ذریعے سنے میووں کے دانے ان میں لگا دیتے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے قرآن مجید کی جلدیں لے جاتے ہیں اور قبر کے گرد بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ جب قرآن خوانی ہو چکتی ہے تو شربت پلایا جاتا ہے۔ گلاب لان پر چھڑکا بھی جاتا ہے۔ پھر انھیں پان دے جاتے ہیں۔“

## شادی کی رسمیں

سفر نامے میں شادی کا یہ دستور لکھا ہے کہ ”جس مکان سے دوہا دلہن کو اپنے گھر لاتا ہے اس مکان کے دروازے پر دلہن کی جماعت کھڑی ہو جاتی ہے جب دوہا کی جماعت آتی ہے تو دلہن والے دوہا والوں کو داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ اگر دوہا والے غالب آجاتے ہیں تو چلے جاتے ہیں اگر مغلوب ہو جاتے ہیں تو انھیں ہزاروں روپے دینے پڑتے ہیں۔ دوہا کے سر پر سہرا باندھا جاتا ہے۔ جب دوہا والے برات لے کر دلہن کے مکان میں داخل ہو جاتے ہیں تو دوہا اور دلہن دونوں کو ایک مقام پر لاکر بٹھا دیا جاتا ہے۔ وہاں عورتوں کا مجمع ہوتا ہے۔ گانے والی عورتیں بھی بیٹھی ہوتی ہیں۔ اس وقت دلہن اپنے ہاتھ سے دوہا کو پان دیتی ہے، اور دوہا کے عزیزوں پر سے روپے پیسے لٹائے جاتے ہیں۔ عورتیں اللہ اکبر کے نعرے لگاتی جاتی ہیں اور کاتی بھی جاتی ہیں۔ باہر نقارے بجتے رہتے ہیں۔ پھر دوہا دلہن کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور دلہن دوہا کے پیچھے پیچھے ہو لیتی ہے۔ دوہا گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور دلہن ڈولے میں بیٹھ جاتی ہے۔ اس وقت ان دونوں پر سے روپے پیسے نچھاور

کے جاتے ہیں۔ براتی کچھ تو گھوڑوں پر ہوتے ہیں اور کچھ پیدل۔ جس امیر کے دروازے سے برات گزرتی ہے وہی باہر نکل کر اس پر سے سگے نیچھا اور کرتا ہے دوسرے دن دہن کے گھر سے دولہا کے دوستوں کے گھر کپڑے مع کچھ نقدی کے بھیجے جاتے ہیں۔ دعوت ہوتی ہے: "یہ طریقے ابن بطوطہ نے محل سرا کی ایک شادی میں دیکھے۔ عام شادیوں میں بھی کم و بیش ایسی ہی رسمیں ہونگی۔"

## پردہ

سفر نامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پردہ اکثر ہندوؤں اور بعض مسلمانوں میں نہ تھا۔ اس بات کی تائید پدماوت سے۔ فتوحات فیروز شاہی سے۔ اور تاریخ فرشتہ سے ہوتی ہے۔ محل سرا کی جس برات میں ابن بطوطہ شریک ہوا اس میں دولہا دہن کی سواری کے ساتھ عورتیں بھی براتیوں میں شامل تھیں۔ بعض تو گھوڑوں پر بیٹھی جا رہی تھیں اور بعض پیدل چل رہی تھیں۔ برات ہر ایک امیر کے دروازے پر رک جاتی تھی اور گھر کا مالک باہر نکل کر برات پر۔ نیچھا اور کرتا تھا۔ دوسرے مقام پر ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "اس ملک میں عورتیں ڈولیوں میں آتی جاتی ہیں۔" ابن بطوطہ نے ڈولی کا جو علیہ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پالکیوں کا رواج تھا۔ جس میں بعض وقت مرد بھی بیٹھ جاتے تھے اور جسے آٹھ آدمی مل کر اٹھاتے تھے۔ آج کل کی ڈولی جسے دو ہی آدمی اٹھالیں ان دنوں معدوم تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ عام عورتیں بازار میں پیدل چلتی تھیں۔ پالکیوں میں صرف حاکموں، رئیسوں اور امیروں کی بیگمات وغیرہ رہتی تھیں۔



## پوشاک

مسالک الالبصار میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کا پہناوا زیادہ تر سفید لباس ہے۔ رنگین اور اونی کپڑے جیسے باناٹ، منخل، شال وغیرہ باہر سے لائے جاتے ہیں اور یہاں چوگنی پیچگنی قیمت پر بکتے ہیں۔ علماء، اولیا، اور درویش زیادہ تو اونی کپڑے پہنتے ہیں۔ اور بادشاہ، خان، ملک اور فوج کے سب افسر سر سے پاؤں تک تاتاری کپڑے پہنتے ہیں۔ ان کے بدنوں پر اسلامی طریقے اور خوارزمی فیشن کی قبائیں ہوتی ہیں جو کمر پر سے تنگ ہوتی ہیں۔ ان کے سروں پر پانچ چھ گز کپڑے کی پگڑیاں ہوتی ہیں جو ان کے لمبے قدوں پر چھوٹی معلوم ہوتی ہیں۔ پگڑیوں کو عمامہ کہنا موزوں نہیں ہے۔ ناصر الدین محمد چشتی جو زمر دی کے لقب سے مشہور ہے۔ اور جو دومرتبہ ہندوستان آ جا چکا ہے اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے دربار میں رہ چکا ہے۔ کہتا تھا کہ ہند میں ہمہ شما تو عام طور سے سفید لباس پہنتے ہیں مگر خاص خاص لوگ افسر اور عہدے دار وغیرہ تاتاری ملکوں کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں جن پر سنہری کام کیا ہوا ہوتا ہے۔ بعضوں کے لباس میں سب جگہ نہیں تو صرف آستینوں پر کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ بعضوں کے لباس میں مغلوں کی طرح پیٹھ پر اور گلے کے چاروں طرف چوڑا چوڑا زردوزی کا کام ہوتا ہے۔ گلے پر جو کام کیا جاتا ہے سونے جواہرات سے سجایا جاتا ہے یا قوت اور ہیرے ٹانگے جاتے ہیں۔ ان کے سر کے بالوں کی لمبائی آگے سے گندھی اور بٹی ہوئی ٹٹکتی رہتی ہیں۔ جس طرح سے کہ مصر کے سپاہیوں کا دستور ہے بالوں کی لمبائی کو گندھا ہوا رکھنے کے لیے موباف کی طرح ریشمیں کپڑا استعمال کرتے ہیں اور اپنی کمروں میں سونے چاندی کی پیٹیاں لگاتے ہیں۔ کوڑا باندھ لیتے ہیں یا تیر لٹکا لیتے ہیں، تلواریں تو کمر سے دور دراز سفر کے وقت باندھتے ہیں، گھر پر تو

تلوار باندھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ فوجی عہدہ داروں ہی کی طرح ملکی اور مالی افسروں اور وزیروں اور منشیوں کا لباس ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی کمر میں پیٹیاں نہیں لگاتے، فوجیوں کی شان پیٹیوں سے ہوتی ہے تو وزیروں اور منشیوں کا امتیاز اس رومال سے ہوتا ہے جس کو وہ صوفیوں کی طرح اپنی پگڑیوں پر باندھ لیتے ہیں۔ اس قسم کی بندش اور وضع کو شملہ کہتے ہیں۔ قاضی اور علماء لشکریوں کی طرح چست لباس پہنتے ہیں، زرہ بکتر لگائے رہتے ہیں، قاضیوں عالموں اور لشکریوں کے علاوہ عام لوگ بھی چست کپڑے پہنے اور زرہ بکتر لگائے دیکھے جاتے ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ عالموں اور لشکریوں کی طرح سے قبا اور دگلہ پہنتا تھا۔ قبا تو ایک قسم کا جتہ تھا یا گاؤن (GOWN) تھا جو اس وقت تک عالموں کی پوشاک ہے اور دگلہ ایک قسم کی چست عبا تھی جو اُس زمانے میں سپاہیوں کا پہناوا تھا۔

## ہندوستان کے کھانے

مسالک الا بصار میں تحریر ہے کہ ہندوستان میں دودھ گھی کی --- ایسی افراط ہے کہ کوئی انھیں مفت بھی نہیں پوچھتا اور ہندوستان کے بازاروں میں کھانے پینے کی چیزوں کی بہت دکانیں ہیں، جہاں قسم قسم کے کھانے موجود رہتے ہیں، جیسے شامی کباب اور سیخ کے کباب، پلاؤ، قورمہ اور طرح طرح کے سالن اور پینسٹھ (۶۵) قسم کی مٹھائیاں اور طرح طرح کے شیرے جو دہلی کے سوا کہیں اور نہیں پائے جاتے۔

سلطان محمد کی قلم رو میں داخل ہونے کے بعد ابن بطوطہ ملتان پہنچا تو وہاں ایک مرتبہ وہ سرکاری ضیافت میں شریک ہوا۔ جو کھانے اس ضیافت میں اس نے دیکھے ان کا ذکر سفرنامے میں موجود ہے۔ مثلاً پتلی پتلی چپائیاں۔ بڑے بڑے

بھنے گوشت کے ٹکڑے۔ پھر پوریاں یعنی گھی میں تلی ہوئی روٹیاں، بخشتی یعنی میٹھی روٹی، قلیہ جو گھی اور پیاز اور ادک ڈال کر بنایا جاتا ہے۔ سمو سے جن سے مراد گھی میں تلی ہوئی پتلی پتلی لپٹی ہوئی روٹیاں ہیں جن میں قیمہ، بادام، جانفیل، پتے، پیاز اور گرم مصالحے جیسی بہت سی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔۔۔۔۔

## صنعتیں

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ سلطان محمد نے کپڑا بننے کا کارخانہ جاری کر دیا ہے جس میں طرح طرح کے ریشمیں کپڑے بنے جاتے ہیں اور چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اس کارخانے کا بنا ہوا کپڑا خلعت دینے پہنے اور تحفے دینے کے کام آتا ہے۔ اس کے علاوہ چین، عراق، اور اسکندریہ سے بھی کپڑا آتا ہے۔ بادشاہ ہر سال پودے دو لاکھ جوڑے تقسیم کرتا ہے۔ ایک لاکھ گرمیوں میں اور ایک لاکھ جاڑوں میں، گرمیوں میں جو تقسیم ہوتا ہے وہ زیادہ تر اسکندریہ کا بنا ہوا ہوتا ہے، اور اور جاڑوں میں جو تقسیم ہوتا ہے وہ سب ریشمیں ہوتا ہے۔ وہ دہلی کے کارخانے کا بنا ہوا ہوتا ہے: یا چین کا یا عراق کا، اس کے علاوہ خانبقاہوں اور سراہوں میں بھی بادشاہ کی طرف سے کپڑا تقسیم کیا جاتا ہے۔

سلطان محمد نے زردوزی کا کارخانہ بھی جاری کر رکھا ہے، جس میں چار ہزار زردوز کام کرتے ہیں۔ زردوزی کام کیے ہوئے کپڑے بیگمات کے علاوہ روسا کے کام آتے ہیں، امرا کو خلعت دینے کے کام آتے ہیں اور ان کی بیبیوں کو بطور عطیے کے دئے جاتے ہیں۔

## دہلی کے مکان، باغ، بازار، کنوئیں، حوض، پل وغیرہ

دہلی کے مکان پتھر اور چونے کے بنے ہوئے ہیں ان کی چھتیں لکڑی کی ہیں۔ اور ان کے فرش سفید پتھر کے ہیں جو سنگ مرمر سے ملتا جلتا ہے اگرچہ خالص سنگ مرمر کا فرش سوائے شاہی محلات کے اور کہیں نہیں ہے۔ مکان زیادہ تر دو منزلے ہیں، بعضے ایک منزل کے بھی ہیں۔ شیخ ابو بکر بن خلیل نے مجھ سے کہا کہ یہ پرانی دہلی کے مکانات کا ذکر ہے، نئی دہلی اس کے علاوہ ہے۔ اصل میں اکیس شہروں کو دہلی کہتے ہیں اس کے تین طرف باغات ہیں جو سیدھی سیدھی قطار میں بارہ بارہ میل تک چلے گئے ہیں۔ چوتھی طرف پہاڑ کے نزدیک ہونے کی وجہ سے باغات نہیں ہیں۔ دہلی میں ایک ہزار مدرسے ہیں جن میں سے ایک مدرسہ شاہ فیضیوں کا ہے۔ باقی کل حنفیوں کے ہیں، اس کے علاوہ وہاں تقریباً ستر شفا خانے ہیں، محلات ہیں جن میں معماری کی عجیب عجیب صنعتیں دکھائی گئی ہیں، بڑی بڑی خانقاہیں بھی ہیں، اور چوڑے چوڑے بازار بھی ہیں، حمام بھی ہیں سب لوگ کنوؤں کا پانی پیتے ہیں، کنوؤں کی گہرائی سات ہاتھ سے زیادہ نہیں ہے۔ ہر کنوئیں پر سیاہ لگی ہوئی ہے۔ حوضوں کا پانی بھی جاتا ہے جن میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ حوضوں پر ایک تیر کی اڑان کے برابر یا اس سے بھی زیادہ پل بنے ہوئے ہیں۔ دہلی میں ایک مشہور جامع مسجد بھی ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ روئے زمین پر کوئی مسجد اس کے برابر عالی شان نہیں، اس کی اونچائی چھ سو ہاتھ ہے۔

## شاہی محل

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ دہلی میں سلطان محمد کے محلات اس کے اور اس

کے حرم کے واسطے مخصوص ہیں اس کی بیگمات کے لیے اور کنیزوں اور ماماؤں کے واسطے الگ الگ مکان بنے ہیں۔ وہاں خالوں اور امیروں میں سے کوئی نہیں رہ سکتا، خان اور ملک بادشاہ کی خدمت میں دو مرتبہ یعنی صبح اور شام حاضر ہوتے ہیں اور سلام کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔

## دربار

حسب مسالک الابدانے لکھا ہے کہ سلطان محمد کے دربار میں بارہ سو طبیب ملازم ہیں اور دس ہزار بازدار جو سکھائے جاتے ہیں۔ اور تین ہزار آدمی شکار کو گھیر گھاڑ کر لانے پر تعینات ہیں۔ پانچ سو بادشاہ کے ہم نشین ہیں۔ دو ہزار دو سو قوال ہیں۔ بادشاہ کے غلاموں میں سے بھی ایک ہزار قوال ہیں۔ جو قوالی سکھانے پر مامور ہیں۔ اور ایک ہزار شاعر مقرر ہیں جو نہایت قابل ہیں تینوں زبانوں میں یعنی عربی فارسی اور ہندی میں شعر کہتے ہیں۔ یہ سب کے سب سلطان کے دربار سے تنخواہ پاتے ہیں۔ اسی کے طرف سے ان پر انعام و اکرام ہوتا رہتا ہے اگر بادشاہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے قوال نے کسی اور کے یہاں قوالی پیش کی ہے تو پھر اس قوال کی جان بچنی مشکل ہو جاتی ہے۔ بادشاہ کا دربار صبح اور شام دن میں دو مرتبہ ہوتا ہے۔ محمد جنیدی کا بیان ہے کہ منگل کے روز بادشاہ پورے دن دربار عام کرتا ہے۔ منگل کا دربار ایک بہت وسیع میدان میں ہوتا ہے۔ جہاں ایک شاہانہ چتر لگایا جاتا ہے چتر اتنا بڑا ہوتا ہے کہ سائبان کے طرح سارے میدان کو ڈھک لیتا ہے۔ بیچ میں ایک اونچا سونے چاندی اور جواہرات کا جڑاؤ تخت رکھا جاتا ہے جس پر بادشاہ عدل و انصاف کے لیے بیٹھتا ہے۔ تخت کے دائیں بائیں ارکان سلطنت یعنی وزیر اور مشیر ادب سے کھڑے رہتے ہیں اور تخت کے پیچھے مسلح سپاہی اور خدمت گار وغیرہ کمر کمرے رہتے ہیں۔ باقی منصب دار اور عہدے دار اپنے اپنے منصبوں کے

مطابق کھڑے ہوتے ہیں۔ تخت کے سامنے بیٹھنے کی اجازت صرف خانوں خفیہ نویسوں اور صدر جہاں کو ہوتی ہے۔ اور آواز لگانے والے چراسی دروازوں پر کھڑے ہو کر فریادیوں اور نالش دائر کرنے والوں کو پکار پکار کر حاضر کرتے رہتے ہیں۔

داد خواہ اور انصاف“ چاہنے والے اپنی اپنی فریاد سنا کر بادشاہ سے انصاف کے طالب ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے حضور میں پہنچنے کے بعد جس وقت تک وہ اپنی پوری فریاد نہ سنالیں اور ان کے حق میں بادشاہ کا حکم صادر نہ ہو جائے اس وقت تک نہ کوئی انھیں مار سکتا ہے اور نہ ان پر کسی طرح کا دباؤ ڈال سکتا ہے۔ منگل کے علاوہ ہر روز صبح شام بادشاہ دربار عام کرتا ہے۔ دربار عام میں کوئی شخص کسی قسم کا ہتھیار اندر نہیں لاسکتا۔ نہ خود ہتھیار سجا کر آسکتا ہے۔ چاقو تک دربار میں نہیں لایا جاسکتا۔ دربار میں داخل ہونے سے پہلے بادشاہ کو ہر آنے والے کی بابت پوری اطلاع دی جاتی ہے۔ دربار کے میدان میں بادشاہ کے تخت تک پہنچنے کے لیے دروازے کے اندر دروازہ دروازے کے اندر دروازہ اسی طرح سات دروازے ہوتے ہیں پہلے دروازے پر ایک سپاہی مقرر ہوتا ہے۔ جب کوئی خان یا ملک یا بڑا امیر پہلے دروازے پر پہنچتا ہے تو وہ سپاہی بادشاہ کو خبر دینے کی غرض سے بگل بجانا شروع کرتا ہے۔ خانوں۔ ملکوں اور بڑے امیروں کو اندر تک سوار ہو کر جانے کی اجازت ہے مگر معمولی شخص کے لیے پہلے ہی دروازے پر پیدل ہو جانے کا حکم ہے۔ البتہ معمولی لوگوں میں سے کسی کو خاص طور سے اجازت مل جاتی ہے تو وہ بس چھٹے دروازے تک سوار ہو کر جاسکتا ہے۔ دربار میں داخل ہونے والا جب تک ساتویں دروازے تک نہیں پہنچ جاتا اس وقت تک برابر بگل بجانا رہتا ہے۔ جو آنا جانا ہے وہ چھووں دروازوں سے گزر کر ساتویں دروازے کے قریب بیٹھتا جاتا ہے۔ جب آنے والوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور کسی کا انتظار باقی نہیں رہتا تو پہلا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ ساتویں دروازے پر جمع ہوتے ہیں ان کو دروازے سے گزرنے اور محل کے اندر داخل ہونے کی اجازت دیدی جاتی ہے۔ اندر

داخل ہونے کی اجازت دیدی جاتی ہے۔ اندر داخل ہونے کے بعد جو بٹھانے کے قابل سمجھے جاتے ہیں ان کو تخت کے ادھر ادھر بٹھا دیا جاتا ہے باقی سب کھڑے رہتے ہیں۔ بٹھائے وہ لوگ جاتے ہیں جو یا تو قاضی ہوں یا وزیر اور یا خفیہ نویس۔ ان سب کو ایسی جگہ بٹھایا جاتا ہے جہاں بادشاہ کی نظر نہ پڑے۔ اس کے بعد عدالت کی کارروائی اس طریقے سے شروع ہوتی ہے کہ ہر محکمے میں عرضیوں اور کاغذات کے بستے کھول دئے جاتے ہیں۔ ہر محکمے کے لیے ایک علیحدہ حاجب مقرر ہے جو اپنے محکمے کے مقدموں کی پیروی اور کاغذات کی پیشی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ سب محکموں کے حاجب مقدمات کے کاغذات حاجب خاص کے پاس لے جاتے ہیں۔ حاجب خاص سب حاجبوں کا افسر ہوتا ہے، وہ ان کاغذات کو بادشاہ کی خدمت میں لے جاتا ہے۔ بادشاہ ان سب پر حکم لکھ دیتا ہے اور دربار برخواست ہو جاتا ہے تو حاجب خاص ان سب کاغذات کو بادشاہ کے پیش کار کے پاس لے جاتا ہے۔ پیش کار کے ذریعے شاہی فیصلوں کا اجرا ہوتا ہے۔ دربار عام برخواست ہو جاتا ہے تو دربار خاص قائم ہوتا ہے۔ وہاں بادشاہ علماء کو بلاتا ہے۔ مگر دربار خاص میں وہی علماء جا سکتے ہیں جن کو بادشاہ کے ساتھ بہت ربط ضبط ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ بادشاہ بہت گھل مل جاتا ہے ان کے ساتھ وہیں کھانا بھی کھاتا ہے اور دل چسپی اور خوش مزاجی کی باتیں بھی کرتا ہے۔ وہ بھی بادشاہ سے کھل کر کلام کرتے ہیں۔ علماء کی صحبت کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو بادشاہ ان کو رخصت کر دیتا ہے۔ علماء چلے جاتے ہیں تو بادشاہ خلوت میں بیٹھتا ہے اور اپنے خاص خاص مصاحبوں کو بلاتا ہے اور خدا کی تعریف کے نغمے سننے کے لیے قوالوں کو طلب کرتا ہے۔ کبھی بادشاہ مصاحبوں سے باتیں کر کے خوش ہوتا ہے اور کبھی قوالوں کے بول سن کر باغ باغ ہوتا ہے۔

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ دربار عام برخواست ہو جاتا ہے تو سلطان محمد کی عام اور خاص محفلیں ہوتی ہیں۔ عام محفل کی تو یہ کیفیت ہے کہ اس میں معمولی ملازمین کا تو

گزر نہیں صرف بڑے بڑے عہدے دار بھی اپنے نمبر سے جا سکتے ہیں۔ یہی قاعدہ  
اہلکاروں اور طبیبوں اور ان کے ہم رتبہ لوگوں کے لیے مقرر ہے۔ غرض خاص محفل  
میں کوئی بھی بغیر نمبر کے نہیں جا سکتا۔ شعرا کی حاضری کے لیے بھی وقت مقرر  
ہے۔۔۔۔۔

## سلطنت کا انتظام اور حکومت

”مسالک الابصار“ میں لکھا گیا ہے کہ خانوں میں سے کسی خان کو چن کر سلطان محمد  
اپنا نائب مقرر کر لیتا ہے جو امیر یہ کہلاتا ہے۔ لشکر کے معاملات خاص طور پر اور  
رعایا کے عام طور پر اسی امیر یہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ایک بڑا صوبہ اس کی جاگیر میں  
دیا جاتا ہے۔ بادشاہ کا ایک وزیر بھی ہے۔ جس کو امیر یہ کے برابر جاگیر ملتی ہے۔  
وزیر کے چار نائب ہوتے ہیں جو شوق کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ بیس  
ہزار سے لے کر چالیس ہزار سالانہ ٹنکے تک ہوتی ہے۔ وزیر کے ماتحت چار منشی  
ہیں جو دفتروں میں بیٹھ کر خفیہ خبروں کو لکھتے ہیں۔ ان چاروں میں سے ہر ایک  
کو ایک ایک شہر جاگیر میں ملا ہوا ہے۔ جس کی آمدنی بڑی بندرگاہ کی آمدنی کے  
برابر ہوتی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی دیکھ بھال انھیں چاروں میرمنشیوں  
کے ذمے ہے۔ ہر میرمنشی کے ماتحت قریب قریب تین سو منشی ہیں جن میں سے  
سب سے چھوٹے کی تنخواہ ہزار ٹنکے سالانہ ہے۔

بڑے منشیوں کے پاس اس سے بھی زیادہ ہیں جن کی

آمدنی تقریباً ساٹھ ہزار ٹنکے ہے۔ آج کل کمال الدین بن برہان خاں قاضی القضاہ ہے۔  
وہی صدر الاسلام کہلاتا ہے، اور وہی محکمہ عدل کا سب سے بڑا افسر ہے۔ عالموں  
اور فاضلوں کے سب معاملے خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا ولایتی صدر جہاں کے  
اقتسام میں ہیں۔ شیخ الاسلام (مہر کے) شیخ الشیوخ کے برابر ہے۔ اس کی آمدنی



اتنی ہے جتنی صدر جہاں کی۔ اس کے ذمے تمام جوگیوں، سادھوؤں اور قلندروں کا اہتمام ہے۔ خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا غیر ہندوستانی۔

شیخ مبارک نے آئین سلطنت اور طرز حکومت کے اعتبار سے سلطان محمد کا مقابلہ الپ ارسلان سلجوقی کے بیٹے ملک شاہ سے کیا ہے۔ لکھا ہے کہ۔  
 ”یہ بادشاہ اپنے زمانے کا ملک شاہ ہے“ ملک شاہ گیارہویں صدی عیسوی کا وہ نامی گرامی بادشاہ گزرا ہے جس کی خوبیاں اور سیاست دنیاں اس کے وزیر اعظم نظام الملک ابوعلی حسن نے سیاست نامے میں بیان کی ہیں۔ سیاست نامے کا فرانسیسی ترجمہ ہمارے سامنے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک شاہ کو سیاسیات میں بڑی واقفیت تھی۔ وہ سیاست مدن (مصالح اور حکمت عملی) میں ماہر تھا۔ اسی کی سی مثال سلطان محمد کی ہے۔ وہ جہانداری میں اور ملکی انتظامات میں ماہر تھا۔ اور سیاسیات میں بڑی دل چسپی لیتا تھا۔

## شاہی سواری

مسالک الابصار کا بیان ہے کہ سلطان محمد کی خدمت میں دس ہزار خواجہ سرا رہتے ہیں۔ ایک ہزار چوہدار، اور ایک ہزار بشمقدار، دو لاکھ غلام ہیں۔ جن کے گھوڑوں پر ہتھیار سجے رہتے ہیں اور وہ بادشاہ کی سواری کے ادھر ادھر چلتے ہیں اور ان سواروں کا سلسلہ پیادوں سے جا ملتا ہے، جو بادشاہ کے آگے آگے چلتے ہیں۔ شیخ مبارک کا بیان ہے کہ جب سلطان محمد سوار ہوتا ہے تو اس کے سر پر شاہی چتر لگایا جاتا ہے۔ اور جب جنگ کی غرض سے نکلتا ہے یا دور دراز کا سفر کرتا ہے تو اس کے سر پر سات چتر لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو چتر زر و جواہر سے جڑے ہوئے ایسے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔ جب بادشاہ پایہ تخت میں ہوتا ہے تو اس کے سارے ٹھاٹھ سکندر اعظم کے سے ہوتے ہیں۔ وہی آن بان، وہی شان،

وہی سلطنت کے آئین، وہی دربار کے قوانین

کے ساتھ ساتھ خان، ملک، اور امیر ہاتھوں میں جھنڈے لیے چلتے ہیں۔ خانوں کی جماعت میں زیادہ سے زیادہ نو جھنڈے ہوتے ہیں اور امیروں کی جماعت میں کم سے کم تین۔ بادشاہ کی سواری جب پایہ تخت میں نکلتی ہے تو خانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ (۹) نو جھنڈے ہوتے ہیں اور امیروں کے ساتھ دو کوئل گھوڑے۔ بادشاہی لشکر کے کل افسر سفر کی حالت میں اپنا اپنا انتظام اپنی مقدرت اور ہمت کے مطابق کرتے ہیں اور جب پایہ تخت میں پہنچتے ہیں تو ان کے خرچ سے کہیں زیادہ شاہی خزانے سے مل جاتا ہے۔

## شکار کی سواری

صاحب "مسالک البصار" لکھتا ہے کہ جب بادشاہ شکار کو جاتا ہے تو ہاتھی پر سوار ہو کر جاتا ہے۔ اُس وقت اس کے ساتھ ایک لاکھ سوار اور دو سو ہاتھی ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ سوار ہوتے ہیں نہ ہاتھی۔ شاہی سواری کے ساتھ ساتھ چار لکڑی کے محل بھی آٹھ سو اونٹوں پر لدے ہوتے ہیں۔ یعنی ہر محل کو دو ۲۰۰ سو اونٹ اٹھائے ہوتے ہیں۔ ان سب محلوں پر زردوزی کا کام کیے ہوئے سیاہ ریشمیں کپڑے پڑے ہوتے ہیں۔ ہر محل دو منزل ہوتا ہے۔ محلوں کے علاوہ تنبو اور ڈیرے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ مگر وہ دو منزلے نہیں ہوتے۔

ابن بطوطہ نے بھی شکار کی سواری کا حال لکھا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لکھا ہے اور ذاتی تجربے سے لکھا ہے۔ اس لیے کہ شکار کی سواری میں بعض موقعوں پر وہ بادشاہ کے ساتھ جاتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر اس نے یوں کیا ہے کہ "جب بادشاہ شکار کے لیے دارالخلافہ سے باہر گئے تو میں بھی ساتھ گیا۔ میں نے سفر کی تمام ضروری چیزیں خرید لی تھیں۔ ایک

ڈیرہ خرید لیا تھا۔ اور ایک سائبان۔ سائبان ڈیرے کے اندر سائے کے لیے لگایا جاتا ہے، اور دو بڑے بانسوں پر کھڑا کیا جاتا ہے، جنہیں لوگ کندھوں پر نئے جاتے ہیں۔ یہ لوگ کیوانی کہلاتے ہیں۔ ان کیوانیوں کو اور ان کے علاوہ گھاس لانے والے کو کھاروں کو، ڈولہ اٹھانے والوں کو، اور دوادویوں کو جو آگے آگے دوڑتے ہیں مسافر نوکر رکھ لیتے ہیں۔ میں نے روزانہ اجرت پر یہ سب لوگ اپنے ساتھ لے لیے تھے۔ جس روز بادشاہ کی سواری شہر سے باہر نکلی، اسی روز میں شہر سے باہر نکل آیا۔ میرے سوا اور آدمی دو۔ دو تین تین دن بعد آئے۔ سواری نکلنے کے دن شام کو پانچ بجے کے قریب بادشاہ اپنے ڈیرے کے باہر کرسی پر بیٹھے تھے کہ ہاتھی پر سوار ہو کر جائیں اور دیکھیں کہ کون کون چلنے کو تیار ہے۔ اسی وقت میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام کر کے میں داہنی طرف اپنی مقررہ جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے ملک قبولہ سر جاندار کے ذریعے مجھے کہلا بھیجا کہ بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ اتنے میں ہاتھی آن پہنچا۔ بیٹھی لگائی گئی اور جب بادشاہ اس ہاتھی پر سوار ہو چکے تو چتر لگایا گیا اور بادشاہ کے خاص خاص مصاحب بھی سوار ہو گئے۔ دستور یہ ہے کہ جب بادشاہ سوار ہو جاتے ہیں تو ہر ایک اپنی اپنی فوج اور علم اور طبل اور نفیری اور سونالے کر سوار ہو جاتا ہے۔ بادشاہ کے آگے آگے فقط حاجب اور طوائف اور طبیبی اور سرنا بجانے والے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دائیں اور بائیں طرف پندرہ پندرہ آدمی ہوتے ہیں جن میں وزیر اور بڑے بڑے امیر اور بعض شریف شریف پر دیسی بھی ہوتے ہیں۔ میں بھی داہنی طرف کی جماعت میں تھا۔ بادشاہ کے آگے آگے کچھ پیدل سپاہی اور راہر چلتے ہیں۔ راہر راستوں سے خوب واقف اور راستے دکھاتے اور راہیں بتاتے ہوئے جاتے ہیں۔ بادشاہ کے پیچھے غلام اور خادم ہوتے ہیں اور ان کے بعد امیر ہوتے ہیں اور ان کے بعد عام لوگ۔ کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ کس جگہ قیام ہوگا۔ جب کوئی جگہ دریا کے کنارے یا درختوں کے جھنڈ میں بادشاہ کو اچھی معلوم ہوتی ہے تو حکم ہوتا ہے کہ اس جگہ اتر جاؤ۔

جب تک بادشاہ کا ڈیرہ نہ لگ جائے کوئی شخص اپنا ڈیرہ نہیں لگا سکتا۔ بادشاہ کا ڈیرہ لگ جاتا ہے تو ناظر آکر ہر شخص کو اس کی جگہ بتا دیتے ہیں۔ بیچ میں شاہی ڈیرہ ہوتا ہے ارد گرد اور ڈیرے ہوتے ہیں۔ بکری کا گوشت یا کچھ شکار پہلے ہی روانہ کر دیا جاتا ہے۔ امیروں کے لڑکے فوراً حاضر ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک سیخ ہوتی ہے۔ وہ آگ روشن کرتے ہیں اور گوشت بھوتے ہیں۔ پھر ایک چھوٹا سا ڈیرہ لگایا جاتا ہے، اس کے باہر بادشاہ مع اپنے مصاحبوں کے بیٹھ جاتا ہے دسترخوان آتا ہے اور بادشاہ جس کو چاہتا ہے اپنے ساتھ کھانے کے لیے بلا لیتا ہے۔۔۔۔۔“

## ہوا خوری اور تفریح

مسالک الابصار میں مرقوم ہے کہ جب بادشاہ ہوا خوری وغیرہ کے لیے کہیں جاتا ہے تو اس کے ساتھ تیس ہزار سپاہی گھوڑوں پر اور اتنے ہی ہاتھیوں پر سوار ہوتے ہیں۔ ایک ہزار کوتل گھوڑے ہوتے ہیں جن پر زین کسے ہوئے ہوتے ہیں۔ لگائیں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کے جسموں پر سنہری پاکھریں سجی ہوتی ہیں۔ ان کے گلے میں ہار پڑے ہوتے ہیں۔ اور ہر عضو میں وہ زیور پہنے ہوتے ہیں بعض گھوڑے یا قوت اور جواہرات وغیرہ سے سجے ہوتے ہیں۔ لیکن جب بادشاہ اپنے محلات میں ایک محل سے دوسرے محل تک سوار ہو کر جاتا ہے تو اس کے سر پر چتر ہوتا ہے اور مسلح سپاہی ہاتھوں میں تلواریں لیے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور بارہ ہزار غلام بادشاہ کے گرد حلقہ کیے رہتے ہیں۔ سوائے چتر بردار اور جاں بردار کے سب پیدل ہوتے ہیں۔ بادشاہ کی سواری کی یہ شان محلات کے اندر شیخ محمد خجندی نے جو دہلی کے شاہی لشکر میں ملازم تھا اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس نے جیسی دیکھی ویسی ہی لکھ دی

## جنگ کی سواری اور لشکر کی ترتیب

عام سواری میں اور جنگ کی سواری میں فرق تھا، جسے مسالک الالبصار میں وفات سے نہیں لکھا گیا۔ شیخ مبارک کے حوالے سے اس میں بس اتنا لکھا ہے کہ ”جب بادشاہ سوار ہوتا ہے تو اس کے سر پر شاہی چتر لگایا جاتا ہے اور جب جنگ کی غرض سے نکلتا ہے یا دور دراز کا سفر کرتا ہے تو اس کے سر پر سات چتر لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو چتر زرد و جواہر سے جڑے ہوئے ایسے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔ جنگ کے وقت بادشاہ لشکر کے بیچوں بیچ کھڑا ہوتا ہے اس کے ارد گرد علماء اور فضلا رہتے ہیں۔ لشکر کا ہر حصہ میمنہ ہو، میسرہ ہو یا جناح دور دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ تیراندازوں کے آگے ہاتھی ہوتے جن کے سارے بدن پر فولادی پاکھریں سجی ہیں۔ ان ہاتھیوں پر ہودج دھرے ہوتے ہیں۔ ہودجوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں اور ان میں جنگجو سپاہی بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہودجوں میں تیر پھینکنے کے لیے سوراخ بھی ہوتے ہیں اور تلواروں کے ہاتھ نکالنے کے لیے بھی گنجائش ہوتی ہے۔ ہاتھیوں کے آگے آگے پیادے ہوتے ہیں جو پیر تک ہتھیاروں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ یہ لوگ آگے آگے اس لیے چلتے ہیں کہ پیچھے آنے والے ہاتھیوں کے لیے راستہ صاف کر دیں، اور دشمن کے سواروں کو سامنے سے آتا دیکھیں تو تلواریں مار مار کر پھیر دیں۔ ہودجوں کے برجوں میں تیر انداز بیٹھے رہتے ہیں جو ہاتھیوں کی پشت طرف منہ کیے رہتے ہیں۔ اور پیچھے سے حملہ کرنے والوں پر تیر چلاتے رہتے ہیں۔ ہاتھیوں کے دائیں بائیں گھڑسوار ہوتے ہیں جو دشمنوں کو کاٹتے چھانٹتے اور پامال کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ بھاگنے والے کو کسی غار یا گڑھے میں بھی پناہ نہیں ملتی۔ سامنے سے آنے والے کو پیادے نہیں چھوڑتے۔ غرض شاہی لشکر ہاتھیوں کے چاروں طرف حلقہ باندھے رہتا ہے۔

لشکر کے اس عمدہ انتظام کی بدولت دشمنوں پر کیا نیچے، کیا اوپر، کیا دائیں، کیا بائیں، کیا آگے، کیا پیچھے، ہر طرف سے مار کی بھرمار رہتی ہے غنیم بادشاہی لشکر سے ملتے ہی موت کے شکنجے میں کس دیا جاتا ہے، اور بلا کے گھیرے میں پھنس جاتا ہے۔

## لشکر

لشکر میں درجے ہیں۔ پہلا درجہ خان کا ہے۔ وہی سب درجوں سے بڑا ہوتا ہے۔ دوسرا درجہ ملک کا ہے اور تیسرا امیر کا۔ چوتھا سپہ سالار کا اور پانچواں جند کا۔ خان کی ماتحتی میں دس ہزار (۱۰۰۰) سوار رہتے ہیں۔ ملک کی ماتحتی میں ایک ہزار (۱۰۰۰) اور امیر کی ماتحتی میں سو (۱۰۰) سپہ سالار کی ماتحتی میں سو (۱۰۰) سے بھی کم۔ جندیوں کی تنخواہیں مقرر ہوتی ہیں۔ جو شاہی خزانے سے پابندی کے ساتھ ملتی رہتی ہیں۔ مگر خانوں، ملکوں اور سپہ سالاروں کے لیے بجائے تنخواہ کے سرکاری دفتر سے گاؤں مقرر ہو جاتے ہیں۔ جن کی آمدنی ان کے اخراجات کے لیے بہت کافی ہوتی ہے۔ بلکہ دفتر کے کاغذات میں ان کی جتنی آمدنی لکھی ہوئی ہے اس سے دو چندان کو گاؤں سے وصول ہو جاتی ہے۔ خان کے لیے دو لاکھ ٹنکے سالانہ کی جاگیر مقرر ہوتی ہے۔ لاکھ سو ہزار ٹنکوں کا ہوتا ہے۔ اور ٹنکے آٹھ درہم کا ہوتا ہے۔ یہ رقم خان ہی کی جیب خاص کے لیے ہوتی ہے۔ اس میں فوج کے دوسرے سرداروں کا کچھ حق نہیں ہوتا۔ اور انھیں اس میں سے کچھ دینے پر وہ مجبور بھی نہیں ہوتا۔ ملک کے لیے پچاس (۵۰) ہزار سے ساٹھ (۶۰) ٹنکے تک کی جاگیر مقرر ہوتی ہے۔ اور امیر کے لیے تیس (۳۰) ہزار سے چالیس (۴۰)

لے جندی سے مراد معمولی سپاہی ہے، جسے مفرد بھی کہتے ہیں۔

ہزار تک کی۔ سپہ سالار کے لیے تقریباً بیس ہزار ٹنکے کی۔ باقی افسروں کے لیے ایک ہزار ٹنکے سے لے کر دس (۱۰) ہزار تک کی جاگیر ہوتی ہے۔ مگر سپہ سالار سے کم درجے والے فوجی افسروں کو خزانے سے نقد روپیہ مل جاتا ہے۔

ملک ہو یا خان یا سپہ سالار۔ ان میں سے کوئی بھی لشکر سے اپنے لیے خدمت نہیں لے سکتا۔ یہ بات مصر اور شام کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں ملک اور امیر لشکریوں سے خدمت لے لیتے ہیں۔ ہندوستان میں ملک اور امیر اور سپہ سالار اپنا کام خود ہی کیا کرتے ہیں۔ لشکر تو بس بادشاہ کی خدمت کے لیے ہے۔ ملک، خان اور سپہ سالار لشکر سے خدمت لے سکتے ہیں تو بادشاہ ہی کے نام سے اور اسی کے لیے۔

اسی (۸۰) یا اسی (۸۱) سے زیادہ خان بادشاہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ لشکر میں نو (۹) لاکھ سوار ہیں۔ جن میں سے کچھ تو بادشاہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ باقی جگہ جگہ چھاو نیوں میں مقرر ہوتے ہیں۔ ان سب کے متعلق شاہی دفتر سے احکام جاری ہوا کرتے ہیں۔ اسی دفتر سے ان پر انعام اکرام بھی ہوتے رہتے ہیں۔ لشکر میں سپاہی ترک بھی ہیں خطائی بھی ایرانی بھی اور ہندو بھی۔ بعض لشکری پہلوان بھی ہیں اور دوڑنے والے بھی۔ نیچے اونچے درجے والے سب لشکریوں کے پاس داغ کیے ہوئے گھوڑے ہوتے ہیں۔ اچھے اچھے ہتھیار ہوتے ہیں اور سب لشکری ترک بھرک سے رہتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ ترمذی احکام سیکھتے ہیں۔ بعض کو ترمذیہ سے اچھی خاصی واقفیت ہوتی ہے۔ مذہب کی کل تعلیم امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے طریقے پر ہے۔

لشکر میں تین ہزار ہاتھی عماری دار رہتے ہیں جن کو لڑائی کے وقت لوہے کی اور سونے کی پاکھریں پہنائی جاتی ہیں۔ صلح اور امن کے دنوں میں ہاتھیوں پر قسم کی ریشمین اور زردوزی کا کام کی ہوئی جھولیں ڈالی جاتی ہیں۔ جھولوں پر عماریاں جمائی جاتی ہیں۔ چاندی کے تخت رکھے جاتے ہیں۔ تختوں پر اونچی

اونچی لکڑیوں کے ذریعے چھتریاں بنائی جاتی ہیں۔ چھتریوں کے اندر ہندوستان کے سورمالڑائی کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک ہاتھی کے اوپر زیادہ سے زیادہ دس اور کم سے کم چھ آدمی ہوتے ہیں۔ اتنے ہی وہ اٹھا بھی سکتا ہے۔

## لڑائی کے ہتھیار

تاریخ فیروز شاہی میں آتشبازی کا اور آگ کا ذکر ہے مگر ان دونوں ہندو قوتوں کا یا بارود کا استعمال نہ تھا۔ نفت یا روغن نفت کے ذریعے آگ پیدا کی جاتی تھی۔ کولوں کو دہکا یا جاتا تھا اور جلتی ہوئی آگ برسائی جاتی تھی تو لڑائی چلائی جاتی تھیں۔ تیر برسائے جاتے تھے۔ اور نیزے چلائے جاتے تھے منجنیق اور عرادے سے توپوں کا کام لیا جاتا تھا۔ جن کے ذریعے قلعوں کی دیواریں توڑی جاتی تھیں۔ آگ پھینکی جاتی تھی اور پتھر مارے جاتے تھے چھوٹی منجنیق کو عرادہ کہتے تھے۔ منہاج السراج نے اس تاریخ آل چنگیز میں لکھا ہے کہ جب چنگیز خان نے منغل قبیلوں کے سردار التون خاں ترک راہی طمغاج پر حملہ اور اسے شکست دے کر اس کے مقبوضات یعنی ولایت تفر، تبت اور طمغاج پر قبضہ کر لیا تو طمغاج پر جو التون خاں کا پایہ تخت تھا۔ منجنیق لگا دیں۔ جو چار سال تک لگی رہیں۔ اور ان منجنیقوں کے ذریعے شہر پر برابر پتھر اور اینٹوں کی بارش ہوتی رہی۔ جب اینٹیں ختم ہو گئیں اور پتھر بھی نہ رہے تو پھر لوہا اور تانبا وغیرہ منجنیقوں میں بھر کر پھینکنے لگے۔

۱۔ اس کتاب کا پورا نام — کتاب سیاست الامصار فی تجربہ الاحضار در تاریخ آل چنگیز  
مصنف قاضی القضاة منہاج الدین بن سراج الدین جو رہا جانی ہے اس میں فاضل مصنف نے  
چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کا حال لکھا ہے۔



اصل عبارت یہ ہے : ” و چنگیز خاں بر ولایت تغر و تبت و طمغاج استیلا یافت و بہ در شہر طمغاج و دار الملک التون خان آمد و مدت چہار سال برد شہر بود۔ منجنیق نہادند و بینداختند۔ چوں سنگ و خشت و غیر آں کم شدہ پس ہر پہ آہن و رومی و سرب و ارزیر بود ہمہ در منجنیق بینداختند۔ پس بالش زر و نقرہ بغوض سنگ در منجنیق می گذاشتند و پیروں می انداختند۔“

تاریخ آل چنگیز (صفحہ ۱۱۰) سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجری سنہ ۱۱۰۲ اور عیسوی سنہ ۱۲۰۵ اور ہجری سنہ ۶۱۷ اور عیسوی سنہ ۱۲۲۰ کے درمیان ہوا۔ تاریخ فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تیر، تیغ، ناچخ، سنگ مغربی، ساباط، یا شیب اور گڑگچ کا بھی استعمال تھا۔ ناچخ ایک قسم کا چھوٹا نیزہ ہوتا تھا۔ سنگ مغربی سے مراد غالباً وہ گول گول اور چھوٹے چھوٹے پتھر ہیں جو منجنیق کے ذریعے پھینکے جاتے تھے۔ ساباط اس سرنگ کا نام ہے جو شاہی کیمپ سے دشمن کے قلعے تک یا ایک مقام سے دوسرے مقام تک قلعے کو فتح کرنے کی غرض سے کھودی جاتی تھی۔ ساباط اس چبوترے کو بھی کہتے تھے جو قلعے کی دو بڑی دیواروں کے درمیان بنایا جاتا تھا اور جس کے نیچے زمین دوز راستے ہوتے تھے۔ گڑگچ اس گڑھی کو کہتے تھے جو قلعے کے سامنے جنگ کی تیاری کے واسطے اور تحفظ کی غرض سے بنائی جاتی تھی۔ قلعوں پر چڑھنے کے لیے جو زینے بنائے جاتے تھے یا ان پر سے اترنے کے لیے جو ڈھال بنائے جاتے تھے ان کو پاشیب کہتے تھے۔

پدماوت<sup>۱</sup> میں سانگ ( ) اور ترشول کا بھی ذکر آیا ہے۔ سانگ ایک قسم کا بھالا ہوتا ہے اور ترشول تر پھنا۔

۱ ”پدماوت“ ہندی کی اس کتاب کا نام ہے جو سنہ ۶۱۵ء میں ملک محمد جانی نے لکھی تھی۔ اس میں پدینی کا اور سلطان علا الدین خلجی کا حال ہے۔

## ڈاک کا انتظام

”مسالک الابصار“ کے مصنف نے سراج الدین ابو صفا عمر شبلی کی زبانی لکھا ہے کہ سلطان محمد کو اپنی قلمرو کے حالات اور اخبار معلوم کرنے کی دھن لگی رہتی ہے۔ اور اپنی ہی سلطنت پر بس نہیں۔ اُسے تو اُس پاس کی سلطنتوں کے حالات کی بھی تلاش رہتی ہے۔ بلکہ وہ ہر سلطنت کے ملکی، مالی، اور فوجی حالات دریافت کرتا رہتا ہے۔

اس بادشاہ نے اپنی سلطنت میں ڈاک کا انتظام یوں کیا ہے کہ ہر طرف پیادے مقرر کر دیئے ہیں۔ پیادے چھوٹے بڑے درجوں کے ہیں۔ بعض چھاؤنیوں میں رہتے ہیں اور بعض شہروں میں۔ جب کسی پیادے کو نئی خبر معلوم ہوتی ہے جس کا بادشاہ تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے تو وہ اپنے بڑے افسر تک پہنچا دیتا ہے۔ اس طرح سلسلے وار وہ خبر بادشاہ تک پہنچ جاتی ہے۔ ڈاک کا یہ انتظام قریب قریب کے شہروں اور گرد و نواح کی بستیوں کے لیے ہے۔

دور دراز کے ملکوں کی ڈاک کا یہ انتظام ہے کہ دارالخلافت دہلی سے لے کر مختلف صوبوں کے قلعوں تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈاک خانے بنے ہوئے ہیں۔ یہ ڈاک خانے ایسے ہی ہیں جیسے کہ مصر و شام کے ڈاک گھر۔ فرق یہ ہے کہ مصر اور شام کے ڈاک گھر ذرا دور دور بنے ہوئے ہیں اور یہاں پاس پاس ہیں۔ یہاں تو ایک ڈاک خانے سے دوسرے ڈاک خانے کا فاصلہ آدھ میل ہو گا یا اس سے بھی کم۔ ہر ڈاک خانے میں دس دوڑتے والے بریدرماں مقرر رہتے ہیں۔ مقررہ وقتوں پر چراسی ڈاک کے پلندے افسر برید خانہ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ پوست فاد افسران کو کھلو کر ڈاک کیوں پر تقسیم کر دیتا ہے۔ ڈاک یہ ڈاک لیتے ہی اپنے مقام سے دوڑتا ہے اور دوسرے ڈاک خانے تک پہنچا دیتا

ہے۔ اسی طرح سے ڈاک دور سے دور شہروں میں جلد سے جلد پہنچ جاتی ہے۔  
 ڈاکہ ڈاک کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا دیتا ہے تو فوراً اپنی جگہ  
 واپس آجاتا ہے۔ یہ پیادوں کی ڈاک ہے۔ جو گھوڑوں اور سائڈنیوں کی  
 ڈاک کو مات کرتی ہے اور ان دونوں سے کہیں جلدی پہنچتی ہے۔

راوی کہتا ہے کہ ہر پوست خانے کے اردگرد اچھی خاصی بستی بسی ہوئی ہے  
 ہر بستی میں مسجد بھی ہوتی ہے جس میں پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھی جاتی  
 ہے۔ مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے مسجد میں حجرے بنے ہوئے ہیں، ہر بستی میں پانی  
 سے بھرے ہوئے پکے تالاب بھی ہیں اور بازار بھی۔ بازار میں کھانے پینے کی  
 سب چیزیں ملتی ہیں اور جانوروں کے لیے ہر قسم کا چارا بھی موجود رہتا ہے۔ ان  
 بستیوں سے مسافر کو بڑا آرام ملتا ہے۔ ان کی بدولت نہ اسے اپنے ساتھ کھانے  
 پینے کی چیزیں لے جانے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی ڈیرہ ڈھونڈنے کی۔  
 ابو صفاء عمر شیبلی نے کہا کہ سلطان محمد کی انتظامی سرگرمیوں میں سے ایک  
 یہ بات بھی ہے کہ اُس نے اپنی قلم رو میں ہر جگہ خبر پہنچانے کی غرض سے ڈاک خانوں  
 کے علاوہ نوبت خانوں کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے جو ایک طرف تو دارالخلافت دہلی  
 پر ختم ہوتا ہے اور دوسری طرف دارالخلافت دولت آباد پر۔ بادشاہ کی سلطنت کے  
 دارالخلافت یہی دو بڑے شہر ہیں۔ انہی دونوں شہروں کو ہندوستان بھر کے  
 نوبت خانوں کا مرکز سمجھنا چاہئے۔ ان نوبت خانوں کی بدولت شہر شہر کے حالات  
 اور واقعات کی اطلاع بادشاہ کو ہوتی رہتی ہے خواہ بادشاہ ملک کے کسی حصے  
 میں کیوں نہ ہو۔ حدیہ ہے کہ ان نوبت خانوں کے ذریعے ہر شہر کے دروازوں کے  
 کھلنے اور بند ہونے تک کی اطلاع بادشاہ کو مل جاتی ہے۔ جب کسی نوبت خانے  
 کے قریب کوئی واقعہ ہو جاتا ہے تو اس میں نوبت بختی ہے، اور اس نوبت کی  
 آواز پر چاروں طرف کے نوبت خانوں میں سلسلے وار نوبت بختی چلی  
 جاتی ہے۔

ابن بطوطہ نے ڈاک کا مختصر سا حال لکھا ہے مگر جو کچھ لکھا ہے اس سے مسالک الابصار کی تائید ہوتی ہے۔ اس کو ڈاک چوکی کے اور خبر سانی کے انتظام ایسے دل چسپ معلوم ہوئے اور اتنے اہم نظر آئے کہ اُس نے سفر نامے کے شروع ہی میں اس کا ذکر کر دیا۔ اس کا بیان ہے کہ ”سیوستان سے ملتان تک دس دن کا راستہ ہے اور ملتان سے دارالخلافہ دہلی تک پچاس دن کا جو خبر اخبار نویس بادشاہ کو لکھتے ہیں وہ اس کے پاس ڈاک کے ذریعے پانچ دن میں پہنچ جاتی ہے۔ ڈاک دو قسم کی ہے۔ ایک گھوڑے کی دوسری پیادوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک کو ادلاق کہتے ہیں۔ ہر چار کوس کے بعد گھوڑا بدلا جاتا ہے۔ یہ گھوڑے سرکاری ہوتے ہیں۔

پیدلوں کی ڈاک کا انتظام یہ ہے کہ ایک میل میں تین چوکیاں ہر کاروں کی ہوتی ہیں۔ چوکی کو داوہ کہتے ہیں۔ ہر تہائی میل کے فاصلے پر ایک گاؤں آباد ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر ہر کاروں کے لیے برجیاں بنتی ہوتی ہوتی ہیں۔ ہر ایک برجی میں ہر کارے کمر کے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر ایک ہر کارے کے پاس دو گز لمبی چھڑی ہوتی ہے۔ جس کے سرے پر تانبے کے گھنگرو بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب شہر سے ڈاک چلتی ہے تو ہر کارہ ایک ہاتھ میں ڈاک کا تھیلہ پکڑ لیتا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں چھڑی لے لیتا ہے اور پوری طاقت سے دوڑتا ہے۔ قریب کی برجی والا ہر کارہ گھنگروؤں کی آواز سن کر تیار ہو جاتا ہے اور اس سے ڈاک کا تھیلہ لے کر فوراً دوڑنے لگتا ہے۔ اس طرح ڈاک دور دور پہنچ جاتی ہے۔ یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک سے بھی جلدی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس ڈاک کے ذریعے خراسان کے تازہ میوے بھی بادشاہ کے لیے تھا لیوں میں پہنچائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کسی سنگین مجرم کو بھی چار پائی پر لٹھا کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک اسی طرح پہنچا دیا جاتا ہے جب میں دولت آباد میں تھا تو بادشاہ کے لیے گنگا جہل اسی ڈاک کے ذریعے پہنچایا جاتا تھا۔ دولت آباد دریا کے گنگا سے چالیس دن کے فاصلے پر ہے۔

## پچھے عالم اور عامل

سفر نامے میں لکھا ہے کہ زندہ علما میں سے شیخ محمود گپتا ہیں۔ یہ بڑے بزرگ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس دست غیب ہے۔ اس لیے کہ وہ خرچ بہت کرتے ہیں۔ اگرچہ ظاہر میں ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ہر مسافر کو کھانا کھلاتے ہیں اور مستحقوں اور محتاجوں کو روپے دیتے ہیں، اشرفیاں دیتے ہیں اور بنے بنائے کپڑے دیتے ہیں۔ ان سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ ان کی زیارت کی اور ان سے فیض حاصل کیا۔

شیخ علاء الدین نیلی ایک اور عالم ہیں۔ یہ شیخ نظام الدین بدایونی کے جانشین ہیں۔ ہر جمعہ کو وعظ کہتے ہیں۔ بڑا مجمع ہوتا ہے۔ بہتیرے ان کے مرید ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ شیخ علاء الدین وعظ کہہ رہے تھے اور قاری قرآن شریف کی آیتیں پڑھتا جاتا تھا۔ جب اس نے یہ آیت پڑھی ”اے لوگو! خدا سے ڈرو قیامت کا واقعہ بڑا سخت ہوگا۔ جان کاہ ہوگا۔ اُس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پلائے ہوئے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ کا وضع حمل ہو جائے گا اور آدمیوں کے ہوش حواس گم ہو جائیں گے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ گویا وہ نشے میں ہیں۔ مگر وہ نشے و فنی میں نہ ہوں گے۔ ان کی یہ حالت عذاب خدا کے خوف سے ہوگی یہ لہ شیخ علاء الدین نیلی نے اسی آیت کو دوبارہ پڑھوایا۔ ایک فقیر نے جو مسجد کے گوشے میں بیٹھا ہوا تھا چیخ ماری۔ شیخ نے اس آیت کو پھر پڑھوایا۔ فقیر نے ایک اور چیخ ماری۔ اور مرگیا۔ اس وقت میں بھی مسجد میں

لہ یَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ كَيْفَ أَنْتُمْ إِنْ تَذَكَّرْتُمْ السَّاعَةَ شَيْءٌ عَظِيمٌ يَوْمَ تَرَوُنَّهَا تُرْجَلُونَ كُلٌّ مَرْفُوعٌ عَمَّا رَفَعْتُمْ وَتَفْصَعُ كُلُّ ذَاتٍ حَمَلًا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَارَىٰ، وَذَلِكَ عَذَابٌ شَدِيدٌ۔

موجود تھا۔ یہ واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں نے بھی اس فقیر کے جنازے کی نماز پڑھی۔

شیخ صدرالدین ایک اور عالم ہیں جو دن میں ہمیشہ روزہ رکھتے ہیں اور رات کو نمازیں پڑھا کرتے ہیں۔ دنیا کو انھوں نے بالکل ترک کر دیا ہے۔ لباس ان کا فقط ایک کبیل ہے۔ بہت سے امیران کے پاس آتے ہیں۔ سلطان محمد خود ان کی زیارت کے لیے آتا ہے۔ مگر شیخ صدرالدین سلطان سے اور اس کے امرا سے چھپتے پھرتے ہیں۔ ایک دفعہ سلطان محمد نے ان سے درخواست کی کہ لنگر کے خرچ کے واسطے کچھ زمین یا گاؤں قبول کر لیجئے۔ مگر شیخ صدرالدین نے منظور نہ کیا۔ سلطان پھران کی زیارت کے لیے آیا تو دس ہزار دیناران کی نذر کیے۔ شیخ نے وہ بھی قبول نہ کیے۔

مسالک لاابصار سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کی سلطنت میں منجری کا ایک علیحدہ محکمہ قائم تھا جس کا تعلق خاص بادشاہ سے تھا۔ اس محکمے میں بہت سے کارکن، اخبار نویس اور جاسوس کام کیا کرتے تھے اسی طرح ہر امیر کے گھر میں کچھ لونڈیاں رہتی ہیں جو امیر کے سب واقعات بھنگنوں سے کہہ دیتی ہیں اور بھنگنیں اس قسم کی خبریں منجروں کے افسر کو پہنچا دیتی تھیں۔

## سٹرکیں

سفر نامے سے ظاہر ہے کہ سلطان محمد کے زمانے میں بڑی بڑی اور پکی سٹرکیں تھیں، بلکہ اس سے پہلے بھی موجود تھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ”دہلی سے دولت آباد چالیس منزل ہے، اور راستوں پر دونوں طرف بید مجنوں کے اور قسم قسم کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ چلنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ باغ کے درمیان چلا جاتا ہے۔ ایک ایک کوس میں تین تین چوکیاں ڈاک کے ہر کاروں کی ہیں۔ ہر چوکی پر ضرورت کی سب چیزیں ملتی ہیں۔ مسافر کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا

وہ برابر بازار میں سے چلا جا رہا ہے۔ اسی طرح یہ سڑک تلنگانے اور معبر تک چلی گئی ہے۔ تلنگانے سے دہلی تک چھ مہینے کی راہ ہے۔ ہر ہر منزل پر بادشاہی محل ہے اور مسافروں کے لیے سرائے ہے۔

## سکے اور نرخ

چودھویں صدی کے سیاح شیخ مبارک کا بیان ہے کہ ہندوستان میں سب سے بڑے دو سکے ہیں لکٹ حمر اور لکٹ ابیض۔ سنہری سکے لکٹ حمر کہلاتا جو سو ہزار سنہری ٹنگوں کے برابر ہوتا ہے اور روپلی سکے جو لکٹ ابیض کہلاتا ہے چاندی کے سو ہزار ٹنگوں کے برابر ہوتا ہے۔ سنہری ٹنگا وزن میں ساڑھے تیرہ (۱۳) ماشے ہوتا ہے اور روپلی ٹنگہ آٹھ ہشتگانوں کے برابر ہوتا ہے۔ ہشتگانی کا سکے چار سلطانیوں کے برابر ہوتا ہے سلطانی کو دوگانی بھی کہتے ہیں۔ سلطانی یا دوگانی ششگانی کی تہائی کے برابر ہوتا ہے۔ ششگانی ہندوستان کے چاندی کے سکوں میں سے تیسری قسم کا سکے ہے جو ہشتگانی کی تین چوتھائی کے برابر ہوتا ہے۔ یگانہ بھی ایک سکے ہے جو سلطانی یا دوگانی کا آدھا ہوتا ہے۔ اور جو قیمت میں ایک جیتل کے برابر ہوتا ہے۔ دو سکے اور ہیں۔ ایک دوازده گانی اور دوسرا شانزده گانی۔ دوازده گانی تیرہ ہشتگانی کے برابر ہوتا ہے اور شانزده گانی جو دو ہشتگانیوں کے برابر ہوتا ہے۔

غرض ہندوستان میں چاندی سونے کے سکے جو اس وقت رائج ہیں، چھ (۶) قسم کے ہیں۔ (۱) شانزده گانی، (۲) دوازده گانی، (۳) ہشتگانی، (۴) ششگانی، (۵) سلطانی، اور (۶) یگانہ۔ آخر کے تین سکے ششگانی، سلطانی اور یگانہ چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہی تینوں تجارت میں بہت کام آتے ہیں۔ ان تینوں میں سب سے چھوٹا سکے سلطانی ہے اور وہی سب سے زیادہ چلتا ہے۔

سلطانی مصر اور شام کے چوتھائی درہم کے برابر ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ سلطانی آٹھ فلوس کے۔ جیتل لہ چار فلوس کے۔ اور ہشتگانی مصر اور شام کے بتیس فلوس کے برابر ہوتی ہے۔

دھل کا پیمانہ جو ہندوستان میں سیر کہلاتا ہے، وزن میں ستر منقال یا تین سو پندرہ، ماٹھے کے برابر ہوتا ہے۔ من ہندوستان میں چالیس سیر کا ہوتا ہے۔ یہاں چیزوں کو ناپ کر دینے کا رواج نہیں ہے۔ گہوں یہاں سواروپے من ملتا ہے۔ جو ایک روپے من اور چاول پونے دو روپے من۔

بڑھیا قسموں کے بھاڈا اس سے بھی زیادہ ہیں۔ چنا آٹھ آنے من ہے۔ اور گائے کا اور بکری کا گوشت ایک سلطانی کا (یعنی دو آنے کا) چھ سیر ملتا ہے۔ اور دونوں قسم کے گوشت کا ایک ہی بھاؤ ہے۔ بھیڑ کا گوشت ایک سلطانی کا (یعنی دو آنے کا) چار سیر ملتا ہے۔ ایک مرغابی ایک ہشتگانی کی (آٹھ آنے کی) ملتی ہے۔ اور مہری ایک شانزدہ گانی کی (یعنی ایک روپے کی) چار سیر آتی ہے۔ اعلیٰ قسم کی موٹی بھیڑ ایک تقری ٹنکے میں آتی ہے۔ تقری ٹنکہ آٹھ ہشتگانوں کے برابر ہوتا ہے۔ ایک اچھا بیل بعض وقت دو ٹنکوں کا ملتا ہے اور بعض وقت اس سے بھی کم میں۔ بھینسوں کی بھی ایسی ہی قیمت ہے۔

۱۰ جیتل چار پیسے کا ہوتا تھا۔ جیتل اور یگانے کے دونوں کے قیمت میں برابر ہوتے ہیں۔

۱۱ ٹنکے دو طرح کے تھے۔ ایک عدنائی دوسرا نرنی۔ عدنائی یعنی سنہری ٹنکہ ساڑھے تیرہ ماٹھے کا ہوتا تھا روہیل ٹنکے کی آٹھ ہشتگانیاں آتی تھیں۔ ایک ہشتگانی مصر اور شام کے درہم کے برابر ہوتی تھی۔ اور ایک ہشتگانی کی چار سلطانیوں آتی تھیں۔ ایک سلطانی کے دو جیتل اور ایک جیتل کے چار پیسے آتے تھے



## جہاں آباد

# مغربی آسیاتوں کی نظر میں

سید زاہد علی

دور متوسط میں تاریخ نویسی کا ایک مخصوص نظریہ تھا۔ جس کو درباری مورخین نے بڑی خوبی کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔ تاریخ کا اصل مقصد دربار کے ماحول سے وابستہ مورخین نے صرف سیاسی تاریخ سمجھا تھا۔ جب کہ تاریخ ایک ہمہ گیر مضمون ہے۔ جس میں سماجی اقتصادی، علمی اور انتظامی مختلف پہلو آتے ہیں۔ اس طرح سیاست بھی تاریخ کا اہم جز ہے اور جس کا جاننا بھی بے حد ضروری ہے۔ اس دور کی روش، پس منظر اور معاشرہ کا مطالعہ بھی لازمی ہے کہ کن حالات میں مختلف سیاسی اشکال رونما ہوئیں۔ درباری مورخین نے صرف تخت نشینی، جنگوں بغاوتوں فتوحات اور بادشاہ کی دریادلی کو تفصیل سے بیان کیا، اقتصادی اور معاشی حالات کو نظر انداز کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاصر مورخین کی کتابوں میں صرف سیاسی حالات ملتے ہیں جو ایک خاص رنگ کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ یہ پوری تصویر نہیں اس کا ایک حصہ ہے۔

سماجی زندگی آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی ہے۔ جس کے لیے وقت کی معیاد پاشاہی فرامین یا قوانین مقرر نہیں کیے جاتے۔ موجودہ دور میں بھی دیکھ دو کہ بہت سے رواج موجود ہیں۔ جدید مورخین نے بھی سیاسی حالات کو بغیر کسی تنقید کے اپنانا شروع کر دیا۔ لین پول، اسمتھ، ہرولڈ لے ہیگ اور دوسرے مورخین نے بھی تاریخ کو جنگ و جدل کی صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے ہندوستان کے معاشرہ کے پس منظر کو نظر انداز کیا۔ ہندوستان کی ذات پات، طبقہ جاتی اختلافات قبیلہ جاتی تفریق نسلی اور ذراعتی ڈھانچہ کی طرف دھیان نہ دیا۔

لے پیٹر ہارڈی۔ ہسٹوری آف میڈول انڈیا۔ لندن ۲

عوام کی زندگی، تہذیب و تمدن کے مختلف پہلو، داخلی اور بیرونی اثرات ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کو ایسی کے لیے ضروری ہیں۔

معاشرہ کے مطالعہ کے لیے ہمیں یورپ کے سیاحوں کے سفر ناموں سے کافی مواد فراہم ہوتا ہے۔ دراصل اس کمی کو ان سفر ناموں ہی نے پورا کیا ہے۔ ہندوستان کے لوگوں نے یہاں کے رسم و رواج کو اہمیت نہ دی۔ کیوں کہ وہ ان کو جانتے تھے۔ لیکن یورپ کے سیاح اجنبی تھے۔ وہ یہاں کے رسم و رواج سے نا آشنا تھے۔ اس لیے انہوں نے یہاں کے رسم و رواج کے بارے میں بڑی دلچسپی کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کے سفر ناموں کا مقصد بادشاہ وقت کی

تعریف و توصیف نہ تھا۔ فرینچ ٹورنیر (FRANCOIS BERNIER) ہارکنس رو (MANOCHI TERRY) وغیرہ نے ہندوستان کے متعلق لکھا ہے۔ لیکن برنیئر اور ٹامس رو کے سفر نامہ معاشی زندگی کے لیے اہم ہیں۔ بہر حال ایسے سیاحوں کا شکر یہ ادا کیا جائے تو غیر مناسب نہ ہو گا۔

سفر ٹامس رو نے آگرے میں دو سال اور نو ماہ قیام کیا۔ برنیئر دارا کا معالج رہا اس کے بعد دانشمند خاں سے متعلق رہا۔ منوچی دارا شکوہ راہ جے سنگھ راہہ کرت سنگھ اور شاہ عالم اول سے وابستہ رہا۔ ٹیری کوریاٹ اور برنیئر نے فارسی سیکھنا شروع کیا۔ برنیئر تعلیم یافتہ اور اعلیٰ قوت مشاہدہ رکھتا تھا۔ اس لیے برنیئر کا سفر نامہ دوسرے سفر ناموں سے مقابلتا بہتر ہے۔ ملبوسات، زیورات اور آراستگی کے مختلف طریقہ ہر ملک کی آب و ہوا اور پیداوار کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہاں کے موسم کے مطابق لباس راج تھے۔ لیکن غیر ملکی اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ جمالیاتی تصورات میں بھی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ اورم (ANRAM) کے مطابق کپڑوں کی وہ طرز جو موجودہ دور میں راج ہے دراصل

۱۔ پٹیر ہارڈی۔ ہنوریز آف میڈول انڈیا۔ لندن۔ صفحہ ۳۔

۲۔ کرشن۔ مغل دور کے یورپین سیاح ۵ اسلامک کچنر۔ ۱۹۴۷-۱۹۴۸ JULY NO: 3 XXI, VOL

وہ ہزاروں سال پرانی ہے۔ یورپ کے سیاحوں نے مجموعی طور پر ہندوستانی لباس کو صاف ستھرا کہا ہے۔ ثروت مند لوگ ہر روز لباس تبدیل کیا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات ایک دن میں کئی لباس پہنے جاتے تھے۔ ڈیلا ویلا (DILA VILA) اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ اسے ہندوستانی لباس بہت پسند آیا وہ ایک جوڑا اپنے وطن اٹلی لے گیا اور وہاں کے لوگوں کو دکھایا۔ غریبوں کا لباس عمدگی اور قیمت میں امرار اور روسا سے کم ہوتا تھا۔ علماء صاف، قبا اور پانجامہ کا استعمال کرتے تھے۔ برنیر نے شاہ جہاں کے دور کے ایک ہندو عالم کے لباس کو تفصیل سے لکھا ہے جس سے وہ بنارس میں ملا تھا۔ مغل بادشاہ نے نئے نئے لباس ایجاد کرنے کے شوقین تھے۔ ہمایوں نے بھی ایک نیا لباس پہنا شروع کیا۔ بادشاہوں کے لباس عموماً سلک کے ہوتے تھے۔ جن پر زردوزی کا کام ہوتا تھا۔ ہیرے جو اہرات اور موتیوں کے زیورات بھی پہناتے تھے۔ شلوار اور بر جس پہننے کا بھی رواج تھا جو شہر کے اعلیٰ طبقے کے لوگ پہنا کرتے تھے۔ قبا عام طور پر ٹخنوں تک لمبی ہوتی تھی۔ بچوں کو سونے کی زنجیریں پہنائی جاتی تھیں۔ موزے عام طور پر لوگ استعمال نہ کرتے تھے۔ برنیر کے بقول ہندوستان میں اتنی سخت گرمی ہوتی ہے کہ یہاں بادشاہ بھی موزے پہننے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن موسم سرما میں کہیں کہیں موزے پہننے کے حوالے ملتے ہیں۔ ترکی فیشن کے جوتے پہنے جاتے تھے۔ جو آگے سے نوک دار اونچی ایڑی کے ہوتے تھے۔ تجارتی طبقے کے لوگ پیدل چلنے کی وجہ سے اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے تھے تاکہ تیزی سے چل سکیں۔ موسم سرما میں چمڑے کے سلپر اور کھڑاویں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ عورتوں کا لباس عموماً ساڑھی ہوتا تھا۔ سرخ رنگ اور دھاری دار کپڑے بے حد مقبول تھے۔

مسلمان عورتیں غراے پہنتی تھیں جو وزن میں ایک اولس سے کچھ اوپر ہوتے تھے اور قیمت میں چالیس پچاس روپے سے کچھ زیادہ ہوتے۔ عورتیں شلوار اور آدمی آستین کی قمیض پہنتی تھیں۔ مسلمان عورتیں شاہ جہاں کے دور میں سفید چادر یا برقعہ کا استعمال کرتی تھیں۔ لیکن غریب عورتیں ننگے سر رہا کرتی تھیں۔ مال دار عورتیں انواع و اقسام کے جوتے پہنا کرتی تھیں جن میں سونے چاندی کے پھول لگے ہوتے تھے۔

عطر، صندل کی لکڑی اور خوشبودار اشیاء کا استعمال بکثرت ہوتا۔ عرق چمیلی  
مولسری اور عنبر کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ شاہجہاں آباد (دہلی) میں جنگال کے تیار شدہ تیل  
بے حد مشہور تھے۔ مفلس لوگ ناریل کا تیل استعمال کرتے تھے۔ جب کہ امراء اور رؤسا اپنے  
جسم کو صندل و دیگر خوشبو بات سے معطر کیا کرتے تھے۔ سرمہ کا استعمال زیادہ نہ تھا۔ موجودہ  
دور کے مانند بالوں میں خضاب بھی لگایا جاتا تھا۔ عورتیں اور مردوں پان کھانے کے  
شوقین تھے۔ لکڑی، دھات اور سینگ کے کنگھے استعمال ہوتے تھے۔ بال بنانے کے مختلف  
طریقہ رائج تھے۔

بعض لوگ پیروں میں بھی بعض خوشبوؤں کا استعمال کرتے تھے۔ جو موجودہ صنعتی  
دور میں ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے دلچسپ بات ہے کہ اس زمانے میں بھی نانی آئینہ اور تولیہ  
لیے ہوئے گلی کوچوں میں پھرا کرتے تھے۔ ان کے پاس قینچی، آسترا، ناخن تراش وغیرہ ہوتے  
تھے۔ بال کاٹنے کی اجرت ایک یا دو پیسے سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ آج بھی شاہجہاں  
جامع مسجد اور لال قلعہ کے گرد و نواح میں اس قسم کے نانی ایک ٹین کا بکس لیے گھومتے  
دکھائی دیتے ہیں لیکن اب ان کی اجرت پیسوں میں نہیں بلکہ روپوں میں ہوتی ہے۔

عورتوں میں زیورات پہننے کا بہت شوق تھا، زیورات نہ پہننا بدشگونی تصور کیا جاتا تھا۔  
بازوبند، گجرہ، کنگن، جوا اور چوڑیاں اس دور کے عام زیورات تھے۔ زیورہ بیشتر سونے اور چاندی  
کے ہوتے تھے۔ لیکن غریب طبقہ کے لوگ معمولی دھاتوں کے زیورہ بھی پہنتے تھے۔ گجراتی ہندو  
زیورات بنانے میں مہارت رکھتے تھے۔ زیورات کے علاوہ یہ طبقہ ہیرے جواہرات کی  
تجارت بھی کرتا تھا۔

ہندو عام طور پر گوشت کا استعمال نہ کرتے تھے۔ لیکن پنجاب اور جنگال میں برہمن  
بھی کھاتے تھے۔ دہلی، لاہور اور آگرے میں مسلمان طرح طرح کے کھانے تیار کرتے  
تھے۔ برنیر اور میزیک (MEZIACK) نے آگرہ اور شاہجہاں آباد کے کھاؤں کے  
متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔

سرٹامن (TOMSON) کے مطابق شاہجہاں کے دور میں امراء اپنے مہمان کے

سامنے پچاس قسم سے زیادہ کھانے پیش کرتے تھے۔

شاہی مطبخ دکن، میں ہندوستان کے مشہور شہروں سے چیزیں اور مصالحہ معگوئے جاتے تھے منوچی کے بیان کے مطابق شاہ جہاں اورنگ زیب کے زمانے میں شاہی مطبخ میں ایک دن میں ایک ہزار روپے سے زیادہ خرچ ہوتا تھا۔ دہلی میں آگرہ کی مٹھائی (غالباً پیٹھا) مشہور تھی۔ منوچی نے آگرہ کی مٹھائی کی دوکانوں کی تعریف کی ہے اور برنیر نے شاہ جہاں آباد کی مٹھائی کی دوکانوں کی تعریف ہے۔ فصل کے پھل جیسے آم، رس بھریاں سنترے، کھجور، انجیر اور انگور وغیرہ بکثرت بازاروں میں فروخت ہوتے تھے۔ پھلوں کی درآمد بھی ہوتی تھی۔ امرار اپنے مہمانوں کی تواضع پھلوں سے بھی کرتے تھے۔ تقریباً بیس "کراؤن" ایک وقت کے ناشتہ پر صرف آتے تھے۔

برنیر شاہ جہاں آباد کے بازاروں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا تھا کیوں کہ یہاں سمرقند ابلخ اور بخارا کے پھل بھی بکثرت فروخت ہوتے تھے۔ مغل بادشاہ اور خاص طور پر شاہ جہاں گنگا اور جمننا کا پانی پیتے تھے۔ عام لوگوں کا کھانا سادہ ہوتا تھا۔ کھجڑی ایک دل پسند خوراک تھی۔ جو مکھن کے ساتھ کھائی جاتی تھی۔ بوار باجرہ اور گیہوں کی روٹی کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ گیہوں کا آٹا، ابلے ہوئے چاول اور سبزیوں کھاتے تھے گوشت مختلف طریقے سے تیار ہوتا تھا۔ بکرے، گائے، مچھلی اور بھیڑ کا گوشت کھایا جاتا تھا سیاہ مرچ اور گرم مصالحہ کا بھی استعمال ہوتا تھا۔

چاولوں کو بھی مختلف طریقوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ بریانی، قیمہ پلاؤ، وغیرہ بھی پکائے جاتے تھے۔ چاولوں کی خاص ڈش جس میں بادام، کشمش اور مکھن شامل کیا جاتا تھا۔ حلوہ، فالودہ کیورہ کے ساتھ تیار کیا جاتا تھا۔ بطخ اور خرگوش کا گوشت بھی استعمال ہوتا تھا۔ کھانے کے آداب سخت نہ تھے۔۔ ایک دسترخوان فرش پر لگا دیا جاتا تھا۔ اس کے چاروں طرف بیٹھ کر کھانا کھانے کا رواج تھا۔ دسترخوان سلک کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ان پر خوشنماہیل بوٹے یا گل کاری ہوتی تھی۔ چمچوں کا استعمال عموماً نہ ہوتا تھا۔ ہاتھوں سے کھانا کھایا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان کھلے عام شراب نوشی سے پرہیز کرتے تھے۔ اورنگ زیب کے علاوہ تقریباً تمام

مغل شہنشاہ شراب نوشی کرتے تھے۔ لیکن بابر اور جہانگیر شراب کے بے حد شوقین تھے۔ عام لوگ نشہ کے لیے تازی، میزا، اور مہوا وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ یہ درختوں کی جڑ سے بنایا جاتا تھا۔ ایون کھانے کا بھی رواج تھا۔ غریب لوگ بھنگ استعمال کرتے تھے۔ ۱۶۰۵ء عیسوی کے بعد سے ہندوستان میں تمباکو اور تمباکو نوشی روز بروز مقبول ہو رہی تھی۔ لوگ آلتی پالتی مار کر حقہ پیا کرتے تھے۔ کچھ علاقوں میں ٹور میں بھی حقہ پیتی تھیں۔ شیشہ تانبے اور پتیل کے حقے استعمال ہوتے تھے۔ منوچی کے مطابق صرف دہلی تمباکو پر پانچ ہزار روپے کا ٹیکس لگتا تھا۔ اس ٹیکس کی منسوخی پر غریبانے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ پان کھانے اور کافی پینے کا بھی رواج روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ امیر لوگ پان میں مشک، زعفران و دیگر قیمتی خوشبو پات ڈالتے تھے۔ دہلی اور احمد آباد میں کافی کی دوکانیں موجود تھیں لیکن موجودہ دور کے قہوہ خاؤں کے مانند نہ تھیں۔

شاہ جہاں کے دور میں تفریح کے ذرائع محدود تھے۔ شطرنج اور چوسر کے کھیل اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ میں مقبول تھے۔ شکار امراء اور رؤسا کا شوق تھا۔ چوگان کا کھیل ہندوستان میں گیارہویں صدی سے کھیلا جاتا تھا۔ لیکن کبڈی کے متعلق کچھ حوالے نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ تماشا گری یا بازی گروں کا ایک علیحدہ طبقہ موجود تھا۔ یورپ کے سیاحوں نے تماشا کے متعلق جا بجا لکھا ہے۔

منوچی کے بقول شہزادیوں کو اجازت تھی کہ مذاہمہ کہانیاں سن سکیں۔ رقص دیکھیں۔ پھولوں کے حسین اور گداز بستروں پر لیٹ کر عشق و محبت کی کہانیاں سنیں، باغات میں چل قدمی کریں اور بہتے ہوئے پانی کی آواز کا لطف اٹھائیں۔ پرندوں کے نغموں سے اپنے دل کو آشنا کریں۔ تاش شطرنج، چوسر، چنڈل منڈل (ایک قسم کی چوسر جس میں سولہ سے چونتیس ٹکڑے کھلاڑیوں میں تقسیم کیے جاتے تھے) نرد (پندرہ آدمیوں کے دو گروپ، ایک لکڑی کے ٹکڑے پر چوبیس خانے بنے ہوتے تھے، یہ کھیل کھیلتے تھے)، وغیرہ اس دور کے عام کھیل تھے۔ پچھلی کا کھیل اکبر کے دور میں بے حد مقبول تھا۔

گٹیوں کا کھیل بھی امراء اور عوام میں پسند کیا جاتا تھا۔ دو گٹی، تری گٹی، نو گٹی اور بارہ

گٹی کے مختلف کھیل ہوتے تھے۔ کشتی اور مگابازی کے بھی مقابلے ہوتے تھے۔ جس میں بیشتر ایرانی اور ترکی مگاباز حصہ لیتے تھے

نیراندازی اور تلوار چلانا اس دور کا فیشن تھا۔ ہر جوان آدمی سے یہ اُمید کی جاتی تھی کہ وہ تلوار اور تیر چلانا جانتا ہوگا۔ جانوروں کی لڑائی دیکھنے کا بھی رواج تھا جو موجودہ دور میں تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ شاہ جہاں نے کشمیر کے سفر کے دوران مختلف جانور کی لڑائی سے لطف اندوز ہوا۔ نیل گائے، بہرن چیتا اور شیر کا شکار بھی کیا۔

کتوں اور باز کو شکار کے مقصد کے لیے خاص تربیت دی جاتی۔ جو شاہی شکار میں مددگار ثابت ہوتے تھے، مچھلیاں پکڑنا، کشتی چلانا، گھوڑ سواری اور جانوروں درندوں کی لڑائی پسندیدہ کھیل تھے۔ بکریاں، مرغے، بٹر، بارہ سنگھے، بہرن، کتے، بیل اور بلیس کو لڑوایا جاتا تھا۔ لیکن بادشاہ خطرناک درندوں کی لڑائی سے بھی لطف اٹھاتے تھے۔ جس میں شیر، ہاتھی، چیتا اور دوسرے وحشی درندے شامل ہوتے تھے۔ دہلی اور آگرہ میں اس قسم کی لڑائی (کھیل) کے لیے وسیع میدان بنائے جاتے تھے۔ برنیر نے ہاتھیوں کی لڑائی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ میدان کے بیچ میں ایک دیوار بنوائی جاتی تھی۔

کچھ دفعہ کے ساتھ ہاتھیوں میں لڑائی ہوتی۔ دانت اور سوئڈ زخمی ہو جاتے تھے۔ مٹی کی دیوار توڑ کر ہاتھی اپنے مقابل دشمن کو زخمی کرتا۔ ہاتھیوں کو علیحدہ کرنے کے لیے چرخی گھومتی مشعل استعمال کی جاتی تھی۔ کیوں کہ ہاتھی آگ سے ڈرتے ہیں۔ یہ ہاتھی سیلون سے آتے تھے۔ لیکن ان کو جنگ میں شریک نہ کیا جاتا تھا۔ جادوگر اور تماشاگر (نٹ کا تماشا کرنے والے) شاہ جہاں کے دور میں جا بجا ملتے تھے۔ جن کا حال یورپ کے ستیا جوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ لکھا ہے۔ جو موجودہ دور کے مانند گلی کوچوں میں گھوما کرتے تھے۔

برنیر نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ یہ عقلمند

لوگ (جیوتشی) دھوپ میں سڑکوں کے کنارے بیٹھا رہا کرتے تھے۔ ایک گرد آلود دری ہوا کرتی تھی۔ تھوڑا سا پیرانا حساب کتاب کا سامان سامنے پڑا ہوتا تھا۔ جس پر ستیاریوں اور ستاروں کے نقش اور نام بنے ہوتے تھے۔ یہ لوگ غریبوں کو ایک پیسہ لے کر ان کی آئندہ

قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔ ہاتھ اور چہرہ دیکھ کر بتاتے تھے۔ بے وقوف عورتیں سفید چادروں میں لپٹی لپٹائی جیوتشیوں کے پاس جوق در جوق آتی تھیں۔ اور وہ راز ہوا اپنے شوہروں سے پوشیدہ رکھتی تھیں وہ جیوتشیوں سے کہتی تھیں آج بھی اگر ہم وکٹوریہ ہسپتال (کستور بہ ہسپتال) کے باہر سڑک پر چلیں تو جیوتشی بیٹھے ہوئے دکھائی دیں گے۔ وہی پرانی چادر کچھ کتابیں اور کچھ ہاتھ کی لکیروں وغیرہ کے نقشہ سامنے رکھے ہوں گے۔ ان کو دیکھ کر شاہ جہاں کے دور کی دہلی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ سوہویاں اور سترہویں صدی اور بیسویں صدی میں انسان ایسے موجود ہیں جو سیاروں کی حرکت سے متاثر ہوتے ہیں۔ آج سائنسی تکنیک کا دور ہے، لیکن قدیم ہندوستانی تہذیب کے نشانات باقی ہیں۔

رقص کرنے والی عورتوں کی جماعت علیحدہ ہوتی تھی جو تہواروں کے موقع پر بلانی جاتی تھیں۔ وہ اپنے گاؤں اور رقص کے ذریعہ مہمانوں کی تواضع کرتی تھی۔ دہلی اور آگرہ میں یہ عورتیں معقول اجرت پر کام کرتی تھیں۔ یہ لڑکیاں (کینچی) کہلاتی تھیں۔ اورنگ زیب کے علاوہ تمام مغل بادشاہ ان کے گاؤں اور رقص سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ شاہ جہاں اور جہاں گیر کا دور موسیقی کا دور عروج تھا۔ لیکن اورنگ زیب نے اس قسم کی عورتوں کو دربار میں آنے کی اجازت نہ دی۔

مشاعرے، قصہ گوئی، باغبانی اور مختلف میلے اور عرس بھی بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ گلستاں بوستاں اور ایرانی شعراء کے ابیات (اشعار) بے حد مقبول تھے۔ جہاں گیر اور شاہ جہاں کو باغات کا بے حد شوق تھا۔

اسلامی تہواروں کے علاوہ ایرانی تہوار بھی بڑی گرمجوشی کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ بنیر نے محل کے اندر جو مینا بازار لگتا تھا۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ اس میلہ کو امرار کی خوب صورت عورتیں ترتیب دیتی تھیں۔ جس میں سوزن کاری، گل کاری، کے اعلیٰ نمونے پیش کیے جاتے تھے۔ یہ حسین عورتیں دکاندار ہوتی تھیں۔ اور بادشاہ، بیگمات نیز شہزادیاں خریدار ہوتی تھیں۔ اگر کوئی امیر خوب صورت لڑکی رکھتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ وہ بادشاہ کی منظور نظر ہو جائے۔ کبھی کبھی بادشاہ خریداری میں ایک ایک پیسہ پر بحث



کرتا تھا۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد اپنی اپنی پسند کی چیزیں خریدتے تھے۔ اور فوراً قیمت ادا کرتے تھے۔ شاہ جہاں اس قسم کے بازاروں کا بہت دلدادہ تھا۔ اس قسم سے عورتوں کا بازار تقریباً ہر تہوار پر لگایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ عورتیں کچھ نیاں لگان جمع کرانے دیوان عام میں آتی تھیں۔ شاہ جہاں ان کو تمام رات ٹھہراتا تھا اور رقص و سرور کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔

بادشاہ کی یوم پیدائش اور تخت نشینی کا دن بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا۔ دن کا ایک بڑا حصہ اس تقریب میں صرف ہوتا تھا۔ یوم پیدائش پر بادشاہ امرار کے ساتھ اپنی والدہ کی قبر پر جاتا اور فاتحہ پڑھتا اور دعا کرتا۔

شاہ جہاں کے دور میں اکبر کے زمانے کی بعض رسومات کو ترک کر دیا تھا۔ لیکن یوم پیدائش پر تولنے کی رسم کو قائم رکھا۔ عبدالحمید لاہوری کے بیان کے مطابق وہ تمام اشیاء جن میں بادشاہ کا وزن کیا جاتا تھا وہ غیر بار اور مساکین میں تقسیم ہو جاتی تھیں۔ شاہ جہاں صرف سونے میں وزن کراتا تھا۔ امرار بادشاہ کو اس موقع پر تحائف دیا کرتے تھے۔ جاگیر عطا کی جاتی تھیں امرار کے گھر کی خواتین بھی ملکہ کو تحائف دیتی تھیں۔

ایرانی تہواروں میں نوروز کے علاوہ جشن آب پاشان، بھی بڑی مسرت سے منایا جاتا تھا۔ یہ تہوار بارش کی یاد میں ایرانی ماہ "میر" کی تیرہ تاریخ کو منایا جاتا تھا جس کا مقصد موسم بہار کو خوش آمدید کہنا ہوتا تھا۔ عبدالحمید لاہوری کے مطابق جہاں گیر اور شاہ جہاں اس تہوار کو "عید گلانی" کہتے تھے۔ کیوں کہ یہ دونوں شہنشاہ ایرانیوں سے زیادہ متاثر تھے۔

امرار شہزادے آپس میں گلاب چھڑکتے تھے۔ اکبر کے دور میں معمولی دیوالی، دسہرہ وغیرہ بھی منایا جاتا تھا۔ لیکن شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں بعض غیر مسلم تہواروں کی اہمیت پہلے سے کچھ کم ہو گئی تھی۔ محرم، عید میلاد، شبِ برات، عید الفطر، اور عید الفضحیٰ خصوصی طور پر منائے جاتے تھے۔ محلات ان خصوصی تہواروں پر روشن ہوتے تھے۔ دیوان عام میں آتش بازی بھی چھوڑی جاتی تھی۔

ہندو پریاگ، ہردوار تیرتھ یا ترا کے لیے جاتے تھے۔ مسلمان اجیر، پانی پت،

نظام الدین ادویاء کے عرس کی تقریبات میں شریک ہوتے تھے امرار (ہندو مسلم) کی عورتیں سختی سے پردہ کرتی تھیں۔ ان کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ غیر مردوں کے سامنے آسکیں عورتوں کو بیمار ف کے دوران بھی یہ اجازت نہ تھی کہ وہ مرد ڈاکٹر یا حکیم کا علاج کر سکیں۔ بغیر پردہ کے باہر جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر پاکی کے ذریعہ عورتیں ایک مقام سے دوسرے مقام جاتی تھیں۔ کہاں صرف مکان کے بیرونی حصہ تک پاکی لے جاتے اور وہاں سے پاکی کو عورتیں ہی اٹھا کر اندرونی حصہ تک لے جاتیں۔ لڑکیوں کی پیدائش کو اچھا نہ سمجھا جاتا تھا۔ محل میں لڑکے کی پیدائش پر جشن ہوتا تھا۔ لیکن لڑکی کی پیدائش پر صرف حرم میں عورتیں ہی خوشیاں مناتی تھیں۔

شادی سے پہلے لڑکی کو دکھانے کا رواج نہ تھا۔ کم عمر میں شادیاں ہوتی تھیں۔ کچھ طبقوں میں دوہا کے گھروالے دولہن کے گھر والوں کو روپیہ دیا کرتے تھے۔ عام طور پر عورتیں اپنے شوہر کے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ عورتوں کا مقام سماج میں بلند نہ تھا۔ بلکہ وہ شوہروں کے ماتحت رہا کرتی تھیں۔ پردہ کے باوجود عورتوں میں علم و ادب کا بھی شوق تھا۔ دولت مند گھروں کی لڑکیاں تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتی تھیں۔

تعلیم کے لیے مدرسے قائم تھے۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی علمی ادارے موجود تھے۔ ہندوؤں میں سنسکرت لازمی پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ پنڈت چاروں دید پڑھاتے تھے۔ فلسفہ، ویدانت، گرامر، پوران وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

دہلی آگرہ، لاہور، گجرات اور کشمیر تعلیم کے اعلیٰ مراکز تھے۔ دہلی میں مختلف ادارے قائم تھے۔ جہاں پر علمائے مدرسین کام کرتے تھے الغرض ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیم مذہب کے اثرات سے خالی نہ تھی باہم انگانے ایک مدرسہ خیر المنازل کے نام سے قائم کرایا تھا۔

جو پرائے نے قلعہ کے مغربی دروازے کے سامنے قائم تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت کا مدرسہ تھا جس میں طلباء کے رہنے کا بھی انتظام تھا۔ ہمالیوں کے مقبرہ کے احاطہ میں ایک دوسرا مدرسہ بھی قائم تھا جس کا نام دار البقا تھا جو جامع مسجد کے جنوب کی طرف واقع تھا۔ منقولات و معقولات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیم کی تکمیل تقریباً بارہ سال میں ہوتی تھی۔ برٹیر نے دہلی، آگرہ، بنارس کے علمی کارناموں کی تعریف و توصیف کی ہے۔

# منوچی

BY NICCOLO MANUCCI, TRANSLATED WITH INTRODUCTION  
 BY INDIAN TEST SERIES, STORIA D. MOGOR (MUGHAT)  
 WILLIAM IRVINE  
 VOLUME II  
 ABLE MORLE STREET, HONDON  
 PUBLISHED BY  
 THE GOVT. OF INDIA 1907

منوچی (MANUCCI) ہندوستان میں ایک طویل عرصہ گزارا ۱۶۵۳-۱۷۰۸ کے  
 دوران اتنے برسوں پر پھیلے ہوئے ایک نہایت اہم تاریخی دور میں اس نے معاصر معلومات  
 کو جمع کیا یہاں کے مذہبی، تہذیبی اور تاریخی روٹیوں کے بارے میں جن حالات و معاملات  
 تک اس کی براہ راست یا بالواسطہ رسائی ہوئی انہیں ان تمام تفصیلات کے ساتھ ریکارڈ  
 کیا جو اس کی نگاہ میں زیادہ اہم اور ضروری تھیں۔

اس کی سیر و سفر کا منظر اور خیر و نظر کا حلقہ مغل سلطنت سے لے کر بیجاپور اور  
 گول کنڈہ کی عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں تک پھیلا ہوا ہے اس میں شیواجی

سے متعلق مغل مہارت اور فتح و شکست کے وقایعات کو بھی شامل رکھیے کہ ان کے بغیر اس عہد کے سیاسی امور اور بدلتے ہوئے نقوش و آثار پر تاریخی اعتبار سے نظر واری ممکن نہیں تاریخی شخصیتوں، تاریخی اداروں اور تہذیبی ردیوں سے متعلق منوچی نے بعض نہایت اہم تصویریں بھی اپنی اس تاریخی کتاب میں شامل کی ہیں یہ تصاویر زیادہ تر مغل، موقلم کی پیش کش ہیں اور عہد اور نگ زیب اور کچھ بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور نگ زیب کی ایک سے زیادہ تصاویر کے ماسوا جس میں اُس کے دور آخر کی بھی ایک تصویر شامل ہے۔ ایک ایسی تصویر بھی دی گئی ہے جس میں اُسے دارا شکوہ کا سر، ایک طشت زریں رکھ کر پیش کیا جا رہا ہے۔

تصویروں کے ذیل میں، شہزادہ محمد، شہزادہ محمد معظم، شہزادہ محمد اعظم، شہزادہ محمد اکبر اور شہزادہ کام بخش کی تصاویر خصوصیت کے ساتھ شامل ذکر ہیں، امرا میں جسونت سنگھ مرزا راجہ جے سنگھ، غازی الدین خاں فیروز جنگ، امیر الامرا شایستہ خاں وغیرہ کی تصویروں کو اہمیت حاصل ہے۔

سلاطین گول کنڈہ و بیجا پور سے متعلق ایسی الگ الگ دو تصویریں بھی ہیں جن میں ان خاندانوں کے حکمرانوں کو یکے بعد دیگرے ایک ہی مجلس میں دکھلایا گیا ہے شیواجی کے ماسوا افضل خاں کی تصویر کو بھی اس کے صفحات کی سیر کے دوران دیکھا جاسکتا ہے۔ سنی ہوتی ہوئی ایک جوان عورت کی شبیہ بھی یہاں موجود ہے دکن اور ہندوستان کی عورتوں کی تصویریں۔ چندول محاذ، محل اور ڈولے جیسی سواریوں کی صورت و ہیئت کو سمجھانے کے لیے تصاویر دی گئی ہیں۔

اور نگ زیب کے عہد کے امرا، صوبہ جات ان کا گوشوارہ آمدنی سواری خاص کے ہاتھیوں شاہی گھوڑوں کی تعداد جیسی فروری اور نیم فروری باتوں کی تفصیلات ان جلدوں میں موجود ہیں جن کی مدد سے اس دور کو بہت کچھ سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن نقشے MAPS اور خاکے ان صفحات و اوراق میں نہیں ملتے۔

ہندوستانی تہذیب اور شاہی و شہری جشنوں اور جلوسوں کی شکل میں ہم دہلی کے

شاہی شہر کو بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن منوچی نے براہ راست دہلی شہر پر بہت کم لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اس کی اہمیت زیادہ تر سرسری ہے۔

## (منوچی)

صوبہ دہلی مغل سلطنت کے شمال مغربی حدود کے اعتبار سے وسط میں واقع ہے۔ اس کے دارالریاست کا نام بھی یہی (دہلی) ہے یہ وہ شہر ہے جہاں مغل شہنشاہ کا قیام رہتا ہے اور جہاں وہ دربار کرتا ہے۔

اسی جگہ ہندو راجاؤں کا قیام رہتا تھا۔ یہیں پٹھان اور غلام خاندان کے اکتیس سلاطین اپنے اپنے دور حکومت میں رہے ان کے مغل امرا اور صوبے دار بھی یہیں قیام کرتے تھے جنہوں نے دہلی اور اس ملک کے بڑے حصے پر حکومت کی ہے اس میں سید اور مسلمانوں کے دور حکومت سے پہلے کے راجپوت راجہ بھی قیام فرما رہے تھے کوتاہ تمام مسلمان شرفار و اورنگزیہ مستقر رہا۔

اگرچہ یہ مرکزی دربار کا شہر ہے پھر بھی یہاں صنعت کار، مینوفیکچررز زیادہ نہیں ہیں لیکن یہ علاقہ زرعی پیداوار کے لحاظ سے بہت زرخیز ہے اور جن شاہی پارچہ جات کے بارے میں میں نے لکھا ہے وہ یہیں سے حاصل کیے جاتے ہیں اس کے اطراف و جوانب میں ہنوز ان آثار کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے دور حکومت کے آثار باقیہ اور ان کے تعمیر کردہ محلات اور قلعوں کے کھنڈر ہیں۔

انہیں میں ایک تغلق آباد ہے جو نويس پٹھان بادشاہ نے بنوایا تھا اور جس کا بڑا حصہ ابھی باقی ہے وہ سلطان زادہ جو تغلق شاہ کہلاتا تھا اس نے نو سال اور نو دن حکومت کی وہ اس وقت اچانک موت کا شکار ہو گیا جب وہ مذکورہ ایک مصنوعی شاہی محل کے دروازہ سے گذر رہا تھا اور اس سانحہ میں اس کے بیٹے محمد بن تغلق کی فریب کارانہ تدبیر کو دخل تھا۔ اس کے بیٹے نے اس کے لیے موت کا جال تیار کیا تھا جو اس کے قدم رکھتے ہی اس پر آپڑا اور وہ اجل رسیدہ و بیگناہ سلطان موت کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس واقعہ یا پھر بعض وجوہ

کے باعث یہ صورت تھی کہ سلاطین اپنے بیٹوں پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔

اس صوبہ میں دوسرے کہنہ آثار بھی ہیں جہاں مسلمان گاہ گاہ اپنی روحانیت پسندی اور پر تقدیس جذبات کے تحت جلتے اور قیام کرتے ہیں مثال کے طور جہاں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی مزار ہے یعنی قطب صاحب کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو اہل عقیدت کی نگاہ میں بڑی عظیم روحانی شخصیت تھے۔ اس کے علاوہ حضرت سلطان المشائخ کا روضہ شریف ہے میں نے ان مزارات پر ایسی باتیں ہوتی ہوئی دیکھی جن کے ذریعہ بھولے بھالے عقیدت مندوں کو (نذر و نیاز پر) اکایا جاتا ہے۔ درجوتوہم پرستی کے ماسوا کچھ نہیں۔

عام طور سے بادشاہ اپنے سلطانی اصطبل میں پچاس ہزار گھوڑے رکھتا ہے اور یہ تعداد ان گھوڑوں کے علاوہ ہے جو روزمرہ کے شاہی اور اس کے معمولات میں کام آتے ہیں اور وہ بھی تقریباً اتنے ہی ہوتے ہیں۔ مغل شہنشاہ کے پاس بیس ہزار پیدل فوج ہے جو سب کے سب راجپوت ہیں۔ ان میں بارہ ہزار کے قریب لشکری توپ خانے سے وابستہ ہیں باقی آٹھ ہزار شاہی قلعہ کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں۔ گھوڑ سوار سنتری وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔

کا تعلق ہے ان میں

ROYAL ESTABLISHMENT. جہاں تک شاہی امور ات

ایک چوکی خاص کا داروغہ ہوتا ہے اور یہی اس کا رسمی نام (داروغہ چوکی خاص) بھی ہے یہ امر منتخب سپہداروں میں سے ہوتا ہے یہ اس لیے کہ اس کا تعلق، معتمد سپاہیوں سے ہوتا ہے اور ان کا انتخاب معزز خاندانوں یا اشراف میں سے کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ چار ہزار گھوڑ سوار ہوتے ہیں یہ افسر غسل خانہ کا بھی انچارج ہوتا ہے۔

اس کے زیر احکام کچھ ملوک افسران بھی ہوتے ہیں جو اس کے اپنے آدمی ہوتے ہیں اور انہیں چیلہ کہا جاتا ہے۔ ایک اور افسر بھی ہوتا ہے جس کے تحت پانچ سو نیزہ بردار HALBERDIERS ہوتے ہیں جو طلائی (نیزے) MACES اٹھا کر چلتے ہیں ان کی تنخواہ تین سو روپے ماہانہ سے لیکر ایک ہزار ماہانہ تک ہوتی ہے اور یہ ان کے منصب کے مطابق ہوتا ہے وہ شہزادوں کے پاس خبر رسانی کے لیے ملازم رکھے جاتے ہیں یا پھر ایسی کوئی دوسری

کوئی اہم خدمت ان کے سپرد ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک اور آفیسر ہوتلے ہے ایک ہزار HALBERDIERS جس کی کمان میں ہوتے ہیں یہ چاندی کے MACES اٹھا کر چلتے ہیں۔ یہ بھی منصب دار ہوتے ہیں اور ان کی ماہانہ تنخواہ دو سو روپے سے پانچ سو روپے تک ہوتی ہے ان کے ذمہ یہ خدمت ہوتی ہے کہ یہ خطوط اور احکامات مغل سپاہ کے سپہ سالاروں اور ریکٹانوں کے پاس لے جلتے ہیں۔ جب دوسرے ملکوں کے سفیر آتے ہیں تو یہ ان کے درباری استقبال میں بھی شریک رہتے ہیں اور بعض دوسرے نسبتاً کم اہمیت کے کام انجام دیتے ہیں۔ ایک اور آفسر دو ہزار منصب داروں کا آفسر ہوتا ہے منصب داروں کا آفسر اس لیے ہوتلے ہے ان کے نیزے لوہے کے ہوتے ہیں۔ ان کو سپاہیوں کی تنخواہ کے برابر ہوتی ہے وہ مذکورہ ملازموں کے مقابلہ میں کم تر درجہ والے کام انجام دیتے ہیں۔

TRAVELS IN INDIA,  
JEAN - PAPTISTO TAVERNEIR  
BARON OF ALBONNE

WILLIAM CROOKE

اس کا ترجمہ وینٹائن بال نے کیا بعد ازاں یہ ولیم کروک  
کے مزید ایڈیشن کی صورت میں سامنے آیا جو ہندوستان کی سول سروس میں رہ چکے  
تھے۔ اسے اٹیلانٹک سلبٹرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز نیو ڈہلی نے دو دو ولیم میں چھاپا  
ہے۔

ٹیورنیر کے اس سفر نامے کا زمانہ 1667-1641 تک پھیلا ہے۔ یہ سیاح ہیرے  
جو اہرات کا تاجر تھا اور اس معنی میں شاہی شہروں اور درباروں تک اس کی رسائی  
قیمتی پتھروں کی معرفت ہوئی تھی اس نے اثنائے سفر میں ہیروں کی کھانوں کو بھی دکھا  
تھا۔ اس کے تعلقات بعض مشرکین سے بھی تھے۔

اس کی جو تصویر اس کتاب میں شائع کی گئی ہے اس کا پس منظر اندازاً قریباً اور  
خود ٹیورنیر کا اسلوب رٹینا ہے۔

وہ بھاری بھر کم لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ نیچا سا پھول دار فرغل اس نے پہن رکھا  
ہے۔ اس کی پگڑی کا اسلوب ترکش ہے۔

اولڈ دہلی

از  
ٹیورنیر

... یہاں یہ بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ لاہور سے دہلی اور دہلی سے اگرہ  
تک کا راستہ ایک ایسی شاہ راہ ہے جس کے دونوں طرف خوبصورت سایہ دار درخت



لگے ہوئے جن کا نظارہ آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔ لیکن یہاں اور وہاں ان درختوں میں ایسے درخت بھی ہیں جو سوکھ گئے ہیں، گر گئے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے درخت نہیں لگائے گئے۔

دہلی ایک بڑا شہر ہے جو دریا کے کنارے یا یہ کہیے اس کے قریب آباد کیا گیا ہے جو شمال سے جنوب اور پھر مغرب سے مشرق کی طرف بہتا ہے اور آگے چل کر خود دریا کے گنگا میں مدغم ہو جاتا ہے اس شاہی شہر کو شاہجہاں نے بسایا ہے اسی کے نام پر اس کو شاہجہاں آباد کہا جاتا ہے۔ شاہجہاں اگر شہر کے مقابلہ میں یہاں قیام کرنے کو ترجیح دیتا تھا کہ یہاں کی آب و ہوا اکبر آباد اگرہ کی بہ نسبت زیادہ خوش گوار ہے۔

اس پاس قدیم دہلی کا شہر اب کھنڈروں میں بدل گیا ہے اور جو حصہ قابل رہائش ہے وہاں زیادہ تر غریب لوگ رہتے ہیں۔ ان کی جھونپڑیاں بیشتر بانس کی کھچپوں اور گھاس پھونس سے بنائی جاتی ہیں جیسا کہ ہندوستان میں عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے شاہی دربار سے تعلق رکھنے والے تین چار ہی امراء ایسے ہیں جو قدیم دہلی کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ باڑے کی طرح ایک بڑے حصہ کو گھیر لیا گیا ہے اور وہاں ان کے ڈیرے تینو اور قناتیں لگادی گئی ہیں۔ ریلوے لائن جو سوئیٹ فادر بھی اسی پرانی دہلی میں رہا کرتے تھے۔

جہاں آباد بھی دہلی کی طرح اس کے جوار میں آباد شہر ہے جسے ایک سادہ سی سنگین دیوار اپنے اس پڑوسی شہر سے الگ کرتی ہے۔ پرائیویٹ لوگوں کے حویلی کے مکانات کافی بڑے بڑے اور کشادہ ہیں، ایک وسیع و کشادہ احاطہ کے وسط میں وہ حصہ مکان ہوتا ہے جہاں یہ لوگ رہتے ہیں اور وہاں تک کوئی نہیں جاسکتا جہاں ان کا زنان خانہ ہوتا ہے۔ شاہی امراء اور ارکان دولت کا بڑا حصہ شہر میں نہیں رہتا وہ شہر سے باہر بھی اپنے مکانات بنائے ہوئے ہیں تاکہ پانی سے قریب رہیں۔

جب دہلی کی طرف سے شاہجہاں آباد میں داخل ہوتے ہیں تو ایک لمبی چوڑی سڑک (فیض بازار) سامنے آتی ہے جس کے دونوں طرف بڑے بڑے چھبے دار مکانات بنے ہوئے ہیں جن کے سامنے چوترے اور چوکیاں ہیں دکانیں محراب دار ہیں جہاں خرید و فروخت کا

کاروبار ہوتا ہے یہ سڑک آگے بڑھ کر ایک چوڑا ہے تک جاتی ہے جہاں شاہی محل ہیں  
سے ایک اور سیدھا راستہ نکلتا ہے اور اس شاہی محل کے دوسرے دروازے تک جاتا  
ہے یہاں مینا بازار کے تاجروں سے متعلق مکان بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

شاہی محل اپنے نیم دائرے میں HALF LEAGUE کے قریب ہے اس کی دیواریں  
خوبصورتی سے تراشے ہوئے سرخ پتھروں کی دیواریں ہیں جن کے حفاظتی مرغولیس بنی ہوئی ہیں  
اور ایسی دس مرغولوں کے بعد ایک برجی آتی ہے ہر نما خندق پانی سے بھری رہتی ہے جس کے  
کنارے سنگ سرخ کے خوبصورت تراشوں سے آراستہ ہیں یہ سلسلہ ادھر سے ادھر تک  
چلا جاتا ہے۔

اس کا صدر دروازہ ایسا کچھ خاص پر شکوہ اور عالی شان نہیں یہی صورت اس پہلے  
کورٹ کی ہے جہاں تک امر اکو اپنے ہاتھی پر بیٹھ کر آنے کی اجازت ہے۔ اس سے آگے  
ایک لمبا چوڑا راستہ ہے جس کے ہر دو جانب خوبصورت دالان بنے ہوئے ہیں جن  
کے نیچے چھوٹے چھوٹے چیمبر ہیں یہ اصطبل خانے کے محافلوں کے لیے ہیں۔

سفید رنگ کے بیش قیمت بہت اور خوبصورت ریشمی کپڑے یہاں دستیاب  
ہوتے ہیں کپڑوں کے معاملہ میں بہت متمول ہے ان کے ماسو ابلوسا طلائی اور تقرنی سلمے  
ستارے ٹکے ہوتے ہیں یا پھر انھیں سنہرے روپے تاروں سے بنے جاتے ہیں یہ پردوں  
کے صافوں اور پگڑیوں میں کام آتے ہیں اور عورتیں زرتار ملبوسات سے اپنا لباس تیار کرتی  
ہیں اور ان سے اپنی آرائش و سجاوٹ کا کام لیتی ہیں اور جن چیزوں کا ذکر ہوا وہ سب یہیں  
تیار ہوتی ہیں اس کے آس پاس کے علاقے بہت سی مصنوعات تیار کرتے ہیں جنہیں لاکرا اس  
شہر میں جمع کر دیا جاتا ہے۔

## برنیر کا سفر نامہ

مشہور فرانسیسی سیاح برنیر کا یہ تاریخی نوشت نامہ جو ایک معاصر دستاویز کی سی حیثیت رکھتا ہے اُس سفر نامہ کے ترجمہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ جو شاہ جہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے ذیل میں یہ عبارت لکھی گئی ہے۔

”مشہور فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر کا بارہ سالہ روزنامہ“

موجودہ صورت میں نامہ تو یہ نہیں ہے لیکن اس دور کی تاریخ سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔ ترجمہ نگار کی حیثیت سے خلیفہ محمد حسین میر منشی ریاست پٹیالہ کا نام سرورق پر موجود ہے۔ اسے نغیس اکادمی کراچی نے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا ہے۔ کتابت الوری بیگم دہلوی نے کی ہے۔

برنیر اپنے پیشہ کے اعتبار سے ایک طیب تھا۔ اپنے ذوق سفر کی تسکین اور جہاں بہنی کی خواہش کی تکمیل کے طور پر اس نے ۱۶۵۶ء تا ۱۶۶۸ء کے دوران اس نے ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور زیادہ تر وقت مغل دربار سے وابستگی میں گزارا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ حضرت ظل سبحانی صاحب قرآن ثانی نظر بند کر دیئے گئے تھے اور ان کے بیٹے اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ غازی کا دور حکمرانی تھا۔ برنیر نے جو واقعات، اپنے سفر نامہ میں درج کیے ہیں ان میں بہت سے واقعات

اُس کے چشم دید ہیں اور بعض واقعات کو اس نے اپنے سفر کے دوران سنا اور قلم بند کیا ہوگا۔

بہر حال اس کا یہ سفر نامہ اس عہد کے لیے ایک تاریخی دستاویز ہے۔ جہاں تک دہلی کی تہذیبی زندگی سے متعلق برنیر کی نگارشات کا سلسلہ ہے وہ اس کے خطوط کی صورت میں ہے اور یہ خطوط اس سفر نامہ کی دوسری جلد میں ملتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی زبان سے اس کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ بعد ازاں کرنل ہیری مور بہادر نے ان کے چھوٹے بھائی خلیفہ سید محمد حسین کی مدد سے اسے اردو میں منتقل کیا۔

خود کرنل ہیری مور کا یہ بیان ہے کہ خلیفہ محمد حسین نے اس کو نظر اصلاح دیکھا تھا اور ترجمہ میں اپنی طرف سے ترمیمات اور اضافہ کیے تھے۔ ابتدائی ترجمہ کے دوران احمد الدین نامی کسی شخص نے اس کی مدد کی تھی۔

ایسی صورت میں یہ ترجمہ تمام تر خلیفہ محمد حسین کی عملی کوشش اور قلمی کاوش کا نتیجہ نہیں۔

بزنیر قلعہ مبارک اور اس کی شاہی تعمیرات کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کا تقابل پیرس اور دوسرے مقامات کی خوب صورت عمارتوں سے کرتا ہے۔ ایک سال اس نے مصر میں قیام کیا تھا وہاں سے وہ جدہ اور سورت وغیرہ مقامات سے ہوتا ہوا آگرہ اور آگرہ سے دہلی پہنچا تھا۔

راقم الحروف نے اس ترجمہ کو اپنی طرف سے بھی ایڈیٹ کیا کہ اس کی زبان بہت قدیمانہ اور بہت سے مقامات پر بہت ڈھیلی ڈھالی نظر آتی ہے۔

قریب چالیس برس کے گزرے کہ شہنشاہِ حال کے والد شاہ جہاں نے اپنی دائمی یادگار کے طور پر پرانی دہلی کے پاس ایک نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام اپنے نام پر شاہجہاں آباد یا اختصار کے ساتھ جہاں آباد رکھا اور اس کو دارالسلطنت بنانے کے لیے یہ وجہ قرار دی کہ گرمی کی شدت کے سبب آگرہ بادشاہ کے قیام کے لائق نہیں رہے۔ اس سبب سے کہ اس کی تعمیر کے لیے اکثر مصالحہ پرانی دہلی کے آس پاس کے کھنڈروں سے ہم پہنچایا گیا تھلہ پر دیسی آدمی پرانے اور نئے شہر میں تمیز نہیں کرتے، اور دونوں کو دہلی ہی کہتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں یہ نیا شہر اپنے بانی ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

### دہلی کا حصار

شہر دہلی ایک ہموار زمین پر جمنائے کنارے ہلالی صورت میں آباد ہے اور اس طرف کے سوا جھردریا کی جانب سے (جس پر کشتیوں کا پل بندھا ہوا ہے) محفوظ ہے حفاظت کے لئے شاہجہاں نامہ میں لکھا ہے کہ اس کی آدی شاہجہاں کے جلوس کے بارہویں سال مطابق ۱۶۰۸ھ اور ۱۶۳۸ء میں شروع ہوئی تھی اور خانی خاں نے اپنی کتاب منتخب اللباب میں لکھا ہے کہ نارنجوں میں سے جو شعرا نے اسکی بات کہی تھیں بادشاہ کو یہ مادہ پسند آیا (شہر شاہجہاں آباد) شاہجہاں آباد جبکہ صاحب آثار السناد نے اپنی سند پر میر تقی کا شی کا نکالا ہوا بتاتے ہیں۔ (س م ج)

لیے سب طرف پختہ شہر پناہ بنی ہوئی ہے اور ان برجوں سے جو سو سو قدم کے فاصلے پر شہر پناہ کے کناے بنے ہوئے ہیں اور اس کچے پختے سے جو قریب چار یا پانچ اپنچ (فرانسیسی) فٹ کے برابر اونچا ہے، قطع نظر کی جائے تو یہ بہت کچھ ناممکن ہے، کیونکہ نہ تو اس کے گرد خندق ہے، اور نہ کوئی اور پچاؤ کا سامان ہے۔ یہ حصا اگرچہ شہر و قلعہ دونوں پر محیط ہے، لیکن اسکی وسعت اتنی نہیں جتنی لوگ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ میں تین گھنٹہ کے عرصہ میں اسکے گرداگرد پھر گیا ہوں، حالانکہ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میرے گھوڑے کی چال فی گھنٹہ ۳ میل سے زیادہ نہ تھی۔ شہر کے گرد و نواح کی بہت سی آبادیوں کو جو بہت دور تک لاہوری دروازہ کی جانب بستی چلی گئی ہیں، اس میں شامل نہیں کرتا اور نہ پرانی دلی کے اُس آباد علاقہ کو اور نہ ان تین چار چھوٹی چھوٹی بستیوں کو جو شہر کے نواح میں ہیں۔ کیونکہ ان کو شامل کر لینے سے شہر کی وسعت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اگر پتھوں پتھ ایک سیدھا خط کھینچا جائے تو ساڑھے چار میل سے زیادہ ہو اور اگرچہ باغات وغیرہ کے پتھ میں آجانے کی وجہ سے میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ شہر کا کل دور کس قدر ہے، لیکن کچھ شک نہیں کہ بہت ہی

---

۱۔ صاحب آثار الصنادید نے کتاب "مرآت آفتاب نما" کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۲۴  
جلوسى مطابق ۱۱۶۵ھ موافق ۱۶۵۰ء شاہ جہاں کے حکم کے بموجب مٹی اور پتھر سے چار  
مہینے کے عرصہ میں طرہ لاکھ روپیہ کے خرچ سے یہ فیصل تیار ہوئی۔ مگر دوسرے برس  
برسات میں اکثر جگہ سے گر پڑی۔ اس واسطے از سر نو چونہ اور پتھر سے بنانے کا حکم ہوا  
سات برس کے عرصہ میں چار لاکھ روپیہ کے خرچ سے تیار ہو گئی۔ طول اس کا چھ ہزار  
چھ سو پونسٹھ گز ہے چار گز کی چوڑی اور نو گز کی اونچی ہے اور اس میں ستائیس  
برج دس گز کے قطر سے ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں جب سرکار عالیہ انگریزی کا تسلط ہوا تو یہ اکثر  
جگہ سے ٹوٹ رہی تھی، جس کو بہت خوبی سے درست کرایا گیا اور اجیری دروازہ کے باہر جو  
فازی الدین خاں فیروز جنگ پدر نظام الملک آصف جاہ کا مقبرہ تھا جو مدرسہ کے نام  
سے مشہور ہے۔ اس کو بھی اندر لے لیا گیا اور قریب ۱۸۰۰ء کے اسکے گرد بھی شہر پناہ بنا دی گئی۔

مختصر ہے۔ قلعہ جس میں شاہی محل سرا اور بادشاہی مکانات ہیں، قریباً نصف

(بقیہ حاشیہ صاحب آثار الصنادید کی تحقیق کے موافق پہلے اس شہر کا نام اندرپت تھا۔ اس باب میں بڑا اختلاف ہے کہ یہ نام بدل کر کب سے دہلی ہو گیا۔ "مرات آفتاب نما" میں لکھا ہے کہ یہ بات مشہور ہے کہ راجہ دلیپ نے جو چندر بنیوں میں ایک راجہ ہے، اپنے نام پر دلی آباد کی، لیکن یہ بات صحیح نہیں اس واسطے کہ ہندوؤں کی اگلی پوکھتوں میں چندر بنی راجہ دلیپ کا ذکر ہے، مگر کہیں دہلی کا نام نہیں۔ جہاں بھی لکھا ہے اندرپت ہی لکھا ہے اور تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ ۳۰۷ھ مطابق ۹۱۹ء میں نوروں کے خاندان میں سے ایک راجہ نے شہر اندرپت کے برابر دہلی بسایا اور اسی مصنف نے کتاب "نزمہ القلوب" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ چونکہ وہاں کی زمین زم زم تھی اور ہند میں دہلی زم زم زمین کو کہتے ہیں، جہاں مسیح نہ تھم سکے۔ اس سبب سے وہ بستی دہلی کے نام سے مشہور ہو گئی، مگر اس نہ میں نہ تو نوروں کی خاندان میں حکومت تھی اور نہ اس سبب سے دہلی کا نام پڑ جانا قرین قیاس ہے۔ اس واسطے یہ بات بھی قابل اعتماد نہیں اور مشہور بات جو صحیح بھی معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ بقول صاحب مرات آفتاب نما راجہ دہلو قنوج کے راجہ نے اس سبب سے کہ دلی کے راجہ اکثر قنوج کے تابع رہے ہیں، اندرپت میں اپنے نام پر شہر بسایا اور جب ہی سے اس کا نام دہلی مشہور ہوا۔ بلکہ اصلی نام دہلی کا دہلو ہے۔ جیسا کہ موافق روایت صاحب "جوہر الخروف" امیر خسرو نے جلال الدین خسرو شاہ کو خطاب کر کے دہلو کا لفظ اپنے اس شعر میں باندھا ہے۔

یا ایک اسپم بخش یاز اپور بفرما بارگی + یا بفرماں وہ کہ گردوں شینم ود دہلو روم

راجہ دہلو راجہ پورس یعنی راجہ نور والی کمایوں کا ہم عصر تھا اور اسی کی لڑائی میں مارا گیا اور قنوج تک راجہ نور کا عمل ہو گیا اور اسکے بعد سکندر اعظم نے راجہ نور پر تسلیم کے کنارے فتح پائی اور گنگا کے کنارے یعنی قنوج تک عمل کر لیا۔ یہ واقعہ ۶۲۲۸ قبل ولادت مسیح علیہ السلام میں ہوا کہ تخمیناً یہی زمانہ دہلی شہر کے بسنے کا معلوم ہوتا ہے۔ (س م ح)

---

۱۔ شاہجہاں نے اپنے جلوس کے بارہویں سال مطابق ۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸ء میں شاہجہاں آباد کی آباد کاری کا حکم دیا، اور بارہویں ذی الحجہ کو قلعہ بننا شروع ہوا۔ استاد حامد اور احمد معمار جو اپنے فن میں یکتا تھے، اسکی تعمیر کیلئے مقرر ہوئے۔ پہلے عزت خاں کو اسکا اہتمام ملا اور پانچ مہینے دو دن میں قلعہ کی بنیادیں کھدیں اور کچھ مصالحہ جمع ہوا، اور کہیں کہیں سے بنیادیں اونچی ابھر آئیں۔ پھر الہ وردی خاں کو یہ کام سپرد ہوا۔

دائرہ کی شکل کا ہے اور سامنے دریائے جمنا بہتا ہے اور قلعہ کی دیوار اور پانی کے مابین ایک ریتلا وسیع میدان ہے جس میں ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی جاتی ہے اور میروں اور ہندوں راجاؤں کی فوجیں بادشاہ کے ملاحظہ کے واسطے کھڑی کی جاتی ہیں جن کو بادشاہ محل کے چھروکوں میں سے دیکھتا ہے۔

قلعہ کی دیوار اپنی پرانی وضع کے گول برجوں کے لحاظ سے شہر پناہ کے مشابہ ہے، لیکن چونکہ یہ کچھ اینٹ اور کچھ لال پتھر کی بنی ہوئی ہے جو سنگ مرمر کے مشابہ ہے۔ اس سبب سے شہر پناہ کی یہ نسبت زیادہ خوبصورت ہے اور شہر پناہ سے اونچائی چوڑائی اور مضبوطی میں بھی زیادہ ہے اور شہر کے رخ چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھی ہوئی ہیں اور دریا کی جانب کے سوا قلعہ کے سب طرف پختہ اور عمیق خندق بنی ہوئی ہے۔ جس کی روکار کے پتھر صاف اور گھڑے ہوئے ہیں اور جو پانی سے بھری رہتی ہے جس میں کثرت سے مچھلیاں ہیں۔

یہ عمارت مضبوط نظر آتی ہے، لیکن اصل میں کچھ مستحکم نہیں ہے اور میری دانست میں ایک متوسط طاقت کا توپ خانہ اس کو فوراً زمین کے برابر کر سکتا ہے۔ اس خندق کے قریب ہی ایک بڑا باغ ہے جو پھولوں اور پودوں سے ہمیتہ بھرا رہتا۔ اور قلعہ کی عظیم الشان اور سرخ رنگ کی فصیل کے مقابل ہونے کی وجہ سے بہت خوش نما معلوم ہوتا ہے اور اس باغ کے متصل ایک بادشاہی چوک ہے، جس کے ایک طرف تو قلعہ کا دروازہ ہے اور

۱۰۵۸ء مطابق ۱۶۴۸ء یعنی تخت نشینی کے ۲۱ ویں سال میں بادشاہ

رحاشہ بقیہ) نے اس میں پہلا جلوس کیا۔ یہ ہشت پہل بنا ہے اور اس کا طول ایک ہزار گز اور عرض چھ سو گز کا ہے، جس کی کل زمین چھ لاکھ گز ہوئی اور اس حساب سے یہ اکبر آباد کے قلعہ کے دو گنا ہے۔ اس کی فصیل پچیس گز اونچی ہے اور گیارہ گز گہری بنیاد ہے۔ دیوار کا حجم بنیاد سے پندرہ گز اور اوپر سے دس گز کا ہے۔ اس کی خندق چوبیس گز چوڑی اور دس گز گہری بنی ہوئی ہے۔ جس کا محیط تین ہزار چھ سو گز کا ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر میں پچاس لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا اور کتاب مرآت آفتاب نما میں لکھا ہے کہ کروڑ روپیہ صرف میں آیا تھا۔ یعنی ۵۰ لاکھ قلعہ کے بننے میں اور پچاس لاکھ اسکے اندر کے مکانوں کی تعمیر میں خرچ ہوا تھا۔ (دس م ح)



دوسری جانب شہر کے دو بڑے بازار آن کر ختم ہوئے ہیں جو ملازم راجہ حسب معمول ہفتہ وار چوکی دینے آتے ہیں۔ ان کے خیمے اس چوکور میدان میں لگائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ کبھی ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہیں۔ قلعہ میں رہنے سے سخت عذرا کرتے ہیں۔ قلعہ کے اندر کا پہرہ امرا اور منصب داروں کا ہوتا ہے اور اسی جگہ صبح کے وقت بادشاہی گھوڑے جو اس کے قریب ہی ایک بڑے اصطبل میں رہتے ہیں پھرائے جاتے ہیں اور یہیں سواروں کی فوج کا میر بختی نئے بھرتی ہونے والے سواروں کے گھوڑوں کو دیکھتا بھاتا ہے اور اگر وہ ترکی نسل کے اور اچھے مضبوط اور پیمانہ کے لحاظ سے ہوں تو ان کی ران پر بادشاہ کا اور اس امیر کا داغ دلوادیتا ہے جس کی فوج میں وہ بھرتی ہوئے ہیں اور اس سے یہ فائدہ ہے کہ انہیں گھوڑوں کو دوسرے نئے سوار مستعار لے کر حاضری کے وقت پیش نہیں کر سکتے۔

اسی جگہ انواع و اقسام کی بے شمار چیزوں کی خرید و فروخت کے **جھوٹے غیب داں** لیے بازار لگتا ہے۔ جو پیرس کے یونٹس نی آف کی طرح ہرقم کے گتھالوں، بھان مینٹوں، ہندو اور مسلمان نجومیوں اور مالوں کا مرتب ہے اور یہ قابل نجومی دھوپ میں ایک میلا سا قالین کا ٹکڑا بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ جن کے پاس علم ریاضی کے کچھ پرانے آلات ہوتے ہیں اور سامنے ایک بڑی سی کتاب کھلی رہتی ہے۔ جس میں بارہ برجوں کی شکلیں بنی ہوئی ہوتی ہیں اور اس طود سے یہ راہ چلتے لوگوں کو پھیلانے اور فریب دینے ہیں عوام الناس غیب داں سمجھ کر ان سے رجوع کرتے ہیں اور یہ ایک پیسہ لیکر پیچارے حمقا کو بتاتے ہیں کہ ان کی قسمت میں آئندہ کیا ہوتا ہے اور ان کے ہاتھ اور چہرہ کو خوب دیکھ بھال کر اور کتاب کے ورق الٹ پلٹ کر یقین دلاتے ہیں کہ واقعی یہ کچھ حساب لگا ہے ہیں اور یہ لوگ جس کام کی بابت ان سے سوال کرتے ہیں، اس کے لیے وقت اور ساعت "یعنی مہورت بتاتے ہیں اور نادان عورتیں سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر اور ڈھکھان کے پاس جمع ہوتی ہیں اور اپنی تمام عمر کے معاملات کے بارے میں

لے ایک بڑے پل کا نام ہے جو شہر پیرس میں ندی پر بنا ہوا ہے۔ (س م ح)

ان سے پوچھ گچھ کرتی ہیں اور اپنے تمام دلی بھید ان سے کہہ دیتی ہیں۔ جس طرح فرانس میں ایک وسواسن عورت اپنے پادری کے پاس جا کر توبہ کے قصد سے اپنے تمام گناہ ظاہر کر دیتی ہے اور یہ بیوقوف اور جاہل یقین رکھتے ہیں کہ ستاروں کی تاثیر کا بدل دینا ان لوگوں کے اختیار میں ہے، ان نجومیوں میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز ایک دوغلہ پرتیگزر تھا۔ جو گوا سے بھاگ آیا تھا۔ یہ مسخرہ بھی اپنا قالین بچھائے بڑی تمکنت سے بیٹھا رہتا تھا اور اس کے پاس آلات نجوم کے بجائے صرف ایک پرانا جہازی قطب نما تھا،

اس کے علاوہ رومن کیتھک فرقہ کی نماز کی پرتیگزی زبان میں دو پرانی باتصویر کتابیں تھیں جن کی تصویروں کو کہتا تھا کہ فرنگستان میں برجوں کی صورتیں اسی طرح کی بنائے ہیں۔ ایک دن فرقہ جیسویٹ کے پشینوا فادہ بوزی صاحب نے اس کو اس کام میں مشغول دیکھ کر پوچھا کہ تو یہ کیا کرتا ہے تو اس نے شرمندہ ہونے کی جگہ یہ جواب دیا کہ ”ایسے بیوقوفوں کا نجومی ایسا ہی چلیے۔“ یہ ذکر میں، نا غریب نجومیوں کا کرتا ہوں جو بازاروں میں دکھائی دتے ہیں، جو منعم جو امیروں کے پاس آتے جاتے ہیں، وہ ان کو بڑا علامہ سمجھتے ہیں اور اس طرح یہ دولت مند ہو جاتے ہیں، تمام ایشیا میں یہ بے اصل و ہم پھیلا ہوا ہے اور خود بادشاہ اور بڑے بڑے امیران قریبی غیب دانوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیتے ہیں اور امیران کی صلاح کے کوئی ادنیٰ کام بھی شروع نہیں کرتے۔ یہ نجومی گویا آسمان میں لکھی ہوئی باتیں جانتے اور ہر ایک کے کرنے کے لیے مبارک گھڑی تجویز کرتے، اور ہر ایک کو قرآن سے فال نکال کر حل کر دیتے ہیں۔

وہ دو بڑے بازار جن کا ابھی ذکر ہوگا اور جو اس چوک میدان میں دہلی کے بازار آکر ملتے ہیں۔ ان کا عرض قریب پچیس یا تیس قدم کے ہوگا اور جہاں تک نظر پہنچتی ہے، وہ سیدھے چلے جاتے ہیں اور ان میں سے جو بازار لاہوری دروازہ کو جاتا ہے وہ بہت لمبا ہے۔ بہ لحاظ وضع عمارت یہ دونوں بازار ایک ہی سے ہیں اور جیسا کہ پیرس کا بازار معروف پلیس رائس ہے۔ اسی طرح ان کے بھی دونوں جانب کی دوکانیں موزاں ہیں، مگر اتنا فرق ہے کہ ایک تو ان کی عمارت خشتی ہے، دوسرے یہ کہ یہ ایک منزلی ہیں

ان کی چھتیں بطور ایک مسطح چبوترے کے کام دیتی ہیں اور یہ بھی تفاوت ہے کہ پولیس رائٹ کی دوکانوں کے برانڈے اس قطع کے ہیں کہ ان میں داخل ہو کر انسان بازار کے ایک سرے سے دوسرے تک جاسکتا ہے اور ان کی دوکانوں کے برانڈے علیحدہ علیحدہ ہیں، جن کے بیچ میں دیواریں حائل ہیں، ان میں بیٹھ کر دن کے وقت اہل حرفہ اور صراف اپنا اپنا کام کرتے اور بیوپاری اپنا مال خریداروں کو دکھاتے ہیں۔ ان محرابی برانڈوں کے پیچھے اسباب رکھنے کے لیے کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں، جن میں رات کے وقت سب اسباب رکھ دیا جاتا ہے اور بیوپاریوں کے رہنے کے لیے بالافانے بنے ہوئے ہیں جو بازار کی طرف سے خوبصورت نظر آتے ہیں اور ہوادار اور آرام کے قابل اور گردوغبار سے محفوظ ہیں اور ان کے گردوغبار سے محفوظ جھجھو صحن کے طور پر ہے جو لوگ ان میں رہتے ہیں، وہ رات کو اس میں سوتے ہیں، مگر ان اطراف میں کوٹھڑیوں کے اوپر جو بالافانے بنے ہوئے ہیں..... اکثر ایسے پست ہیں کہ بازار بخوبی دکھائی نہیں دیتے۔ ممتول بیوپاری دوکانوں پر نہیں سوتے، بلکہ کام کاج کے بعد اپنے اپنے مکانوں کو جو شہر میں ہیں چلے جاتے ہیں۔

ان دو کے علاوہ پانچ بازار اور ہیں اور اگرچہ ان کی وضع قطع بھی انہیں کے قریب قریب ہے لیکن ایسے لمبے اور سیدھے نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ گلیوں اور کوچوں میں بے شمار بازار ہیں جو ایک دوسرے کو منقطع کرتے ہیں۔ ان میں سے اگرچہ اکثر کے سامنے کی عمارت محرابی طرز کی ہے مگر چونکہ وہ ایسے لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں، جن کو عمارت کے تناسب کا کچھ خیال نہ تھا، اس لیے ان بازاروں میں بہت کم ایسے خوش قطع اور سیدھے اور عریض ہیں جیسے کہ وہ بازار ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

شہر کے گلی کوچوں میں جو منصب داروں کے حکام عدالت اور دولتمند رہائشی مکان | ہجروں اور رئیس لوگوں کے مکانات ہیں۔ ان میں بھی بہت سے اچھے خاصے خوش قطع ہیں، مگر اینٹ یا پتھر کے بنے ہوئے مکان بہت کھوٹے ہیں۔ کچے اور خس پوش ہیں وہ بھی اچھے لمبے اور مضبوط بانس کے چھروں سے بنائے ہوئے اور کھنگل اور سفیدی

کیے ہوئے ہیں اور یہ بے شمار خس پوش اور چھوٹے چھوٹے مکانات جو بڑے بڑے مکانات کے ساتھ خلط ملط ہیں، ان میں معمولی فوجی سواران گنت نفر خدمت گار اور نان بانی وغیرہ، جو بادشاہ اور لشکر کے ساتھ جایا کرتے ہیں رہتے ہیں اور ان کے سبب سے اکثر شہر میں آگ لگ جاتی ہے۔ چنانچہ پچھلے برس تین بار ایسی آگ لگی کہ تیز ہوا کے سبب سے جو گرمی کے موسم میں چلا کرتی ہے، قریباً ساڑھے ہزار چھیروں پر پانی پھر گیا اور چند اونٹ اور گھوڑے اور بہت سی پردہ دار عورتیں بھی جل بھن گئیں، کیونکہ یہ بیچاریاں ایسی شرمیلی اور اپاہج ہوتی ہیں کہ ناموم لوگوں سے منہ چھپانے کے سوا ان سے کچھ بن ہی نہیں آتا، چنانچہ جو عورتیں اس صدمہ سے ہلاک ہوئیں وہ اتنی ہمت نہ رکھتی تھیں کہ بھاگ کر پرج جائیں۔ ان کے اور خس پوش مکانوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال ہوتا ہے کہ سوائے اتنے فرق کے کہ آرام کے بعض سامان اس میں زیادہ ہیں۔ دہلی گویا چند دیہاتوں کا مجموعہ یا فوج کی چھاؤنی ہے۔

امراء کے مکان اکثر دریا کے کنارے اور شہر کے باہر ہیں۔ اس گرم ملک میں اسی مکان کو عمدہ سمجھتے ہیں جس میں سب طرح کا آرام ہو۔ اور سب طرف کی اور خاص کر شمال کے جانب کی ہوا آتی ہو۔ چنانچہ وہ مکانات عمدہ سمجھے جاتے ہیں، جن میں ایک اچھا صحن اور باغیچہ اور درخت اور حوض ہو اور دالان کے اندر یادروازہ میں چھوٹے چھوٹے فوٹے لگے ہوں، اور خوبصورت ہتہ خانے ہوں جن میں بڑے بڑے پنکھے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنی خنکی کی وجہ سے گرمی کے دنوں میں دو پہر سے چار یا پانچ بجے تک جب کہ ہوا ایسی گرم ہوتی ہے کہ سانس نہیں لیا جاسکتا یہ بہت آرام کی جگہ ہوتی ہے، مگر خانوں کی بہ نسبت اکثر لوگ خس خانوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے پاکیزہ کمرے ہوتے ہیں جو ایک قسم کی گھاس کی خوشبودار جڑوں سے بنائے جاتے اور چمن کے اندر اس عرض سے حوض کے قریب لگائے جاتے ہیں کہ خدمت گار لوگ چمڑے کی ڈولچیموں سے ان پر باہر کی طرف سے آسانی کے ساتھ پانی چمڑک سکیں۔ اور اس قطع کا مکان سب سے عمدہ خیال کیا جاتا ہے جس کے چاروں طرف قد آدم اونچے دالان ہوں، جن میں چاروں طرف کی ہوا آتی ہو اور ایک بڑے چمن کے اندر بنا ہو۔۔۔ اور فی الواقع کوئی عمدہ مکان ایسا نہیں ہے جس میں گھروالوں

کے سونے کے لیے صحن اور چوتڑہ نہ ہو، جہاں سے بارش یا آندھی کے وقت یا جب صبح کو سرد ہو اچلنے یا شبنم پڑنے لگتی ہے، پلنگ کو سر کا کر اندر لے لیا جاتا ہے۔ یہ شبنم اگرچہ زیادہ نہیں ہوتی، مگر بدن میں سرات کر جاتی ہے، جس سے اکثر ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے ہیں۔

اچھے گھروں میں نشست کا یہ طریقہ ہے کہ فرش کے اوپر روئی کا ایک بھاری اور قریب چار انگل کے موٹا گدیلا بچھا رہتا ہے، جس پر گرمی کے دنوں میں عمدہ سفید کپڑا (چاندنی) اور جاڑوں میں ریشمی قالین بچھلتے ہیں اور صاحب خانہ اور معزز اور ممتاز لوگ جو ملاقات کو آتے ہیں، اس پر بیٹھتے ہیں۔ اور دالان کے صدر میں ایک دو گدیے پکھے رہتے ہیں، جن پر ریشم کے ہلکے کام کی سوزنی پڑی رہتی ہے جس پر سنہری اور روپہلی تری کی دھاریاں بنی ہوئی ہوتی ہے۔

گدیے پر کنباب کا ایک گاؤ تکیہ بھی لگا رہتا ہے اور اس کے علاوہ اہل مجلس کے آرام کے لیے دالان کے گرد کنباب اور منحل اور پھولدار ریشمین کپڑے کے غلافوں کے چند اور تکیے بھی لگے رہتے ہیں اور دالان کے چاروں طرف زمین سے قریب دو یا ڈیڑھ گز اونچے، بہت معقول اور باقرینہ مختلف شکل کے طاق بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں عمدہ عمدہ چینی کے برتن اور گلدان رکھے جاتے ہیں اور دالان کی چھت منقش اور ملحق کاری کی ہوتی ہے، مگر انسان یا کسی اور جان دار شے کی تصویر اس پر نہیں ہوتی، کیونکہ یہ مذہب اسلام میں ممنوع ہے۔

یہ ہندوستان کے ایک عمدہ مکان کا تقریباً صحیح خاکہ ہے اور دہلی میں ایسے مکانات بہت سے موجود ہیں اور میں فرنگستان کے مکانوں کی ہجو سے صرف نظر کر کے بلا اندیشہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے دارالسلطنت کی عمارتیں اگرچہ فرنگستانی عمارتوں سے کسی طرح کی بھی مشابہت نہیں رکھتیں۔ تاہم خوبصورتی سے خالی نہیں۔ جو چیز کہ فرنگستان کے شہروں کی زینت و زیب کا باعث ہے، وہ خوشنما اور شان دار دکائیں ہیں جو دہلی میں نہیں ہیں اور اگرچہ یہ شہر ایک عالی شان اور طاقتور بادشاہ کے دربار کا مقام ہے، جہاں لازمی طور پر

ہر قسم کی بیش قیمت اشیاء کا جمع ہو جانا ایک ضروری امر ہے۔ تاہم کوئی ایسا بازار یہاں نہیں ہے جیسا ہمارا سینٹ ڈینس ہے جس کا مقابل اور ہمسرا غالباً تمام ایشیا میں نہ ہوگا۔ یہاں بیش قیمت مال اکثر مال خانوں میں دھرا رہتا ہے اور فرنگستان دہلی کی دکانیں کی طرح دکانیں بھراک دار اور بیش قیمت اسباب سے شاذ و نادر ہی آراستہ نظر آتی ہیں اور اگر ایک دوکان میں پشمینہ کمناب اور زر کار مندیلیں اور ریشمین کپڑے وغیرہ ہیں تو پاس ہی کوئی بچپس دوکانوں میں گھی تیل داں، چاول، گیسوں، جو وغیرہ بے شمار قسم کے اناج (جو نہ صرف ہندوؤں کی معمولی غذا ہے، جو کبھی گوشت نہیں کھاتے بلکہ غریب مسلمان اور بہت سے سپاہی بھی یہی کھاتے ہیں) گوروں میں بھرے ہوئے دھرے نظر آتے ہیں۔

البتہ ایک بازار ایسا ہے جس میں میوہ کھلا رکھا رہتا ہے اور اس میں بہت سی دکانیں ہیں جو گرمی کے موسم میں ایران، بلخ، بخارا اور سمرقند کے خشک میوؤں، بادام، پتہ، فندق، کشمش اور نند آلو اور جاڑوں میں بیہ اور سفید نہایت عمدہ اور تانے انگوروں (جورونی) کی ہتھ میں لگائے ہوئے ان ملکوں سے آتے ہیں، ناشپاتی اور تین چار قسم کے سیب اور نہایت عمدہ مردوں سے (جو جاڑوں بھر بکتے رہتے ہیں) بھری رہتی ہیں، مگر یہ میوے بہت مہنگے بکتے ہیں۔ ایک سردہ پونے چار روپیہ کو آتا ہے۔ !! بااں ہمہ اہل دہلی کو سب سے زیادہ مرغوب اور پسند ہے۔ امراء کے ہاں میوہ کثرت سے خریدا جاتا ہے چنانچہ مجھے یاد ہے کہ میرے "آفا" کے ہاں اکثر صبح کے کھانے کے موقع پر کوئی پچاس روپیہ کا میوہ صرف میں آتا تھا۔

گرمی کے موسم میں خربوزہ بہت سستا ہوتا ہے لیکن زیادہ لذیذ نہیں ہوتا اور بجز اس کے کہ ایران سے بیج منگا کر ایک اچھی اور کمائی ہوئی زمین میں بویا جائے جیسا امراء اکثر کرتے ہیں عمدہ خربوزہ میسر نہیں آتا بہر حال اس پر بھی اچھا اور عمدہ خربوزہ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں کی زمین موافق نہیں ہے اور ایک سال بعد یہ تخم بھی بگڑ جاتا ہے۔ گرمی کے موسم میں آم دو مہینے تک رہتے ہیں اور بہت کثرت سے اور سستے ملتے ہیں۔

— دہلی میں جو آم پیدا ہوتا ہے، وہ نہ تو کچھ اچھا ہی ہے اور نہ کچھ برا اور سب سے عمدہ آم بنگالہ، گول کُنڈا اور گول سے آتا ہے۔ جو فی الواقع نہایت عمدہ ہوتا ہے اور کوئی مٹھائی اس کی شیرینی اور خوشبو کو نہیں پہنچتی۔ تریبوز سال بھر ہوتا ہے، لیکن دہلی میں جو پیدا ہوتا ہے، وہ نرم اور بے مزہ ہے، اور رنگت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ البتہ کبھی کبھی امراء کے ہاں اچھا کھانے میں آتا ہے، جو باہر سے بیج منگوا کر بڑی احتیاط اور خرچ سے اگواتے ہیں۔

شہر میں حلوائیوں کی دکانیں کثرت سے ہیں، لیکن مٹھائی اچھی نہیں بنتی، گرد اور شہد کی مکھیوں سے بھری رہتی ہے۔ نان بانیا بھی بے شمار ہیں، مگر ان کے تنور ہمارے ہاں کے تنوروں سے مختلف وضع کے ہیں اور بہت بڑے ہیں اور اس سبب سے روٹی نہ تو عمدہ ہوتی ہے اور نہ خوب رسی ہوتی، البتہ جو روٹی قلعہ میں مکتی ہے، وہ کسی قدر اچھی ہوتی ہے امراء تو اپنے گھر پر ہی تیار کرا لیتے ہیں اور اس وجہ سے نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ اس میں دودھ مکھن اور انڈا خوب ڈالا جاتا ہے اور اگرچہ خوب پھول جاتی ہے مگر مزاجلی ہوتی کاسا ہوتا ہے اور زیادہ تر یک جیسی ہوتی ہے اور پیرس کی "گانس" اور دوسری روٹیوں کو ہرگز نہیں پہنچتی۔

اگرچہ بازار میں کئی قسم کے کباب اور قلیہ وغیرہ بکتا ہے، لیکن اس کا کچھ اعتبار نہیں کہ کس جانور کا گوشت ہے، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کبھی کبھی اونٹ یا گھوڑے، یا قریب المرگ بیل کا گوشت بھی ہوتا ہے۔ عرض کوئی کھانا جو گھر میں تیار نہ ہو، صحت کے لیے مفید نہیں ہے۔ — دہلی کے ہر گلی کوچے میں گوشت بکتا ہے، لیکن بکری کے گوشت کی جگہ دھوکے سے بھیڑ کا گوشت بھی دیدیتے ہیں، پس اس فریب سے بچنے کے لیے ہوشیار رہنا چاہیے۔ بیل کا گوشت اور خاص کر بھیڑ کا، اگرچہ مزے میں برا نہیں ہوتا، مگر گرم ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ نفع پیدا کرتا اور دیر مہنم ہوتا ہے۔ حلوان کا گوشت سب سے عمدہ ہوتا ہے، مگر چونکہ بازار میں شاذ و نادر ہی ملتا ہے، اس لیے زندہ جانور ہی خریدنا پڑتا ہے۔

بڑی دقت ہے کہ اس ملک میں صبح کا گوشت شام تک نہیں ٹھیرتا۔ دوسرے یہ کہ جانور دبلے ملتے ہیں اور اس وجہ سے گوشت بے مزہ ہوتا ہے اور قصابیوں کی دکانوں میں دُبی

بکریوں کا گوشت ملتا ہے جو اکثر سخت ہوتا ہے، لیکن خصوصیت سے میرا اس بارے میں شکایت کرنا نامناسب ہے، کیونکہ جب سے کہ میں ان لوگوں کے رویہ سے واقف ہو گیا ہوں، ایسا کم اتفاق ہوا ہے کہ مجھ کو روٹی یا گوشت اچھا نہ ملا ہو۔ چنانچہ میں خاص بادشاہی باورچی خانہ کے داروغہ کے پاس میں اپنا نوکر بھیج دیتا ہوں اور وہ خوشی سے عمدہ کھانا دیدیتے ہیں۔ جس پر ان کی لاگت اگرچہ کم لگی ہوتی ہے، مگر میں برضا مندی ایک اچھی قیمت ادا کرتا ہوں۔ چنانچہ میرا "آغا" مجھ سے یہ بات سن کر مہنسا کہ میں برسوں سے پوری اور چالاک سے اپنا گلدارہ کرتا ہوں۔ ورنہ پونے چار سو روپیے میں جو مجھے آپ کی سرکار سے ملتے ہیں، فاقوں کے ماے مر جاتا۔ حالانکہ فرانس میں صرف آٹھ آنہ روز میں ایک بادشاہ کا سا کھانا کھا سکتا ہوں۔

خصی مرغ دہلی میں بالکل نہیں دکھائی دیتا۔ کیونکہ اس ملک کے مچھلی اور پرندے لوگ جانوروں پر عموماً رحم کرتے ہیں، اگرچہ انسانوں پر رحم نہیں کرتے۔ جن کو محل سرا کے کام کے لئے خوب بناتے ہیں۔۔۔ پرند جانور کثرت سے بازار میں بکتے ہیں۔ اور پتھے اور سستے بھی ہیں۔ چنانچہ ایک چھوٹی قسم کی مرغی جس کا چمڑہ سیاہ ہوتا ہے اور جس کا نام میں نے "حبشی" رکھا ہے، وہ بھی بکتی ہے۔ کبوتر بھی ملتے ہیں، مگر بچے نہیں ملتے۔ کیونکہ ہندوستان کے لوگ بچوں کا مار ڈالنا بے رحمی کا کام سمجھتے ہیں۔ تیر بھی ملتے ہیں، مگر ہمارے ملک کے تیر سے چھوٹے ہوتے ہیں اور اس سبب سے کہ حال میں پکڑ کر دوپار سے زندہ لاتے ہیں، ایسے اچھے نہیں ہوتے جیسے کہ اور پرند ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت مرغیاں اور خرگوشوں کی ہے جو زندہ پکڑے جا کر بھرے ہوئے شہر میں آتے ہیں۔ ماہی گیر اپنے پیشہ میں ہوشیار نہیں ہیں، لیکن بعض اوقات اچھی مچھلی بھی بکتی ہے۔ خصوصاً "نگھاڑا" اور "دوہو" جو اپنے ہاں کی پانگ اور کارپ کی شکل کی ہوتی ہیں۔ مگر جاٹوں میں ماہی گیر مچھلی کم پکڑتے ہیں، کیونکہ اس ملک کے لوگ سردی سے اس سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں جتنا کہ اہل فرنگ گرمی سے خوف کھاتے ہیں اور اگر اس موسم میں اتفاق سے کوئی مچھلی آجاتی ہے تو خواجہ سرا اس کو فوراً خرید لیتے ہیں، کیونکہ وہ خاص طور سے



اس کے شائق ہیں اور مجھے معلوم نہیں کہ اس کا سبب کیا ہے۔ امرا کوڑے کے زور سے جو ہمیشہ ان کے دروازہ پر لٹکتا رہتا ہے، ان کو ہر ایک موسم میں مچھلی پکڑنے کو بھیجتے ہیں۔

آپ میرا یہ بیان سن کر غور فرما سکتے ہیں کہ کیا کوئی مچھلی خور شخص

بیس کو چھوڑ کر دہلی کی سیر کے لیے خوشی سے آئے گا بے شک امیروں اور

**بادۂ فرنگ** دولت مند لوگوں کو ہر ایک شے میسر ہے لیکن یہ صرف ان کے ملازموں کی کثرت اور کوڑے اور روپیہ کے باعث ہے۔ دہلی میں متوسط الحال شخص کوئی نہیں ہے یا تو بڑے بڑے عالی مرتبہ لوگ ہیں یا ایسے ہیں جن کی زندگی مصیبت سے بسر ہوتی ہے۔

چنانچہ باوجود اس کے کہ میری تنخواہ بھی معقول ہے اور میں خرچ بھی کرتا ہوں

بعض اوقات صاحب دل خواہ کھانا نہیں ملتا۔ وجہ یہ کہ اچھی چیز بازار میں نہیں ملتی اور

اکثر وہی چیزیں ملتی ہیں، جن کو امرا نے ناپند کر کے چھوڑ دیا ہو۔ شراب جو فرنگستان میں

کھانے کا بڑا جزو سمجھی جاتی ہے۔ دہلی کی کسی دکان میں نہیں ملتی اور اگرچہ دیسی انگلی کی

بن سکتی ہے، لیکن شرع اسلام اور شاستر کی رو سے ممنوع ہے۔ چنانچہ میں نے احمد آباد اور

گول کنڈہ میں بعض ڈپچ اور انگریزوں کے گھروں میں مے پنی سے۔ جو بد مزہ نہ تھی اور

سلطنتِ مغلیہ میں اگر کبھی عمدہ شراب ملتی ہے تو وہ شیراز یا جزائر کناری کی ہوتی ہے۔

چنانچہ شراب شیرازی تو ایران سے خشکی کی راہ سے بندرعباس میں پہنچ کر بدلیع جہاز سورت

میں آتی ہے۔ جہاں سے چھیا لیس دن کے عرصہ میں دہلی میں پہنچ جاتی ہے۔ اور جزائر کناری

سے ڈپچ لوگ سورت میں لاتے ہیں لیکن یہ دونوں قسم کی شرابیں اس قدر گراں قیمت ہیں

کہ بقول اس ملک کے لوگوں کے، ان کی قیمت ان کے مزے کو بے لطف کر دیتی ہے چنانچہ

ایک بڑا شیشہ جو تین انگریزی بوتلوں کے برابر ہوتا ہے، پندرہ یا سولہ روپیہ سے کم کو ہرگز

نہیں آتا اور جو شراب خاص اس ملک میں بنتی ہے اور جس کو یہاں عرق کہتے ہیں،

ایک قسم کی تیز اور تند شراب ہے جو گڑ سے بھسکے میں کھینچ کر بناتے ہیں، مگر اس کی فروخت

کی بھی سخت ممانعت ہے اور سوائے عیسائی مذہب کے لوگوں کے علانیہ کوئی شخص نہیں

پی سکتا، مگر یہ عرق ویسا ہی تند و تیز ہے جیسا کہ پولینڈ کے ملک میں اناج سے بناتے ہیں اور اگر اس کو تھوڑا سا بھی زیادہ استعمال کیا جائے تو علاج اعصابی امراض اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ پس عقلمند آدمی یہاں یا تو صرف خالص پانی پینے کی عادت رکھے گا یا نہایت عمدہ پیو کے شربت کی جو تھوڑی سی قیمت میں میسر آجاتا ہے اور کچھ ضرر نہیں کرتا۔ اصل یہ ہے کہ اس گرم ملک میں بہت ہی کم لوگوں کو شراب کی خواہش زیادہ ہوتی ہے اور کچھ شہ نہیں کہ یہ اپنی شراب نہ پینے کی عادت اور پسینہ کے بکثرت آتے رہنے کی وجہ سے بہت سی بیماریوں مثلاً نفرس، سنگ مثانہ اور امراض گردہ اور زکام نزلہ اور چوتھے تپ کو جانتے بھی نہیں۔ جو لوگ ان امراض کے شاکی یہاں آتے ہیں۔ جیسا کہ خود میرا حال تھا، وہ بہت جلد بالکل اچھے ہو جاتے ہیں اور اعضائے تناسل کی بیماریاں بھی جو اس ملک میں بکثرت ہیں اور ملکوں کی طرح نہ تو سخت ہی ہوتی ہیں اور نہ ویسے بڑے نتیجے ہی پیدا کرتی ہیں۔ البتہ اس ملک کے لوگ اکثر تندرست رہتے ہیں لیکن ویسی ہمت اور جرأت نہیں رکھتے جیسے کہ ہمارے ملک کے لوگوں میں ہے اور جسم اور طبیعت کی کمزوری اور کاہلی جو ملک کی نہایت درجہ کی گرمی کا نتیجہ ہے ایک ایسی بیماری سمجھنی چاہیے، جس میں ہر ایک شخص مبتلا ہے۔ اور جو فرنگستان کے لوگوں پر جو گرمی کے برداشت کے عادی نہیں ہیں، خصوصیت کے ساتھ اثر کرتی ہے۔

دہلی میں ہنرمند کاریگروں کے کارخانے بالکل نہیں ہیں، اس صناعتی اور کاریگری کا سبب یہ نہیں کہ ہندوستانی لوگ صناعتی اور کاریگری کی یافت نہیں رکھتے۔ کیونکہ ہندوستان کے ہر ایک حصے میں بہت سے ہوشیار اور ذہین لوگ پائے جاتے ہیں اور بے شمار خوبصورت چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں، جن کو لوگ بغیر کلوں کے بناتے ہیں اور جنہوں نے شاید کسی استاد سے بھی تعلیم نہیں پائی ہوتی اور بعض اوقات تو یہ لوگ یورپ کی چیزوں کی ایسے کامل طور سے نقل کرتے ہیں کہ اصل اور نقل میں فرق کرنا دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ منجملہ اس قسم کی اور اشیاء کے نہایت عمدہ شکاری بندوبست ہیں اور سونے کے زیور تو ایسے عمدہ بناتے ہیں کہ کوئی یورپین سارا ان سے بڑھ کر شاید

ہی بنا سکے۔

مصوری اور نقاشی کا بھی ایسا نازک اور باریک کام تیار کرتے ہیں کہ جسے دیکھ کر میں اکثر حیرت میں پڑ گیا ہوں۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی بڑی بڑی مہموں کی ایک شبیہ جو ایک مشہور اور نامی مصور نے ایک ڈھال پر سات برس کے عرصہ میں تیار کی تھی اس نے خصوصیت سے مجھ کو حیران کر دیا اور میں نے اس کو ایک عجیب کام خیال کیا۔ مگر ہندوستانی مصور اکثر تصویر میں تناسب اعضاء اور ان حالتوں کے ظاہر کرنے میں جو مختلف اوقات میں انسان کے چہرے پر نمایاں ہوا کرتی ہیں، کچے ہیں، لیکن اگر ان کو کوئی اچھا استاد اس فن کے اصول کی تعلیم دے تو یہ عیوب جلد رفع ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان کے اس دارالسلطنت میں دست کاری اور ہنرمندی کے اس اعلیٰ اہلیہ کے نمونوں کا نہ پایا جانا لوگوں کی کند ذہنی اور ناقابلیت کی وجہ سے نہیں ہے، اور اگر کاریگروں اور کارخانہ داروں کی کچھ ہمت افزائی جائے تو بے شک مفید اور عمدہ صنعتوں اور حرفوں کو ترقی ہو سکتی ہے، لیکن ان بے چاروں کو واجبی اجرت بھی نہیں ملتی، بلکہ ان کے ساتھ سختی برتی جاتی ہے اور دولت مند لوگ ہر ایک چیز ارزاں قیمت پر لینی چاہتے ہیں، اور کسی امیر یا منصب دار کو کسی کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے تو بازار سے بلوائیتا ہے اور بشرط ضرورت پیچارے سے جبراً کام لیتا ہے اور چیز کے تیار ہو جانے پر اس کی خوبی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ صرف اپنی شکل سے جو قیمت چاہتا ہے دیدیتا ہے اور کاریگر کوڑوں کی مار سے پرخ جانے کو ہی غنیمت سمجھتا ہے۔ پس اس حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ کاریگر اور کارخانہ دار لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہنر دکھانے میں سعی کریں، بلکہ ان کو تو شہرت اور ناموری پیدا کرنے کی کوشش کے بجائے صرف یہ فکر رہتی ہے کہ اس سے جلدی پیچھا چھوٹ جائے اور اس قدر ضرور مل جائے جس میں اوقات بسر ہو جائے۔ صرف وہی کاریگر اپنے فن میں کسی قدر کمال پیدا کرتے ہیں جو بادشاہ یا کسی صاحب اقتدار امیر کے نوکر ہیں اور صرف اپنے آقا کے لیے کام تیار کرتے ہیں۔

قلعہ میں محل سرائے شاہی نیز دوسرے اور محل ہیں، لیکن آپ یہ گمان  
لال قلعہ کریں ویسے ہی ہیں جیسے کہ لواریا اسکوریل میں، بلکہ ان کی کوئی چیز بھی  
 فرنگستان کی عمارت کے مشابہ نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے، مشابہ ہونا چاہئے  
 بھی نہیں، کیونکہ ان کے لیے اس ملک کی آب و ہوا کے موافق عمدہ اور شان دار ہونا ہی  
 کافی ہے۔

قلعہ کے دروازے کی عمارت میں کوئی قابل الذکر چیز نہیں ہے۔  
قلعہ کے دروازے بجز اس کے کہ پتھر کے دو بڑے ہاتھی بنا کر دونوں جانب کھڑے  
 کیے ہوئے ہیں جن میں سے ایک پر چتور کے مشہور و معروف راجہ جیمیل کی مورت ہے، اور  
 دوسرے پر اس کے بھائی فتا کی۔ جو دونوں بڑے بہادر اور شجاع شخص تھے اور ان کی  
 ماں ان سے بھی زیادہ دلیر تھی اور جو شہنشاہ اکبر سے اس طرح جان توڑ کر لڑے تھے  
 کہ ابد الابد تک ان کا نام ہے گا۔ اس عظیم الشان بادشاہ نے جب ان کے شہر کو آن  
 کر گھیر لیا تو یہ بڑے استقلال کے ساتھ اس سے مقابل ہوئے اور بجائے اس کے  
 کہ اپنے دشمن کی جس کو اپنے زور اور قوت پر بڑا گھمنڈ تھا، اطاعت قبول کریں، اپنی اور  
 اپنی ماں کی جان اپنے ملک پر قربان کر ڈالی اور یہ ان کی بے مثل جان بازی کی ہی وجہ  
 سے تو ہے کہ ان دشمنوں نے بھی یادگار کے طور پر ان کی مورتیوں کا قائم رکھنا مناسہ ہے  
 خیال کیا۔ یہ ہاتھی جن پر یہ دونوں بہادر سوار ہیں بڑے شان و شکوہ کے ہیں اور ان  
 کو دیکھ کر رعب اور ادب کا ایک ایسا خیال مجھ پر چھا گیا جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔

۱۔ یہ بادشاہی محل ہیں جس میں پہلا فرانس میں اور دوسرا اسپین میں ہے۔  
 ۲۔ ماژ عالمگیری میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے گیارہویں جلوس مطابق شہ  
 میں پتھر کے دو پورے قد کے ہاتھی جو نہایت عمدہ صنعت سے بنے ہوئے اور دروازہ قلعہ  
 کے دونوں جانب نصب تھے اور اسی وجہ سے اس دروازہ کو ہتھیاپول کہتے تھے شریعت  
 کے لحاظ سے ہٹوائے تھے۔ نعمت خاں عالی نے اپنی مشہور کتاب وقایع میں انی رائے

اس دروازے سے قلعہ میں داخل ہو کر ایک لمبا اور وسیع راستہ ملتا ہے۔ جس کے  
 بچوں نیچ پانی کی ایک نہر جاری ہے اور دونوں جانب پانچ یا چھ فرانسیسی فنٹ اونچا اور  
 چار فنٹ چوڑا اس طرح کا چوترا بنا ہوا ہے جیسا کہ پیرس کا پونٹ نی آتے ہیں، جس کو  
 چھوڑ کر دونوں طرف اخیر تک برابر دالان بنتے چلے گئے ہیں۔ جن میں مختلف کارخانوں  
 کے داروغہ اور دوسرے کم درجہ کے عہدیدار بغیر اس کے گھوڑے اور آدمی جو نیچے آتے  
 جاتے ہیں، ان سے ان کو کچھ تکلیف پہنچے بیٹھے ہوئے اپنا اپنا کام کیا کرتے ہیں، اور  
 منصب دار جو رات کو چوکی دیتے آتے ہیں، وہ بھی اسی چوترا پر بھرتے ہیں۔

قلعہ کے درمیان سے ایک نہر گزرتی ہے جس نہر کا پانی اول محل سرا میں جاتا ہے  
 اور پھر موقعہ بموقعہ سب مکانوں میں پہنچتا ہے اور اس کے بعد قلعہ کی خندق میں جاگتا  
 ہے اور یہ دہلی سے پندرہ یا اٹھارہ میل کے فاصلہ پر جمنائیں سے نکالی گئی ہے، اور  
 بڑی خندق سے میدان اور سخت پہاڑی زمین پر سے لائی گئی ہے۔

(حاشیہ یقینہ) نامی صیغہ حساب تنخواہ کے ایک عہدیدار کی بھومیں بھپتی کے طور پر جو یہ شعر لکھا ہے۔

آں صودتِ مہاوتِ فیلانِ ہتھیاپول

پاراچہ فیل بند حساب و کتاب کرد

اس سے بھی ان ہاتھیوں اور ہتھیاپول کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ اگر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہتھیاپول  
 قلعہ شاہجہاں آباد کے کون سے دروازہ کا نام تھا۔ صاحب آثار الضنادید نے ان ہاتھیوں کو  
 نقارخانہ کے دروازہ کے آگے بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس دروازے کو اسی سبب سے  
 ہتھیاپول کہتے تھے۔ پس صحیح بات وہی ہے جو ڈاکٹر برتیر اور صاحب آثار عالمگیری نے  
 اپنی آنکھوں دیکھی ہوئی لکھی ہے (دس م ص)

لے صاحب آثار الضنادید نے کتاب مرآت آفتاب نما کے حوالہ سے اس نہر کی بابت یہ  
 لکھا ہے کہ اول اس کو سلطان جلال الدین فیروز خلجی نے سنہ ۷۹۱ مطابق ۱۳۹۱ء میں  
 پرگنہ حضر آباد میں دریا سے کاٹ کر تیس کو س تک پرگنہ سفیدوں میں جہاں اس کی شکار گاہ

قلعہ کے دوسرے دروازہ کے اندر بھی ایک لمبی اور خاصی چوڑی سڑک ہے اور اس کے بھی دونوں جانب ویسے ہی چبوترے ہیں، لیکن محراب دار دالان کے بجائے دکانیں بنی ہوئی ہیں اور پتھر پوچھے تو یہ ایک بازار ہے جو لداؤ چھت کی وجہ سے جس میں اوپر کی طرف روشنی اظہ ہوا کے لیے بڑے بڑے گول گول روشن دان بنے ہوئے ہیں اور گرمی اور برسات میں بہت آرام دہ ہے۔ ان دونوں سڑکوں کے سوا دائیں بائیں اور بھی چھوٹی چھوٹی سڑکیں ہیں جو ان مکانات کی طرف جاتی ہیں جہاں معمول کے موافق امراباری باری ہفتہ میں ایک رات دن چوکی دیا کرتے ہیں۔ یہ مکانات جہاں امراباری چوکی دیتے ہیں، اچھے عمدہ ہیں، کیونکہ یہ لوگ ان کو اپنے خرچ سے آراستہ رکھتے ہیں اور یہ سب بڑے بڑے دیوان خانے ہیں اور ان کے سامنے باغیچے ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی نہریں اور حوض اور فوارے بنے ہوئے ہیں۔ جس امیر کی نوکری ہوتی ہے، اس کے لیے کھانا بادشاہی خلعے میں سے آتا ہے، جس کے آنے کے وقت امیر کو ادائے شکر کے لیے بادشاہی محل کی طرف رخ کر کے تین دفعہ تسلیمات بجا لانا یعنی زمین تک ہاتھ لے جا کر ماتھے تک لانا ہوتا ہے۔ ان کے سوا مختلف مقامات میں سرکاری دفاتروں کے لیے بہت سے دیوان خانے بنے ہوئے اور نیمے لگے ہوئے ہیں۔

بقیہ حاشیہ  
کھٹی لاکر چھوڑ دیا تھا۔ پھر کسی بادشاہ کو اس کا خیال نہ رہا اور یہ بند ہو گئی۔ ۹۹۶ء  
مطابق ۱۵۶۱ء میں شہنشاہ اکبر کے عہد میں شہاب الدین احمد خاں صوبہ دار دہلی نے اس کو پھر صاف کرایا اور اپنی جاگیر تک لایا اور نہر شہاب اس کا نام رکھا، سڑک ایک مدت بعد پھر بند ہو گئی اور ۱۶۲۵ء مطابق ۱۶۲۵ء میں شاہجہاں کے حکم سے سفیدوں تک پھر صاف کی گئی اور وہاں سے آگے شاہجہاں آباد تک نئی نہر کھودی گئی اور جب قلعہ بن چکا تو قلعہ اور شہر میں جاہلی ہوئی۔ ایک عرصہ بعد اس کا پھر وہی حال ہو گیا تھا جو تھینا ۱۶۲۵ء مطابق ۱۶۲۵ء میں سرکار عالیہ انگریزی نے اسکو پھر جاری کیا اور آج تک یعنی جولائی ۱۸۸۵ء مطابق ماہ شوال ۱۳۰۲ء نہایت خوبی سے صفائی سے جاری اور نہر جن شرتی کے نام سے معروف ہے۔ (س م ح)

ان میں سے جن بڑے دالانوں میں کاریگر بیٹھتے ہیں، وہ مختلف  
کارخانہ جات قلعہ | کارخانوں کے نام سے موسوم ہیں، جن میں ایک ایک ماہر فن اتاد  
 کے تحت کام ہوتا ہے۔ کسی کارخانہ میں کارچوب اور چکن دوز اور نرد دوز وغیرہ کام کرتے  
 ہیں اور کسی میں سنار اور کسی میں مصور اور نقاش اور کسی میں روغن ساز اور کسی میں بڑھی،  
 اور خرا دی اور کسی میں درزی اور موچی اور کسی میں دارائی اور چوڑیا اور کباب اور باریک  
 ممل بننے والے جولا ہے جو پگڑیاں بنتے اور کمر باندھنے کے پھول دار زری کارپٹکے اور  
 زنارے پاجاموں کے لیے ایسا نازک اور باریک کپڑا بناتے ہیں جو صرف ایک رات کے  
 استعمال میں بیکار ہو جاتا ہے۔ یہ کپڑا صرف جو چند گھنٹے کام دیتا ہے، پچیس یا تیس  
 روپیہ قیمت کا ہوتا ہے اور کبھی اس سے بھی زیادہ۔ جب کہ اس پر سوئی سے نہایت  
 خوبصورت زری کا کام کیا گیا ہو۔ یہ تمام کاریگر علی الصبح اپنے اپنے کارخانوں میں حاضر  
 ہو کر دن بھر کام کرتے اور شام کو اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں اور انہیں دھندوں میں  
 ان کی زندگی بسر ہوتی چلی جاتی ہے اور جس حالت میں کوئی پیدا ہوا ہے اس سے ترقی  
 کرنے کے لیے کوئی بھی کوشش نہیں کرتا۔ مثلاً کارچوب اور چکن دوز اور سوزن کار  
 اپنے بیٹے کو اپنا ہی پیشہ سکھاتا ہے اور سنار کا بیٹا سنار ہی ہوتا ہے اور شہر کا طبیب  
 اپنے فرزند کو علم طب ہی کی تعلیم دیتا ہے۔

یہاں تک کہ کوئی شخص اپنے پیشہ کے سوا دوسرے پیشہ والے کے ہاں شادی نہیں  
 کرتا اور اس رسم کی پابندی مسلمان بھی ایسی ہی سختی سے کرتے ہیں جیسا کہ ہندو جن کا  
 شاستر ہی حکم دیتا ہے اور اس کے باعث سے بہت سی خوبصورت لڑکیاں کنواری بیٹھی رہتی  
 ہیں۔۔۔۔۔ اگر ان کے والدین پیشہ اور ذات کا خیال چھوڑ دیں تو ان کی شادی اچھی جگہ  
 ہو سکتی ہے۔

اب ضروری ہے کہ میں عام و خاص نقارخانہ کا ذکر کروں جو ان مکانات  
عام و خاص نقارخانہ | میں سے گزرنے کے بعد ملتا ہے اور فی الواقع بہت عمدہ اور  
 عالی شان عمارت ہے۔ یہ ایک بڑا وسیع مربع شکل کا مکان ہے، جس کے چاروں طرف محرابیں ہیں۔

اور پلیس رائل سے مشابہ ہے اور صرف اس قدر فرق ہے کہ اس کے اوپر کوئی عمارت نہیں ہے۔ اس کی محرابیں اس طرح بنی ہوئی ہیں کہ ایک محراب میں سے دوسری محراب میں جا سکتے ہیں اور ایک بڑا دروازہ جو اس کے سامنے ہے اس پر ایک بڑا بالا خانہ بنا ہوا ہے۔ جس کے دروازے اسی جانب ہیں اور چونکہ اس میں نیفریاں اور شہنائیاں اور نقائے وغیرہ رکھے رہتے ہیں، اس کو نقارخانہ کہتے ہیں۔ جو دن کو اور رات کو اوقات معینہ بر اٹھے بجائے جاتے ہیں اور نو وارد اہل فرنگ کے کانوں کو نہایت ہی کریمہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ دس بارہ نیفریاں اور اسی قدر نقارے ایک ہی دفنہ بجنے لگتے ہیں۔

بڑی نیفری جس کو "قرنا" کہتے ہیں ۹ فٹ لمبی ہے۔ جس کا نیچے کا منہ ایک فرانسیسی فٹ سے کم نہیں ہے اور لوہے یا پیتل کا سب سے چھوٹا نقارہ کم سے کم چھ فٹ قطر کا ہے۔ پس اسی سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ اس نقارخانے سے کس قدر شور و غل پیدا ہوتا ہوگا۔ چنانچہ جب میں پہلی بار یہاں آیا تو شور کے مارے میرے کان بہرے ہو گئے لیکن عادت ایسی زبردست چیز ہے کہ اب رغبت سے سنتا ہوں۔ خصوصیت رات کے وقت مکان کی چھت پر لیٹے ہوئے جب دُور سے اس کی آواز سنائی دیتی ہے تو نہایت کھلی اور سریلی معلوم ہوتی ہے۔

اس دروازہ کے مقابل جس پر نقارخانہ ہے، صحن سے گذر کر ایک بڑا دالان ہے جس کے ستون اور چھت سنہری کام کے ہیں اور بہت اونچی کرسی کا اور بہت ہوادار اور

لہ اس میں کوئی بعب کی بات نہیں۔ کیونکہ ان کے بجانے والے بچپن ہی سے موسیقی کی تعلیم پاتے ہیں اور ان باجوں کی آواز کے اونچا نیچا کرنے اور سریلی اور لے دار بنانے میں ایسے مشاق ہیں کہ فاصلہ سے سنی جائے تو نہایت پیاری لگتی ہے۔ نقارخانہ ہمیشہ ایک اونچے مکان پر اہد باد شاہی محل سے دُور رکھا جاتا ہے تاکہ بادشاہ کو اس کی آواز سے تکلیف نہ ہو۔



تین طرف سے کھلا ہوا ہے اور اس دیوار کے وسط میں جو محل سر سے اس کو جدا کرتی ہے، قد آدم سے کچھ اونچا ایک وسیع شہ نشین بنا ہوا ہے۔ جہاں ہر روز بادشاہ دوپہر کے قریب آن کر تخت پر بیٹھا ہے اور دائیں بائیں شہزادے کھڑے ہوتے اور خواجہ سرا مورچھل ہلاتے

۱۷۴ آثار الصنادید میں اس کو نشین ظل الہی یا تخت سنگین کر کے لکھا ہے اور اس کی کیفیت یوں بیان کی کہ دیوان عام کے مکانوں کے بچوں بیچ۔۔۔ شرقی دیوار سے ملا ہوا ننگ مرمر کا چارگزی کا مرصع تخت ہے جس پر چار ستون لگا کر بالا خانہ کی طرح اس کی چھت بنائی ہے، اور قد آدم سے زائد کرسی دی ہے اور اس کے پیچھے جو مرمر کا سات گز لمبا اور ڈھائی گز چوڑا ایک طاق ہے، اس پر ہر قسم کے چرند پرند کی تصویریں عجیب عجیب رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں اور ایک آدمی کی تصویر ہے جو یک تارا بجا کر گا رہا ہے۔ یہ تصویر ملک اٹلی کے رہنے والے ارفیوس نام کے ایک کلاوت کی ہے جس کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند پرند اس کی آواز سے مست ہو کر اس کے گرد آن بیٹھتے تھے اور اس کہانی کے موافق اسی ملک کے رہنے والے رفیل نامی ایک مصور نے جو اس فن میں بے مثل تھا، اپنے خیال سے ارفیوس کے گانے کا ایک مرقع کھینچا تھا۔ یہ مصور ۱۵۱۰ء میں مراکز اس کا یہ مرقع اٹلی اور فرنگستان میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے اور اب تک اس کی نقلیں موجود ہیں اور یہ وہی مرقع ہے جو پتھر کی چچی کاری میں یہاں بنایا گیا ہے۔ اس مرقع کا فرنگستان کے سوا اور کہیں رواج نہیں تھا۔ یقین ہوتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی اٹلی کا رہنے والا فرنگی شریک تھا۔ اس طاق کی بغل میں ایک دروازہ ہے اور اندر سے بھی آنے کا راستہ ہے۔ بادشاہ اس تخت پر دوبارہ عام کے دن اجلاس کرتے تھے۔ اس تخت کے آگے ایک تخت سنگ مرمر کا بچھا ہوا ہے۔ امراء میں سے جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہوتا تھا۔ اس پر چڑھ کر بادشاہ سے عرض کرتا تھا مگر بادشاہ کے بیٹھنے کا تخت اس قدر اونچا ہے کہ اس تخت کے چڑھنے پر بھی آدمی کا صرف گلا تخت تک پہنچتا ہے۔ اس تخت کے آگے دالان در دالان ہے جو طر سٹھ گز لمبا، اور

یا بڑے بڑے پنکھے جھلکتے یا ادلے خدمات کے لئے نہایت ادب کے ساتھ دست بستہ حاضر دربار رہتے ہیں اور تخت کے نیچے کے حصے میں چاندی کا بنگلہ لگا ہوا ہے، جس میں تمام امراء اور راجہ اور غیر ملکوں کے سفیر آنکھیں نیچی کیے ہوئے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں اور تخت سے کسی قدم فاصلہ پر اسی فاعدہ پر منصب دار یعنی چھوٹے امراء کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے جو جگہ نالی رہتی ہے، وہ اور بلکہ تمام صحن سب قسم کے لوگوں اعلیٰ اور ادنیٰ مفلس و غنی سے بھرا رہتا ہے۔ کیونکہ یہی مقام ہے جہاں رعایا کا ہر ایک متنفس اپنے عرصہ حال کے لیے باریاب ہو سکتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو عام و خاص کہتے ہیں اور ڈیڑھ یا دو گھنٹے تک

(بقیہ حاشیہ) چوبیس گز چوڑا ہے اور ہر ایک دالان کے نو نو در ہیں اور ان سب کے ستون سنگ سرخ کے ہیں اور ان پر بہت خوبصورت محرابیں بنائی گئی ہیں اور سفیدی گھونٹ کر سنہری نقاشی کی ہے۔ باہر کے دالان میں بیچ کے در چھوڑ کر سنگ مرمر کا کٹھرا لگایا ہے۔ جس پر بہت خوشنما سنہری کلیاں تھیں جو اب ایک بھی باقی نہیں۔ اس دالان میں امراء و زما اور وکلا کے حسب مرتبہ کھڑے رہتے ہیں۔ دربار کا یہ دالان درحقیقت ایک چبوتڑہ مصطیٰ ہے جس کا ایک سو چار گز طول اور ساٹھ گز کا عرض ہے۔ اس کے بیچ میں یہ دالان ہے اور باقی تین طرف چبوتڑہ ہے، جس کے گرد قد آدم سنگ سرخ کا کٹھرا لگایا ہے، جس پر سنہری کلیاں تھیں۔ یہ جگہ چوب دار اور نقیب اور امدی وغیرہ لوگوں کے کھڑے رہنے کی تھی اور اس کو گلاں باڈی کہتے تھے اور اس کے آگے دو سو چار گز لمبا اور ایک سو ساٹھ گز چوڑا صحن ہے۔ اور اس کے چاروں طرف قرینہ دار اور موقع سے مکانات بنے ہوئے ہیں اور شمال کی طرف دیوان خاص میں جلنے کا دروازہ ہے۔ (دس م ح)

۱۔ خانی خاں اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ چونکہ شاہجہاں سے پہلے بادشاہوں کے عہد میں دربار عام کے لیے کوئی ایسا مکان بڑا موجود نہ تھا، جہاں دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو، اس لیے شاہجہاں نے اپنے جلوس کے پہلے سال میں حکم دیا کہ قلعہ آگرہ، لاہور اور برہان پور میں دربار عام کے لیے جالیں جالیں کی تین عالی شان عمارتیں بنائی جائیں۔

لوگوں کا مجرا اور سلام ہوتا رہتا ہے اور اس عرصہ میں کسی قدر خاص گھوڑے سامنے کیے جاتے ہیں، تاکہ خود بادشاہ ملاحظہ کر سکے کہ وہ کیسے آراستہ و پیراستہ ہیں اور ان کے بعد ہاتھی آتے ہیں جن کی میلی کھال خوب نہلا دھلا کر سیاہی سے رنگ دی جاتی ہے اور دولاں خط سر سے سونڈ کے ابھرتک جہاں دونوں آکر مل جاتے ہیں، کھینچ دیے جاتے ہیں، اور زربفت کی جھول ڈال کر چاندی کے دو گھنٹے جو ایک نقرئی زین میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں، پیٹھ پر سے دونوں طرف لٹکا دیے جاتے ہیں اور سفید سرہ گائے کی دُمیں جو تبت سے آئی اور بیش قیمت ہوتی ہیں، لٹکادی جاتی ہیں جو بڑی بڑی موچھیں

سی معلوم ہوتی ہیں اور دو چھوٹے چھوٹے ہاتھی جو خوب سجائے جاتے ہیں خدمتگاروں کی طرح ان بڑے ہاتھیوں کے ساتھ رہتے ہیں اور یہ ہاتھی جھوم جھوم کر اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا اپنے زرق برق ساز و سامان اور اپنی آن بان پر نازاں ہیں اور جب تخت کے سامنے پہنچتے ہیں تو مہادت جو گردن پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے، لوہے کی ایک نوکدار چیز (سُنکس) چھو کر ان کو بڑھا دیتا اور زبان سے کچھ کہتا ہے اور اس وقت یہ جانور گھٹنا ٹیک کر اور سونڈ اوپر کو اٹھا کر چنگھاڑتا ہے۔ جس کو لوگ اس کی تسلیات خیال کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد جانور پیش ہوتے ہیں۔

بعد ازاں سدھائے ہوئے ہرن جو لڑائے جاتے ہیں، نیل گائیں اور گینڈے اور بنگالہ کے بڑے بڑے بھینے جن کے سینگ ایسے بڑے ہوتے ہیں کہ ان سے وہ شیر کے ساتھ لڑ سکتے ہیں اور چیتے جن سے ہرن کا شکار کھیلا جاتا ہے اور ہر قسم کے شکاری کتے خوبصورت جو ملک اڑبک (بخارا وغیرہ) سے آتے ہیں اور جن پر سرخ رنگ کی جھولیں پڑی ہوتی ہوتی ہیں پیش ہوتے ہیں اور اخیر میں ہر قسم کے شکاری پرند جو تیترا، کلنگ اور خرگوش کو پکڑتے ہیں کہتے ہیں کہ ہرن پر بھی چھوڑے جاتے ہیں، جن پر یہ نہایت تیزی کے ساتھ جھپٹتے اور پینچے اور چوپنچ مار مار کر ان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ ان جانوروں کے پیش ہونے کے علاوہ اکثر اوقات ایک دو امیروں کے سوار بھی ملاحظہ کر لئے جاتے ہیں، جن کی پوشاک اس وقت روزمرہ کے لباس کی بہ نسبت ذرا مشکل ہوتی ہے، اور گھوڑوں پر بیاکھریں

پڑی ہوئی اور انواع و اقسام کے زیور مثلاً ہیکل جھبے وغیرہ سے سجائے ہوئے ہوتے ہیں اور بادشاہ اس تماشے سے بھی اپنا دل خوش کرتا ہے کہ مردہ بھیڑیں جن کا پیٹ صاف کر کے پھر سی دیا جاتا ہے، نوجوان امرار، منصب دار گز بردار اور اعصار برداران پر تلوار سے اپنے کرتب دکھاتے اور ایک ہی ہاتھ میں چورنگ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ تمام امور دربار کے شروع میں ہوا کرتے ہیں اور ان کے بعد زیادہ اہم معاملات پیش ہوتے ہیں اور بادشاہ نہایت توجہ کے ساتھ سواروں کو صرف دیکھتا ہی نہیں، بلکہ ان کے متعلق تفتیش حال بھی کرتا ہے، بلکہ جب سے لڑائی بند ہوئی ہے کوئی سوار یا پیدل ایسا نہیں جس کو بادشاہ نے بچشم خود نہ دیکھا ہو اور اس سے اپنی ذاتی واقفیت حاصل نہ کی ہو۔ چنانچہ اس نے کسی کی تنخواہ، بڑھادی اور کسی کی کم کردی اور کسی کو بالکل ہی موقوف کر دیا ہے۔

اس موقع پر مستعینت جو غلطیاں پیش کرتے ہیں وہ تمام وکماں بادشاہ کے داد رسی ملاحظہ اور سماعت میں آتی ہیں اور بادشاہ بذات خود مستعینتوں سے دیباہت حال کرتا اور اکثر ستم رسیدہ لوگوں کی فوراً داد دیتا ہے اور ہفتہ میں ایک دن خلوت میں کامل دو گھنٹے تک ایسے دس غربا کی عرضیاں سنتا ہے جو مستعینتوں میں سے چن لیے جاتے ہیں اور جن کے پیش کرنے کا کام ایک نیک دولت مند اور مسن شخص کے سپرد ہے عدل و انصاف کے کمرے میں جس کو "عدالت خانہ" کہتے ہیں بادشاہ دو بڑے قاضیوں کے ساتھ بیٹھ کر داد رسی کرتا ہے اور اس میں کبھی نافع نہیں ہونے دیتا اور اس سے

(حاشیہ لہجہ) اور تیار ہونے پر عام و خاص ان کا نام رکھا گیا۔ چنانچہ آگرہ کا خاص و عام جب تیار ہو گیا تو ملک الشعرا طالبائے کلیم نے اس کی تعریف میں یہ رباعی کہی۔

|                                |                             |
|--------------------------------|-----------------------------|
| ایں تازہ بنا کہ عرش ہمایہ اوست | رفعت حرفے ز زمینہ پایہ اوست |
| باغیت کہ ستوں سبزش برونت       | کاسائش خاص و عام دمایہ اوست |

(س م ع)

بخوبی عیاں ہیں کہ ایشیائی بادشاہ جن کو ہم اہل یورپ جاہل اور ناتراشیدہ خیال کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ہی اپنی رعایا کی داد دہی اور انصاف رسانی سے جو ان پر واجب ہے، غفلت نہیں کرتے۔

جو حالات اس دربار عام و خاص میں گذرتے ہیں اور جن کا میں نے خوشامد اور لجاجت ابھی ذکر کیا ہے اگرچہ وہ سب معقول اور قابل احترام معلوم ہوتے ہیں، لیکن یک گونہ سفلگی اور مکروہ خوشامد اور لجاجت ہمیشہ یہاں دیکھنے میں آتی ہے، اس کا تذکرہ بھی مجھ پر فرض ہے۔ چنانچہ جب کوئی اچھا لفظ بادشاہ کے منہ سے نکل جاتا ہے تو خواہ وہ کیسے ہی خفیف امر کی نسبت کیوں نہ ہو، تمام دربار اور بڑے بڑے امراء آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر جس طرح کوئی خدا کی رحمت کو لیتا ہے، اس لفظ کو لے کر اور "کرامات کرامات" کہہ کر عرض کرتے ہیں کہ سبحان اللہ کیا ہی خوب ارشاد ہوا ہے اور حقیقتاً مغلوں میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جس کو یہ بیت یاد نہ ہو اور وہ اس کو فخریہ طور پر نہ پڑھتا ہو۔

اگر شہ روز را گوید شب ست این

بباید گفت اینک ماہ و پروین!

یعنی اگر بادشاہ رات کو دن بتائے تو کہدینا چاہیے کہ وہ چاند اور ستارے نظر آ رہے ہیں اور یہ خوشامد کا عیب کیا ادتی کیا اعلیٰ سب میں موجود ہے۔ مثلاً اگر کسی مغل کو مجھ سے معالجہ کی ضرورت پڑتی ہے تو اپنے معمول کے موافق تمام باتوں سے پہلے مجھ کو یہ کہتا ہے کہ آپ تو اپنے وقت کے ارسطو، اور بقراط اور بوعلی سینا ہیں۔ چنانچہ اول اول تو میں نے اس حرکت کو روکنا چاہا اور کہا کہ جس قدر آپ میری یہ تعریف کرتے ہیں، میں ہرگز اس کے لائق نہیں ہوں۔ اور مجھ ان بزرگوں سے کچھ نسبت نہیں، لیکن جب دیکھا کہ میرا انکسار ان کو اور زیادہ مبالغہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے تو مجبوراً اپنے کانوں کو ان کی خوشامدی باتیں سننے کا ویسا ہی عادی بنا لیا جیسا کہ ان کے موسیقی یا جوں کے سننے کا۔

اس موقع پر ایک لطیف آپ کو سناتا ہوں اس سے آپ کو یہاں کے لوگوں کا خاصہ طبعی معلوم ہو جائے گا۔ ایک پنڈت جس کی میں نے اپنے آقل سے ہی ملاقات کرائی تھی، ایک روز

اس نے اپنے ایک اشلوک میں اول تو ان کو ان بڑے بڑے فتح مندوں سے جو دنیا میں شاذو نادر ہی پیدا ہوئے ہیں، زیادہ بڑا بتایا، اور پھر سینکڑوں مہمات اور واہیات تک کہ اپنے کلام کے اخیر میں بڑی سنجیدگی سے کہا ”کہ جب آپ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی سپاہ کے آگے چلتے ہیں تو آپ کے قدموں کے نیچے زمین کا پننے لگتی ہے۔ کیونکہ وہ آٹھ ہاتھی جو اس کو اپنے سر پر اٹھائے ہوئے ہیں، اُس غیر معمولی بوجھ کے اٹھانے کی تاب نہیں لاسکتے“ جس کو سن کر میں بے اختیار ہنس پڑا اور اپنے ”آغا“ سے کہ میری طرح ان کو بھی سہنی آگئی تھی، شوخی کے ساتھ بہت سنجیدگی شکل بنا کر کہا کہ آپ ذرا سمجھ کر گھوڑے پر سوار ہوا کریں، ایسا نہ ہو کہ بھونچال آ کر دنیا درہم برہم کر جائے، جس کے جواب میں انھوں نے فوراً یہ کہا کہ اسی وجہ سے تو میں پالکی میں سوار ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

عام و خاص کے بڑے دالان کی بغل میں ایک خلوت خانہ ہے جسے غسل خانہ خلوت خانہ کہتے ہیں۔ یہاں صرف چند ہی شخصوں کو حاضر ہونے کی اجازت ہے، اور یہ وسعت میں اگرچہ عام خاص کے برابر نہیں ہے مگر وہاں کافی وسعت میں نہایت خوبصورت روغنی اور سنہری کام ہے اور ایک بڑے شہ نشین کی طرح چار پارچہ اپنچ فرانسسی فٹ کا اونچا ہے جہاں بادشاہ کرسی پر بیٹھ کر وزراء سے جو ادھر ادھر کھڑے ہوتے ہیں تخلیہ میں امراء اور صوبہ داروں کے عرائض سنا اور سلطنت کے اہم معاملات پر غور کرتا ہے اور جس طرح

۱۔ بادشاہ نامہ میں لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں قلعہ آگرہ میں محل سرا اور دیوان خانہ کے مابین ایک مکان تھا، جس میں بادشاہ غسل کیا کرتا تھا اور خاص خاص لوگ اور وزیر اور بخشی بعض ضروری اور اہم معاملات میں وہاں حاضر ہو کر حکم حاصل کیا کرتے تھے۔ شاہجہاں کے زمانہ میں جو نئی نئی عمارتیں بنائی گئیں تو اگرچہ بادشاہ نے اس مکان کا نام جہاں سلطنت کے محض اور اہم معاملات امراء اور وزراء کے مشورے سے طے کیے جاتے تھے، دولت خانہ خاص رکھا لیکن لوگ اس کو بھی غسل خانہ کہتے رہے اور اس لیے بادشاہ اگر سفر میں بھی ہوتا تھا تو خیام شاہی میں سے ایک خیمہ غسل خانہ کے نام سے نامزد رہتا تھا، اگرچہ

صبح کو عام و خاص کے دربار میں حاضر نہ ہونے کے باعث امراء پر جو مانہ کیا جاتا ہے، یہاں شام کو نہ حاضر ہونے پر سزا ملتی ہے۔ البتہ صرف میرے ”آفا“ دانشمند خاں ایک ایسے امیر ہیں جن کو ان کے علم و فضل اور شوق مطالعہ اور سرانجام امور ممالک غیر کی وجہ سے معافی حاصل ہے، لیکن چہار شنبہ کو جو ان کی چوکی کا دن ہے، ان کو بھی اور امرا کی طرح حاضر ہونا پڑتا تھا۔ یہ دو وقتہ حاضری کی رسم نہایت پرانی ہے اور کوئی امیر بھی اس پابندی کی معقول طور پر شکایت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خود بادشاہ سوائے کسی ضروری کام یا سخت بیماری کی حالت کے دونوں وقت دربار میں آنا اپنا فرض جانتا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب کی پچھلی خطرناک بیماری کی حالت میں بھی دربار کے دونوں مقاموں میں نہیں تو ایک میں تو ضرور لوگ اس کو اٹھا کر لے آتے تھے۔ کیونکہ اس نے رات دن میں کم از کم ایک بار لوگوں کو اپنا دیدار دکھا دینا واجب سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ اس کا صرف ایک دن دربار میں نہ آنا بھی تمام سلطنت میں فتنہ و فساد کے پھیل جانے اور شہر میں ہڑتال ہو جانے کا باعث ہو سکتا تھا۔

اگرچہ غسل خانہ کے دربار کے موقع پر بادشاہ ان امور میں مصروف رہتا ہے، جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، لیکن دربار عام و خاص کے دستور کے موافق یہاں بھی زیادہ تر وہی جانوروں کا ملاحظہ و مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، مگر چونکہ کچھ دن باقی نہیں رہتا اور سامنے کا صحن بھی مختصر ہے، اس لیے امراء کے رسالوں کا ملاحظہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس وقت کے دربار کی یہ خاص رسم ہے کہ جن منصب داروں کی چوکی دینے کی باری ہوتی ہے، وہ بادشاہ کو نہایت ادب و تعظیم کے ساتھ سلام کرتے ہوئے بڑے قرینے اور ترتیب سے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ جن کے آگے آگے لوگ ”قور“ ہاتھوں میں لیے ہوئے چلتے ہیں جو چند خوبصورت نقرتی چیزیں ہیں جو چاندی سے منڈھی ہوئی چھڑیلوں کے سروں پر لگائی جاتی ہیں۔ جن

(حاشیہ بقیہ) اس میں دربار خاص ہوتا تھا اور وہ غسل کے کام سے کچھ علاقہ نہ رکھتا تھا۔

(س.م.ح)

میں سے دو بڑی مچھلی کی شکل کی ہیں اور دو ایک مہیب اور خیالی جانور کی صورت کی جس کو "اژدہا" کہتے ہیں۔ اور کچھ شیر کی شکل کی اور بعض ہاتھ کے پنجے اور بعض ترازو کی اور بہت سی اور بے شمار وضع کی جن کے ایک طرح کے بعید الفہم معنی بتاتے ہیں۔ ان لوگوں میں بہت سے گز بردار بھی ہوتے ہیں جو قد آور اور وجہہ دیکھ کر بھرتی کیے جاتے ہیں اور جن کا کام یہ ہے کہ دربار میں بے ترتیبی نہ ہونے دیں اور بادشاہی فرمان اور احکام پہنچائیں اور جو حکم ملے نہایت جلد اس کی تعمیل کریں۔

اب میں بڑی مسرت کے ساتھ آپ کو بادشاہی محل سرا کی سیر کراتا ہوں جیسا شاہی محل سرا کہ قلعہ کی اور عمارت کی کرائی ہے، لیکن کسی سیاح کو وہاں کی کیفیت چشم دیدہ بیان کرنی ناممکن ہے۔ کیونکہ بادشاہ کے دہلی میں موجود نہ ہونے کے وقت مجھے کئی دفعہ وہاں جانے کا موقع ملا اور مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک بڑی بیگم کے علاج کی خاطر جو شدت مرض کی وجہ سے معمول کے موافق باہر کے دروازے تک نہیں لائی جاسکتی تھی۔ بہت دور تک اندر جانے کا اتفاق ہوا مگر میرے سر پر ایک کشمیری شال اس طور سے اڑھادی گئی تھی کہ ایک لمبے سگارف (اوڑھنی) کی طرح پاؤں تک لٹکتی تھی اور ایک خواجہ سرا ہاتھ پکڑے ہوئے مجھے اس طرح لے گیا تھا جیسے کوئی اندھے کو لیے جاتا ہے۔ یہاں اسی پر قناعت کرنی ہوئی جو بعض خواجہ سراؤں سے سن کر میں نے لکھا ہے ان کا بیان ہے کہ محل میں بیگمات کے مدارج اور حیثیت اور ان کے معاش کی مناسبت سے علیحدہ علیحدہ بہت خوبصورت اور بڑے بڑے محل بنے ہوئے ہیں جن کے دروازوں کے سامنے حوض اور سب طرف باغیچے اور دلچپ روشیں اور سایہ دار آرام گاہیں اور نہریں اور فوائے اور دن کی گرمی کے بچاؤ کی خاطر عمیق و خالص اندازت کو خنکی میں آرام کرنے کے لیے اونچے اونچے صحن اور صحن چھوترے بنے ہوئے ہیں اور ایسے دلکش مکانات ہیں کہ ان میں اس ملک کی تکلیف دہ گرمی کو مطلقاً دخل نہیں ہے ایک چھوٹے سے برج کی جو دنیا کی طرف ہے، حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں، جس میں آگرہ کے دونوں برجوں کی طرح سونے کے ورق چٹھے ہوئے اور لاجوردی کام کیا ہوا، اور



نہایت عمدہ نقش و نگار بنے ہوئے اور بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے ہیں۔

اب قبل اس کے کہ میں قلعہ کا بیان ختم کروں، آپ کو دوبارہ عام و خاص دربار اور تخت طاؤس کی طرف متوجہ کرنا اور ان سالانہ جشنوں اور درباروں کی کیفیت سنانی چاہتا ہوں جو میں نے اس میں ہوتے دیکھے ہیں خصوصاً وہ بڑا جشن جو لڑائی کے اختتام کے بعد ہوا تھا اور جس سے بڑھ کر کوئی تماشا میں نے عمر بھر میں کبھی نہیں دیکھا، اس روز بادشاہ نہایت ہی عمدہ لباس پہنے دیوان عام و خاص کے صدر میں مرصع تخت پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کی پوشاک نہایت نازک اور پھول دار لیشمی کپڑے کی تھی، جس پر بہت ہی عمدہ ندی کا کام کڑھا ہوا تھا، جس میں ایک پھراج ایسا تھا جو لاشانی کہا جاسکتا ہے۔ اور آفتاب کی طرح چمکتا تھا اور بڑے بڑے موتیوں کا کنتھا گلے میں تھا جو ہندوؤں کی مالا کی طرح پیٹ تک لٹکتا تھا۔

یہ تخت چھ طلائی پایوں کا ہے، (کہتے ہیں کہ یہ بالکل ٹھوس ہیں) جن میں یا قوت اور زبرد اور ہیرے بڑے ہوئے ہیں مگر میں ان کی تعداد اور قیمت بیان نہیں کر سکتا کیونکہ کسی کو اس قدر نزدیک جانے کی اجازت نہیں کہ ان کا شمار اور آب و تاب کا اندازہ کر سکے۔ لیکن یقین کیجیے کہ ہیرے اور دوسرے جواہرات بہت ہی ہیں۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ اس کی قیمت چار کروڑ روپے جا چکی گئی تھی اور اس کو اورنگ زیب کے باپ شاہجہاں نے اس لیے بنوایا تھا کہ بے شمار جواہرات جو خزانہ میں قدیم راجاؤں اور پٹھان بادشاہوں کی ٹوٹ

لے آئیں انصار الصنادید میں اس برج کا نام برج طلا یا مہمٹن برج لکھا ہے اور سر تا پا سنگ مرمر کا بنایا ہے جس میں سونے کا کام اور پرچین سازی اور منبت کاری کی ہوئی ہے جو کلس سمیت باہر سے بھی سنہری ہے اور ہشت پہلو ہونے کے باعث مہمٹن برج کہلاتا ہے۔ تین ضلعے اس کی خواب گاہ کی عمارت کی طرف ہیں اور پانچ دیبا کی جانب، اور پانچوں میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں اور ایک نشین بطور برآمدے کے دریا کے رخ بنا ہوا ہے۔ (س م ح)

اور ان پیش کشوں کے ذریعہ سے جو ہر سال سب امراء کو خاص خاص موقعوں پر پذیریں پیش کرنی لازم ہیں، وقتاً فوقتاً جمع ہو گئے تھے، لوگ ان کو دیکھیں مگر اس کی ساخت اور کاریگری ان جواہرات کے ہم پایہ نہیں ہے۔ البتہ دو مورد جو موتیوں اور جواہرات سے بالکل ڈھکے ہوئے ہیں، بہت ہی خوب اور نہایت عمدہ نقشے پر بنے ہیں اور ان کو ایک صناعت نے بنایا تھا۔ جس کی کاریگری اور ہنرمندی حیرت کے لائق تھی اور جو اصل میں فرانس کا

لے ملا عبد الحمید مورخ شاہ جہانی نے "بادشاہ نامہ" میں اس تحت کی جو کیفیت بیان کی ہے، دلچسپ سمجھ کر ہم اس کو یہاں بلفظ نقل کرتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

"چوں بمرور ایام و کردار اعوام اقسام جواہر شینہ کہ ہریک شایستہ

گو شوارہ ناہید و کمر بند خورشید است در جواہر خانہ دال فراہم آمدہ بود۔ در

آغاز جلوس مقدس بر ضمیر الہام پذیر منقطع گردید کہ از تحصیل چنین تحف

غریبہ دنیا ہزاری ایں نفایس عجیبہ مطمح نظر دور بین جز دولت آرائی و زینت

افزائی امرے دیگر نیت پس در جائے بکار باید برد کہ ہم تماشا یایاں از حسن

جہاں افروز ایں نتائج بحر دکان بہرہ بر گیرند و ہم کار گاہ سلطنت را فروغے

تازہ پدید آید۔ حکم شد کہ سوائے جواہر خاصہ کہ در جواہر خانہ مشکوئے مینو مثال

مے باشد از قسم لعل و یاقوت و الماس و مردارید قیمتی و زمرود کہ "صد لک روپہ

قیمت آنت ہر چہ در تحویل خازنان بیرون است از نظر اطہر بگدر اند و جواہر

شینہ گران سنگ را کہ پنجہ ہزار مثقال است و مبلغ ہشتاد و شش لک روپہ

بہائے آں شدہ بود انتخاب نمودہ بہ جے بدل خاں دارو فرہ زر گر خانہ حوالہ

فرمودند تا بیک لک تولاہ طلائے ناب کہ دو صد پنجہ ہزار مثقال است و مبلغ

چہار و لک روپہ قیمت آں تحفے بطول سہ گز در بے و عرض دو نیم گز در ارتفاع

..... پنج گز سرکاری نمودہ بجواہر مذکورہ ترصیح نمایند و مقرر شد کہ سقف آں

لازروں بیشتر مینا کار دختے مرصع و از بیرون بہ لعل و یاقوت و جز آن

رہنے والا تھا اور جس نے یورپ کے بہت سے ریشیوں کو جھوٹے جواہرات دیدے کہ جن کو وہ ایک خاص حکمت سے تیار کرتا تھا، خوب لوٹا تھا اور پھر بھاگ کر شہنشاہ مغل کے ہاں آکر پناہ لی تھی اور یہاں بھی خوب دولت کمائی تھی

تخت کے نیچے کے چبوترے پر جس کے گرد چاندی کا کٹھرا لگا ہوا اور اوپر ندی کی جھال کا ایک پر زور وسیع شامیانہ تنا ہوا تھا۔ امراء نہایت مکلف پوشاکیں پہنے کھڑے تھے، اور مکان کے ستون زربفت سے منڈھے ہوتے اور ریشمی مشجر کے شامیلے جن میں ریشم اور ندی کے پھندے لگے ہوتے تھے، تنے ہوئے اور نہایت عمدہ قالین ریشمی پکھے ہوئے تھے اور باہر ایک خیمہ جسے اسپک لہے کہتے ہیں اور جو اس مکان سے بھی بڑا ہے، اس کی چھت کے ساتھ ملا کر لگایا ہوا تھا، جو صحن کے نصف تک پھیلا ہوا اور چاروں طرف سے چاندی کی پتروں سے منڈھے ہوئے کٹھرے سے گھرا ہوا تھا، اس کی چوبیس بھی چاندی

(حاشیہ بقیہ) مرصع مغرق ساختہ بہ زمردایں اساطین دوازده گانہ برافراز دو بالائے  
آن دو پیکر طاؤس مکمل بزدا ہر جو اہرود در میان ہر دو طاؤس درختے بجواہر  
آب دار ترتیب دہد۔ در مدت ہفت سال این تخت عرش مثال بہ مبلغ صد  
صد لک روپیہ کہ سہ صدوسی و سہ ہزار تومان عراق و چہار کرد خانہ راج ماورالنہر  
است صورت اتمام یافت۔ از جملہ یازدہ تختہ مرصع کہ بر دور آن برائے تیکہ  
دہد شاہ جہاں را بوسہ بر پائے  
کند شاہ جہاں بخش جواں بخت  
خداوندے کہ عرش و کرسی افراخت  
از باقیست تا کون و مکان را  
بود تختے چینی ہر روز جایش  
چو تار بخش زباں پر سید ازول  
ازاں شد پایہ قدرش فلک سائے  
خراج عالی را خراج یک تخت  
تواند قدرتش تختے چینی ساخت  
بود بر تخت جا شاہ جہاں را  
خراج ہفت کشور زیر پائش  
بگفت را و رنگ زیب شاہنشاہ عادل

دیگر این تاریخ یافتہ ۶ (سریر ہمایون صاحبقرانی سنہ ۱۰۰۰ھ) (س م ح)  
فارسی میں ایک بڑے خیمہ کو کہتے ہیں۔ (غیاث اللغات) (س م ح)

سے منڈھی ہوئی تھیں، جن میں سے تین ایسی بلند تھیں جیسے جہاز کا مستول اور باقی چھوٹی تھیں۔ اس عالی شان خیمہ کے باہر کی طرف سرخ رنگ کا کپڑا تھا اور اندر کی جانب مٹھی پٹن کی نہایت عمدہ چھینٹ تھی جو اسی غرض سے بنائی گئی تھی اور جس کے بیل بوٹے ایسے عمدہ اور رنگ ایسے تیز اور شاداب تھے کہ ایک تختہ گزار معلوم ہوتا تھا اور چونکہ سب امراء کو حکم دیا گیا تھا کہ عام و خاص کی گردش کی ایک ایک محراب کی زیبائش و آرائش وہ اپنے خرچ سے کریں، اس لیے بادشاہ کی زیادہ سے زیادہ رضامندی حاصل کرنے کے لیے ہر ایک نے دوسرے سے بڑھ کر ان کی زیب و زینت میں کوشش کی تھی، جس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ تمام درو دیوار اوپر سے نیچے تک کنجاب اور زلفیت میں غرق اور فرش نہایت بیش قیمت قالینوں سے آراستہ و پیراستہ ہو گیا۔

زانواع جواہر گشتہ الوان  
در اطرافش بود گلہائے مینا  
چومی کرد از فرازش کوہی دست  
شب تار از فروغ لعل و گوہر  
حراغ عالمی ہر دانہ آن !  
فروزاں چوں چراغ از طور سینا  
گیجین خویش جم بر پایہ اش لبست  
تواند صد فلک را داد اختر

جشن کے تیسرے دن اول بادشاہ اور اس کے بعد انرا امراء بڑے  
جشن شاہانہ | تکلف کے ساتھ بڑی بڑی ترازوؤں میں جن کے پلڑے اور بے سونے

کے تھے تولے گئے اور مجھے یاد ہے کہ یہ دیکھ کر کہ اورنگ زیب کا وزن سال گذشتہ کی بہ نسبت ایک سیر زیادہ ہے۔ تمام دربار نے نہایت ہی مسرت ظاہر کی۔ اس قسم کے جشن ہر سال ہوا کرتے ہیں، لیکن اس شان و شوکت کا جشن کبھی نہیں ہوا اور نہ اس قدر کبھی خرچ ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بادشاہ کا اس کی طرف کے ساتھ جشن کرنے سے مقصود یہ تھا کہ سوداگروں کو جن کا کنجاب وغیرہ لڑائی کی وجہ سے پانچ سال کے عرصہ سے بکنے میں نہیں آیا تھا، کچھ فائدہ ہو جائے۔ اس جشن میں امراء کو بہت خرچ پڑا، آخر کار اس کا ایک حصہ فوج کے غریب سواروں کے سر تھوپا گیا جن کو اپنے اپنے امیر کے حکم سے مجبوراً قبائوں کے

واسطے کتاب خریدنا پڑا۔

ان سالانہ جشنوں کے موقع پر ایک قدیم دستور ہے جس کو امراء بالکل پسند نہیں کرتے یعنی ان کو ایک عمدہ پیش کش نذر کرنا پڑتی ہے۔ جس کی قیمت بمناسبت ان کی تنخواہوں کے کم یا زیادہ ہوتی ہے اور بعض امرا نہایت ہی عمدہ عمدہ چیزیں پیش کرتے ہیں اور یہ نذرانے کبھی بغرض نمائش اور کبھی اس مطلب سے کہ بادشاہ اس دست برد کی محقق و تفتیش کے حکم دینے سے جو انھوں نے اپنے برسرِ عمدہ ہونے یا صوبہ داری کے زمانہ میں کی تھی، باز رہے، اور بعض سونے کے مرصع برتن اور بعض بہت سی اشرافیاں جو بارہ بارہ روپیہ کی قیمت کی ہوتی ہیں پیش کیں ایک ایسے ہی جشن کے موقع پر جو اورنگ زیب وزیر ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ رشتہ داری کی وجہ سے جعفر خاں کی نو تعمیر حویلی دیکھنے کے بہانے اس کے ہاں گیا تو اس نے دھائی لاکھ روپیہ کی اشرافیاں اور کچھ عمدہ موتی اور ایک لعل جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ آنی گئی تھی، نذر کیا مگر شاہجہاں نے جو جواہرات کے پرکھنے میں سب لوگوں سے زیادہ مہارت رکھتا تھا۔ اس کی قیمت ساڑھے بادہ سو روپیہ سے بھی کم تجویز کی جس کو سن کر بڑے بڑے جوہری دھنوں نے اس کے جانچنے میں بالکل دھوکا کھایا تھا، حیران رہ گئے۔

کبھی کبھی ان جشنوں کے وقت محل سرا میں ایک فرضی بازار بھی لگا کر تلہے مینا بازار جس میں امراء اور بڑے بڑے منصب داروں کی خوبصورت اور دل رُبا بیبیاں دکائیں لگا کر بیٹی اور عمدہ عمدہ کتاب اور زر دوری کام کی چیزیں اور زر داری کا مندریلین اور سفید باریک کپڑے جو امیرزادیوں کے استعمال میں آتے ہیں نیز دوسری بیش قیمت چیزیں فروخت کرنے کو رکھتی ہیں اور بادشاہ اور اس کی بیگمیں، شاہزادیاں اور دوسری عالی رتبہ خاتونیں خریدار بنتی ہیں اور اگر کسی امیر کی بیٹی خوبصورت اور حسین ہوتی ہے تو اس کی ماں اس کو ضرور اپنے ساتھ لے جاتی ہے، تاکہ بادشاہ کی نظر پڑ جائے اور بیگمات سے بھی تعارف ہو جائے۔ اس میلہ کا بڑا لطف یہ ہے کہ مہنی اور مذاق کے طور پر خود بادشاہ ایک ایک پیسہ کے لیے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بیگم صاحبہ بہت گراں فروش ہیں۔ دوسری جگہ سے اس سے اچھی اور سستی چیز مل سکتی ہے۔ ہر ایک بیگم اور شاہزادی کو شیش

کرتی ہے کہ اپنا مال زیادہ قیمت کو نیچے اور جب دکھتی ہے کہ بادشاہ زیادہ قیمت نہیں لگاتا تو گفتگو میں اکثر ایسی بڑھ جاتی ہے کہ یہ کہہ اٹھتی ہے کہ آپ اپنے برف نیچنے کی فکر کریں، ان چیزوں کی قیمت آپ کیا جانیں اور یہ آپ کے لائق نہیں ہیں۔ بہتر ہے کہ کسی اور جگہ تلاش کریں۔ بیگمیں بادشاہ سے بھی زیادہ ارزاں خریدنا چاہتی ہیں۔ غرض کہ دونوں طرف سے ایسی گفتگو بڑھ جاتی ہے کہ ایک جھگڑے کا سوانگ سا معلوم ہوتا ہے، مگر آخر کار سودا طے ہو جاتا ہے اور بادشاہ اور بادشاہزادیاں اور بیگمیں جو چیزیں ادھر ادھر سے خریدتی ہیں، ان کی قیمت فوراً دے دیتی ہیں اور روپیوں کی جگہ انشرفیاں اس طور سے ہاتھ سے ڈال دیتی ہیں کہ گویا دوکان دار یا اس کی بیٹی کے حسن و جمال نے ان کو ایسا محو کر دیا ہے کہ روپیوں اور انشرفیوں کی تمیز ہی نہیں رہی اور ویسی ہی بے پروائی سے دکان دار ان کو اٹھا لیتی ہے اور اسی طرح سے یہ جلدہ دل لگی اور چہل میں ختم ہو جاتا ہے۔

شاہجہاں عورتوں کی طرت زیادہ مائل تھا، ہر ایک جشن کے موقع پر سوانگ کرایا ہی کرتا

اس موقع پر ان عورتوں کو بھی محل میں بلا لیتا اور رات بھر وہیں رکھتا تھا، جن کو ”کنچنی“ کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں سونے سے ملع کی ہوئی اور پھول کی طرح کھلی ہوئی گویہ عورتیں بازاری نہ تھیں، بلکہ باعزت ہوتی تھیں جو بیاہ شادی کے موقع پر امرار اور منصب داروں کے ہاں صرف ناچنے گانے کے لیے جاتی تھیں۔ ان کنچنیوں میں اگرچہ اکثر صاحب حسن و جمال ہیں اور لباس و پوشاک بھی عمدہ رکھتی ہیں اور گانے میں بھی ان کو کمال ہے اور ناچنے میں تو اپنے اعضاء کو اس خوبی سے لچکاتی اور اس سرعت اور تیزی سے ناچتی ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور تال میں کبھی درست رہتی ہیں مگر پھر بھی کسی ہیں۔

شاہجہاں اسی پر قناعت نہ کرتا تھا کہ یہ عورتیں اس میلہ میں آئیں، بلکہ بدھ کے روز جو معمول کے موافق دربار میں سلام کو آتی تھیں تو اکثر رات بھر کے لیے بٹھرا لیتا اور ان کے ناچنے گانے سے حظ اٹھاتا تھا، لیکن اورنگ زیب باپ سے زیادہ سنجیدہ ہے اور اس نے ان کا محل میں آنا بالکل بند کر دیا ہے مگر معمول کے موافق چہار شنبہ کو دربار میں حاضر ہونے

سے منع نہیں کیا اور صرف دور سے سلام کر کے رخصت ہو جاتی ہیں۔

اب چونکہ میں جشن اور جینا بازار اور کچھینوں کا ذکر کر رہا ہوں تو ایک واقعہ کے بیان کرنے سے باز نہیں رہ سکتا جو ہمارے ایک ہم وطن برنارڈ نامی سے تعلق رکھتا ہے اور چونکہ میرے نزدیک بھی پلوٹارک کا یہ قول صحیح ہے کہ "جزوی اور خفیف باتوں کو پوشیدہ رکھنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ اکثر اوقات اُن سے ایک قوم کے رسوم و عادات اور ذہن و دماغ کے باب میں صحت کے ساتھ رائے قائم کرنے میں بڑی بڑی باتوں کی بہ نسبت زیادہ مدد ملتی ہے۔ اس لیے اگرچہ یہ ایک مہنسی کا قصہ ہے، تاہم سننے کے لائق ہے!

برنارڈ جہانگیر کے اخیر زمانہ میں ایک نامی اور فی الواقع ایک نہایت کامل طبیب اور جراح تھا اور بادشاہ اس پر بہت مہربانی کرتا تھا۔ چنانچہ اکثر اوقات بادشاہ کے ساتھ کھانے پینے میں بھی شریک ہو جاتا تھا اور دونوں حد سے زیادہ شراب پی لیتے تھے اور بادشاہ

سے پلوٹارک قدیم زمانہ کا ایک مشہور مصنف ہے، یہ کروینا کا رہنے والا تھا جو یونان کے ضلع لویا میں ایک شہر ہے۔ اس کی پیدائش کا زمانہ ٹھیک معلوم نہیں، مگر خیال کیا گیا ہے کہ شہشاہ کلاڈیس رومی کے اخیر زمانہ سلطنت یعنی اڑتالیس سے لے کر تریسین سنہ تک کسی سال میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ خاندان میں سے تھا اور اس نے ایونیس حکیم سے فلسفہ کے وہ اصول سیکھے جو نفس ناطقہ اور قوائے عقلی سے متعلق ہیں اور اس میں بڑی شہرت حاصل کی۔ علم اخلاق اور علم رجال میں اس کی بہت سی تصنیفات ہیں اور اس کی عمدگی خیالات اور مہارت علمی اور اس خاص طرز کی خوبی کا اثر جو اس کی تمام تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ پڑھنے والوں کی زبان تک محدود نہیں رہتا تھا، بلکہ دل تک پہنچتا اور گرویدہ کر لیتا تھا۔ اس کی تصنیفات میں سے جس کتاب نے اس کو حیات جادوانی بخشی وہ روم اور یونان کے چھیا لیس مشہور و معروف لوگوں کا تذکرہ ہے، جس کے بہت سے ترجمے فرانسیسی، انگریزی اور جرمن و غیرہ میں ہوئے ہیں۔ اس کی وفات کا سال بھی معلوم نہیں مگر قیاس کیا گیا ہے کہ شہنشاہ ہیڈریس رومی کے پانچویں سنہ جلوس میں ستر برس کی عمر میں مرا تھا۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا) (س م ح)

اور طبیب دونوں ایک ہی طرح کے مزاج کے تھے اور بادشاہ کا یہ حال تھا کہ شب و روز عیش و نشاط میں مشغول رہتا تھا اور سلطنت کا کام کاج اپنی مشہور و معروف بیگم نور جہاں کو سونپ رکھا تھا جس کی نسبت اس کا یہ قول تھا کہ اس کی عقل و دانائی سلطنت کے انتظام کے لیے کافی ہے، مجھے دخل دینے کی حاجت نہیں۔ برنارڈ کی معمولی تنخواہ اگرچہ پچیس روپیہ روز تھی مگر شاہی محل سرا میں اور امرا کے ہاں معاالجہ کے لیے جانے کے باعث اور نیز اس سبب سے کہ لوگ نہ صرف اس کے طبیب ہونے کی وجہ سے بلکہ بادشاہ کے مزاج دخل کے سبب سے ایک دوسرے سے بڑھ کر اس کی تواضع کرتے تھے۔

مگر وہ روپیہ کی بھی کچھ قدر نہ کرتا تھا اور ایک ہاتھ سے لیتا اور دوسرے ہاتھ سے دیدیتا تھا اور اس لیے سب لوگ اس کو عزیز جانتے تھے۔ خصوصاً "کنچنی" جن کو اس نے بہت کچھ کھلایا تھا۔ پس اس کے ہاں ہمیشہ رات کو ان عورتوں کا جھمگٹ ہوتا تھا۔ یہ ان میں سے ایک نوخیز عورت پر جو نہایت حسین اور ناپختہ میں مشہور تھی، فریفتہ ہو گیا اور ہر چند طرح کی کوششیں کیں۔ لیکن اس عورت کی ماں اس خیال سے کہ کم عمری کی وجہ سے اس کے حسن و جمال اور تندرستی میں فرق نہ آجائے۔ ایک لحظہ اس کو اپنی نظر سے علیحدہ نہ ہونے دیتی تھی۔

اسی حالت میں جب کہ برنارڈ معشوق کے وصال سے مایوس ہو رہا تھا کہ ایک دن جہانگیر نے جو سردربار اس کے ایک بے نظیر علاج کے صلہ میں اس کو انعام دینا چاہا۔ تو اس نے عرض کیا امیدوار ہوں کہ حضور معلیٰ اس انعام سے معاف رکھیں اور بجائے اس کے کہ میری یہ التما منظور فرمائیں کہ یہ نوجوان کنچنی جو ارباب نشاط کے ساتھ سلام کو حاضر ہوتی ہے، مجھے عنایت ہو۔ تمام دربار اس کے عند اور ایسی درخواست کے کرنے سے جو اس کے عیسائی اور اس کنچنی کے مسلمان ہونے کی وجہ سے شاید ہی قابل قبول معلوم ہوتی تھی، مسکرایا لیکن جہانگیر نے جس کو دین اور مذہب کا کچھ خیال نہ تھا ایک بڑا قہقہہ مارا اور حکم دیا کہ اس کنچنی کو اس کے کاندھے پر بٹھا دو اور کہو کہ لے جائے۔ چنانچہ فوراً بھرے دربار میں یہ اس کے کاندھے پر بٹھا دی گئی اور وہ اس انعام کو لے کر خوشی خوشی گھر



کو چلتا ہوا۔

ہاتھیوں کی لڑائی جشن کا اختتام ہمیشہ ایک ایسے تماشے پر ہوتا ہے، جس سے یورپ میں کوئی بھی واقف نہیں، یعنی ہاتھیوں کی لڑائی پر جو عام خلقت کے سامنے

جنبا کی ریتی میں لڑائے جاتے ہیں اور بادشاہ اور بیگمات اور تمام امر قلعہ کے چھروکوں میں سے یہ تماشہ دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک خام دیوار تین یا چار فٹ چوڑی اور پانچ یا چھ فٹ اونچی بنائی جاتی ہے اور اس کے دونوں جانب سے دو قوی ہیکل ہاتھی جن پر دو دو آدمی سوار ہوتے ہیں متقابل کیے جاتے ہیں۔ دوسرا آدمی اس لیے ہوتا ہے کہ اگر ہاتھی کی گردن پر سے ایک آدمی گر پڑے تو دوسرا آنکس سے اس کو چلائے اور یہ لوگ کبھی تو ان کو بڑھا وادیکر اور کبھی برا بھلا کہہ کر اور پاؤں سے کھوکے دیکر آگے بڑھاتے ہیں، یہ بے چارے جانور دیوار کے پاس پہنچ کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور ایسی ٹکر لگاتے ہیں کہ دیکھ کر خوف آتا اور سر اور سونڈ اور دانتوں کے زخموں سے ان کا زندہ رہنا تعجب معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑائی اکثر رہ کر ہوتی اور مٹی کی دیوار آخر کار گر جاتی ہے اور زبردست اور دلیر ہاتھی اس کو پھاند کر حرلیف پر حملہ کرتا اور اس کو بھگا دیتا ہے اور ایسا پھنے دباتا ہے کہ آتش بازی کی چریخوں کے بغیر جو ان کے بیچ میں چھوڑ دی جاتی ہیں، حرلیف سے الگ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ جانور باطبع ڈر پوک ہے اور خصوصاً آگ سے بہت ڈرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ جیسے آتش ہتھیار لڑائی میں برتے جانے لگے ہیں، ہاتھی لڑائی میں بہت کم کار آمد رہ گئے ہیں اور اگرچہ سرانیدپ کے ہاتھی سب سے زیادہ دلیر ہوتے ہیں، مگر خواہ کہیں کے ہوں، میدان جنگ میں لے جانے سے پہلے برسوں تک ڈرنے کے لیے ان کے کانوں کے پاس پٹانے پھوڑے جاتے ہیں۔

ان عظیم الشان جانوروں کی لڑائی کا خاتمہ بڑی بے دردی پر ہوتا ہے۔ یعنی اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہاتھی اپنے حرلیف کے مہاووت کو اپنی سونڈ سے پکڑ کر نیچے گرا لیتا اور فوراً پاؤں سے کچل ڈالتا ہے۔ مہاووتوں کا کام ایسا خطرناک ہے کہ یہ بد نصیب آدمی اپنے جملوں پھوں سے اس طرح پر رخصت ہوتے ہیں کہ گویا مرنے کو جاتے ہیں۔ لیکن انکے دل کو اس خیال

سے کسی قدر تسلی رہتی ہے کہ اگر زندہ بچے اور بادشاہ ان کی کارگزاری سے راضی ہوا تو نہ صرف ان کی تنخواہ بڑھادی جائے گی بلکہ ہاتھتی سے اترتے ہی پچیس روپے کے پیسوں کی ایک تھیلی مل جائے گی اور اگر کام آگئے تو ان کی تنخواہ ان کی بیوی کو ملتے رہے گی اور بیٹا ان کی جگہ نوکر ہو جائے گا۔ اس تماشے میں مہادوتوں ہی کی جان نہیں جاتی، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غضب ناک جالندوں سے بچنے کے لیے ایسی سخت بھگڑ پڑتی ہے اور پیدل اور سوار اس طرح بھاگتے ہیں کہ بعض آدمی گر کر لوگوں یا خود ہاتھتوں کے پاؤں سے کچل جاتے ہیں۔ چنانچہ جب دوسری بار مجھ کو اس تماشے کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو صرف اپنے گھوڑے کی خوبی اور خدمت گاروں کی کوشش کی بدولت میں بچ سکا۔

اب موقع ہے کہ میں قلعہ کا ذکر چھیڑوں اور پھر شہر کی طرف رجوع کروں۔ جس کی دو عمارتوں کا ذکر کرنا اب تک باقی ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک تو بڑی مسجد ہے جو وسط شہر میں ایک مرتفع پہاڑی پر واقع ہونے کے سبب سے

۱۔ اس مسجد کی بنیاد ۱۰۱۰ھ مطابق ۱۶۰۵ء شاہجہاں کے چوبیسویں سال جلوس میں رکھی گئی تھی اور ہر دو پانچ ہزار راج مزدور بیل دار اور سنگ تراش کام کرتے تھے اور باوجود اس اہتمام کے چھ برس میں دس لاکھ روپے کے خرچ سے تیار ہوئی، اس کے تین گنبد ہیں۔ نوے گز طول اور تیس گز کے عرض میں اور اندر کوسات محرابیں ہیں اور باہر صحن کی طرف گیاہ دروازے ہیں جن میں ایک تو بہت بلند ہے اور پانچ ادھر ادھر والے ذرا نیچے ہیں اور بڑے دروازے پر کلمہ "یا ہادی" بطور طغرا اور باقی دروازوں پر شاہجہاں کے نام کا کتبہ اور تاریخ تعمیر اور زر مصارف جس کو نور اللہ خوشنویس نے بخط نسخ لکھا تھا سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے بنا ہوا ہے اور دروازے کے دونوں طرف نہایت خوش نما اور بلند مینار ہیں جن میں اوپر جانے کے لیے زینے اور سروں پر بارہ دری کی برجیاں، بہت دل کشا بنی ہوئی ہیں۔ شمالی مینارہ بجلی کے صدمے سے گر پڑا تھا اور عمارت اور صحن کا فرش بھی جو تمام سنگ سرخ کلبے، جا بجا سے بگڑ گیا تھا، مگر سرکار عالیہ انگریزی نے ۱۲۳۲ھ مطابق

بہت دور سے نظر آتی ہے۔ اس کی بنیاد رکھنے سے پہلے پہاڑی کی سطح کو خوب ہموار کر دیا گیا اور چاروں طرف چوکور میدان کھول دیا گیا تھا، جہاں مسجد کی چاروں سمتوں سے چار بڑے بازار آ کر ملتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک تو صدر دروازے کے سامنے ہے اور دوسرا عقب میں اور دو دونوں بغلی دروازے کے محاذی اور اندر جانے کے لیے تینوں ضلعوں میں کوئی پچیس پچیس یا تیس تیس پتھر کی خوبصورت سیڑھیاں بنتی چلی گئیں ہیں، اور پشت کی جانب پہاڑی کی اونچائی تک پتھر لگا کر اور خوبصورت صاف کر کے لگائے گئے ہیں جن سے پہاڑی کی ناہمواری چھپ کر عمارت خوبصورت ہو گئی ہے۔ اس کے تینوں دروازے سنگِ سرخ سے بنے ہیں اور نہایت عالی شان ہیں اور ان کے کواڑوں پر تانبے یا پتیل کی پیتیاں جوڑی ہوئی ہیں۔ صدر دروازہ جس پر سفید سنگِ مرمر کی چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوئی ہیں اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہیں، زیادہ شان دار ہے۔ مسجد کے پیچھے کے حصے میں تین بڑے بڑے گنبد ہیں، جن کے اندر اور باہر سفید سنگِ مرمر لگا ہوا ہے۔ بیچ کا گنبد دوسروں کی بہ نسبت بہت بڑا اور اونچا ہے اور مسجد کا صرف یہی حصہ مسقف ہے۔ باقی گنبدوں سے لے کر صدر دروازہ تک بالکل کھلا ہوا ہے، جو گرمی کی وجہ سے کھلا رکھنا ضروری ہے اور مسجد کے اندرونی حصے میں سفید سنگِ مرمر کا (جس پر سنگِ موسیٰ کی تحریر سے مصلے بنے ہوئے ہیں) اور بیرونی حصہ میں سنگِ سرخ کی سلوں کا فرش ہے۔

(حاشیہ لیفیہ) ۱۹۲۶ء میں اس مینار کو بنوایا اور فرش بھی درست کر دیا۔ اس مسجد میں چونکہ کوئی مکبر بنا ہوا نہ تھا اور اس وجہ سے امام کی آواز تکبیر سب نمازیوں کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس واسطے شاہزادہ مرزا سلیم ابن معین الدین محمد اکبر بادشاہ نے ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں بڑے دروازے کے بیچ میں ایک مکبر سنگِ باسی کا بہت خوش نما بنوایا ہے مسجد کے اندر تمام فرش سنگِ مرمر کا ہے اور اس میں سنگِ موسیٰ کی چیکاری سے مصلے بنا دیے ہیں۔ ممبر بھی سنگِ مرمر کا بہت خوش قطع بنا ہوا ہے۔

تینوں گبندوں اور چھوٹی برجیوں کے سوا جو سنگ مرمر کی ہیں، باقی عمارت سنگ مرمر سے بنی ہوئی ہے، جو سنگ مرمر کی بہ نسبت قدر کم ہے اور استداد زمانہ سے اس میں سے ورق جھڑنے لگ جاتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کا یہ قول ہے کہ جس کان سے یہ پتھر نکلتا ہے، کچھ مدت بعد اس میں پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو نہایت عجیب ہے اور غلط یا صحیح اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ برسات کے دنوں میں کان میں پانی بھر جاتا ہے، مگر میں اس امر کی نسبت کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتا۔

شمالی دالان میں کچھ تبرکات جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رکھے ہیں اور وہ مقام درگاہ آثار شریف کہلاتا ہے۔ مسجد کا صحن ایک سو چھتیس گز کے عرض و طول کا ہے اور اس کے زینچ میں پندرہ اور بارہ گزر کا زے سنگ مرمر کا حوض ہے۔ جس میں فوارہ لگا ہوا ہے۔ صحن کے چاروں طرف بڑے بڑے دالان اور حجرے بنے ہوئے ہیں، اور مکانات بنے ہوئے ہیں اور چاروں کونوں پر بارہ دری کے چار برج ہیں۔ جنوبی اور شرقی دالان کے سامنے دائرہ ہندی نماز کا وقت دیکھنے کو بنا ہوا ہے اور مسجد کے تینوں دروازوں میں برنجی گواڑ چڑھے ہوئے ہیں۔ جنوبی دروازہ پر رہنے کے لائق حجرے بنے ہوئے ہیں اور پینتیس بیڑھیاں ہیں، جن پر تیسرے پہر کو جمع عام ہوتا ہے اور باطنی اور فالودہ والے اور کبابی اور اصیل مرغیچنے والے اور شوقین جوان انڈے لڑنے والے آن کر جمع ہوتے ہیں۔ شمالی دروازہ میں بھی رہنے کے حجرے بنے ہوئے ہیں اور اس طرف انتالیس بیڑھیاں ہیں، اگرچہ اس طرف بھی کبابی بیٹھتے ہیں اور سودے والے دوکانیں لگاتے ہیں، لیکن بڑا تماشا اس طرف مداروں اور قصہ خوانوں کا ہوتا ہے۔ قصہ خوان مونڈھا بچھا کر بیٹھتا ہے اور داستان امیر حمزہ یا قصہ حاتم طائی اور کہیں داستان بوتیا خیال سناتا ہے، جس کے سننے کو سینکڑوں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ ایک طرف مداری تماشا کرتا ہے اور بھان منی کا کھل ہرتا ہے اور بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بنا لے شرقی دروازے پر بھی مکانات بنے ہوئے ہیں اور اس کے بیڑھیاں پینتیس ہیں اور جن پر ہر روز گزری لگتی ہے۔ جو گویا ہر روز کا میلہ ہے۔

بادشاہ ہر جمعہ کو جو مسلمان ملکوں میں ہمارے اتوار کی طرح مقدس سمجھا جاتا ہے اس مسجد میں نماز پڑھنے کو جاتا ہے اور جس رات سے اس کا گذر ہوتا ہے، اس میں پہلے سے گرمی اور گرد و غبار کے فرو ہو جانے کے لیے چھڑکاؤ کر دیا جاتا ہے اور قلعہ کے دروازے سے لے کر مسجد تک تین یا چار سو سپاہی دورویہ صف باندھے کھڑے ہوتے ہیں، جن کے پاس چھوٹی چھوٹی مسگر بہت خوبصورت بندوقین ہوتی ہیں جن پر سرخ بانات کا غلاف ہوتا ہے اور اس کے سر پر ایک چھوٹا سا پھریرا۔۔۔ پانچ یا چھ عمدہ سوار قلعہ کے دروازہ پر اس غرض سے موجود رہتے ہیں کہ سواری کے وقت راستہ کھلا اور صاف رکھیں اور وہ اتنے فاصلے سے آگے آگے چلتے ہیں کہ ان کی گرد سے بادشاہ کو تکلیف نہ پہنچے اور جب یہ ساری تیاری ہو جاتی ہے تو بادشاہ قلعہ سے کبھی تو ہاتھی پر جو خوب سجایا ہوا اور جس پر سنہری اور منقش کام کی غماری کسی ہوئی ہوتی ہے، سوار ہوتا ہے۔ اور کبھی سنہری اور لاجوردی کام کے تختہ رواں پر جو کناب

وغیرہ سے منڈھے ہوئے ڈنڈوں پر بندھا ہوا ہوتا ہے اور جس کو آٹھ چیدہ اور بھاری بھاری دردیوں والے کہاں کاندھے پر اکھٹاتے ہیں، سوار ہوتا ہے اور پیچھے پیچھے بہت سے امرا ہوتے ہیں جو بعض تو گھوڑوں پر اور بعض پالکیوں میں سوار ہوتے ہیں، اور انہیں میں ملے جلے بہت سے منصب دار اور چاندی کی چھڑیوں والے چوب دار وغیرہ ہوتے ہیں۔ میں اس سواری کو سلطان روم کی باشان و شوکت سواری سے تشبیہ نہیں دے سکتا اور نہ بادشاہان یورپ کے جنگی طرز کے جلوس سے کیونکہ اس کا تجل اور شان و شوکت کچھ اور ہی طرح کی ہے مگر کچھ کم شاہانہ نہیں ہے۔

کار والسرا دوسری قابل الذکر عمارت وہ کاروان سرا ہے جو شاہجہاں کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب نے جس کا میں نے گذشتہ لڑائی کی تاریخ میں بہت کچھ ذکر کیا ہے، بنوائی تھی۔ نہ صرف اس شاہزادی نے بلکہ اور امرا نے بھی بادشاہ کے خوش کرنے کو شہر کی رونق بڑھانے میں بہت روپیہ صرف کیا ہے، ایک بڑی اور محراب دار مربع عمارت ہے، بڑے بڑے چوک اور باغوں کے

بہت کم ہونے کی وجہ سے پیرس مجھ کو آدمیوں کے ایک بن کی مانند معلوم ہوتا ہے اور اس وجہ سے مجھ کو یقین ہے کہ جیسے آدمی اس میں ہیں اتنے ہی دہلی میں بھی ہوں گے، مگر جب ہندوستان کے اس دارالسلطنت کی وسعت اور بے شمار دوکانوں اور اس بات پر خیال کرتا ہوں کہ امراء کے علاوہ پینتیس ہزار سوار سے اس میں بھی کم نہیں رہتے، جو قریباً سب کے سب عیال دار اور صاحب اولاد ہیں اور سب کے پاس بہت سے نوکر چاکر ہیں جو اپنے آقاؤں کی طرح علیحدہ علیحدہ مکانوں میں رہتے ہیں اور کوئی ایسا گھر نہیں جس میں عورتیں اور لڑکے بالے موجود نہ ہوں اور شام کو جب ذرا گرمی کم ہو جاتی ہے، اور لوگ باہر نکلتے ہیں تو تمام سڑکیں اور گلی کوچے باوجود اپنی وسعت کے خلقت سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور پیہ دار گاڑیاں (جن سے جگڑک جاتی ہے) بہت ہی کم دکھائی دیتی ہیں۔

ٹھیک طرح سے بتانا میرے لیے مشکل ہے کہ دہلی اور پیرس کی آبادی میں کیا نسبت ہے، لیکن میرے قیاس میں اگر پیرس کے برابر یہاں آدمی نہ ہوں تو کچھ زیادہ کم بھی نہ ہوں گے۔ البتہ اگر آسودہ حال لوگوں پر نظر کی جائے تو بیشک پیرس میں اور اس میں ایک نمایاں تفاوت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ پیرس میں دس میں سے سات یا آٹھ آدمی کپڑے لٹے سے درست اور معقول صورت نظر آتے ہیں۔ لیکن دہلی میں صرف دو یا تین آدمی ایسے دکھائی دیتے ہیں تو بیچالے فوجی ملازمت کے لیے یہاں چلے آتے ہیں میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھے اکثر ایسے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے جو اچھے وجیہہ اور عمدہ اور ستھرا لباس پہنے اور عمدہ گھوڑوں پر چڑھے ہوئے اور نذر خدمت گار ساتھ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔

جس وقت امراء اور راجہ اور منصب دار لوگ چوکی دینے یا دربار میں امراء کی سواری حاضر ہونے کو آتے ہیں تو اس چوک سے جو قلعہ کے سامنے ہے کوئی زیادہ بارونق مقام نظر نہیں آتا۔ چنانچہ چاروں طرف سے بہت سے منصب دار سازو سامان سے درست، عمدہ گھوڑوں پر چڑھے ہوئے اور چار خوش پوشاک خدمت گار ساتھ

لیے ہوئے جن میں سے دو پیچھے اور دو راستہ کھلا رکھنے کے لیے آگے آگے رہتے ہیں۔  
 امرار اور راجہ بعضے تو گھوڑوں پر اور بعضے عمدہ ہاتھیوں پر اور اکثر ملکب پالیوں  
 میں جس میں چھ چھ کہا لگے ہوئے ہوتے ہیں، زلفیت کا تیکہ لگائے پان چبائے آتے  
 ہیں جس سے مقصود ہوتا ہے کہ منہ خوشبودار اور ہونٹ سُرخ ہو جائیں اور پالکی کے ایک  
 طرف تو ایک خدمت گار دانت خلال اور چاندی یا پھینی کا اگالداں جس کا حقہ کے ساتھ  
 ہونا ضروری ہے لیے ہوئے ہوتا ہے اور دوسری جانب دو خدمت گار ہوتے ہیں، جو  
 اپنے آسائش پسند مالک کو پنکھا جھلنے یا گردوغبار اور مکھیاں اڑانے کو مورچھل ہلاتے ہیں اور  
 تین چار پیادے راستہ کھلا رکھنے کے لیے آگے آگے دوڑتے اور کچھ منتخب اور وجیہہ خوش  
 لباس جوان گھوڑوں پر چڑھے ہوئے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔

دہلی کے نواح کی زمین نہایت زرخیز ہے اور اس میں ایچہ گیہوں، جو،  
**مضافات شہر** نیل، دھان، باجرہ، جوار، مونگ، ماش اور موٹھ وغیرہ جو عام لوگوں  
 کی خوراک ہے باافراط پیدا ہوتے ہیں۔

دہلی سے چھ میل آگرہ کے راستہ پر ایک مقام ہے جس کو مسلمان "قطب صاحب کہتے  
 ہیں اور یہاں ایک بہت قدیم عمارت ہے جو کبھی ہندوؤں کا دھرم استھان تھا۔

۱۔ مصنف کا مقصود غالباً مندر ہے جس کو ہندوستان کے مشہور راجہ پرکھی راج عرف  
 رائے پتھورائے ۱۲۲۳ بکرماجیتی مطابق ۱۲۲۳ھ اور ۱۲۲۵ھ میں اپنے قلعہ کے ساتھ بنوایا  
 تھا اور ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۱۹۱ھ اور موافق ۱۲۲۵ھ بکرماجیتی میں بھیزالدین بن سام عرف  
 شہاب الدین غوری کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے جو آخر کار دہلی کا بادشاہ ہوا، اور  
 سلطان قطب الدین کہلایا۔ دہلی کو فتح کیا تو اس کو مسجد بنا دیا اور شرقی دروازے پر فتح کی  
 تاریخ اور اپنے نام کا کتبہ کھدوایا مگر کوئی ایسے حروف جن کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے  
 اس پر کہیں کندہ نہیں ہیں۔ البتہ اس کے صحن میں ایک لاکھ ہے جو سر سے پاؤں تک لوہے  
 کی ڈھلی ہوئی ہے اور جو زمین پر سے بائیس فٹ چھ انچ بلند ہے۔

## شاہجہاں آباد کی تہذیبی جھلکیاں

مغلوں کی جہاں داری کا دن بے نور ہوا تو اس کی شام زوال کے سائے کچھ دیر کے لیے شفق کے رنگازنگ پھولوں کی طرح اس کی بساط تہذیب پر بکھرے ہوئے نظر آئے۔ شہر دہلی جو اس وقت شاہجہاں آباد ہی نہیں جہاں آباد تھا۔ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کا دارالریاست اور قسطنطنیہ سے لے کر کینٹون تک مشرق کا شاید سب سے زیادہ متمول اور متمدن شہر تھا اس کی مسجدوں کے بلند مینار، پرشکوہ گنبد اس کے پر رونق بازار اور خم بہ خم گلیاں جن کو میر نے ”اوراق مصور“ کہا ہے اور جہاں نظر آنے والی ہر شکل تصویر بنی نظر آتی تھی۔ اس کے محلات، مقابر، خانقاہیں اور مدرسے اسے سرزمین مشرق کی آبرو بنائے ہوئے تھے۔ سلطنت میں ضعف آگیا تھا لیکن تنعم و تعیش کی سطح پر شہر کی رونق کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ شمشیر و سناں کی جگہ رفتہ رفتہ طاؤس و ناب کو مل گئی تھی اور دہلی کی فضا شعر و نغمہ سے گونج رہی تھی۔

عہد محمد شاہی کئی اعتبار سے مغلوں کے دور وسطیٰ کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عالمگیر کی وفات (۱۶۵۷-۶۱۷) اور بہادر شاہ اول کے مختصر مگر پر امن دور حکمرانی کے بعد (۱۶۵۷-۶۱۷) پہلی بار ایک بادشاہ کو باقاعدگی سے ایک طویل عرصہ تک حکومت کرنے کا موقع ملا تھا، محاربوں اور مہمات کے خاتمہ کے بعد تخت و تاج کے حصول کے لیے شہزادوں کی مسلسل بغاوتوں اور بادشاہ گروں کی سیاسی و عسکری بالادستی کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا جس میں جہاں دارشاہ کی بادشاہت سے لے کر محمد شاہ کی خود مختاری تک کے درمیانی وقفہ میں بہت سے مغل شہزادوں کے ماسوا بے شمار امیروں،



امیرزادوں، عمائد شہر اور جلیل القدر اراکین سے سلطنت کا قتل عمل میں آیا اور جس کے یہ زمانہ دہلی کے لیے ”آسیب زدگی“ کے دور سے کچھ کم نہ تھا۔ نادر شاہ درانی کا خون آشام حملہ ابھی نہ ہوا تھا اور دہلی اور اہل دہلی محمد شاہ برنگیلے کی چھتر چھایا میں کچھ اطمینان و سکون کا سانس لے رہے تھے۔

فنون لطیفہ اور بالخصوص موسیقی کا اجیاز اس شان و آن نے عمل میں آیا تھا کہ موسیقاروں اور کلاؤنوں کو بڑے بڑے شاہی عہدے مل گئے تھے۔ اور خود شاہی خاندان کے افراد ”نشاطِ نغمہ دے“ کے بے طرح دلدادہ ہو گئے تھے۔ طوائفوں کے ادارہ کے اثر و رسوخ اور شہری و شاہی معاشرت کی طرف سے اس کی سرپرستی نے دہلی کی بساطِ زندگی کو ”بساطِ رقص“ بنا رکھا تھا۔ اہل ارادت کے جلسے ہوں یا درباب دولت کی محفلیں، غرضیکہ ہر بزم سے ناز و طنبور کی صدائیں بلند ہوتیں اور ہر انجن سے سرود و نغمہ کی دل نشیں آوازیں آتی تھیں۔ غالب نے جو کچھ اپنے زمانے کی دہلی کے لیے کہا تھا وہ عہد محمد شاہی کی دہلی پر زیادہ بہتر طور سے صادق آتا ہے۔

لطف خرام ساقی و ذوقِ صدائے جنگ  
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے  
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی  
مطرب بہ نغمہ زہزن تمکین و ہوش ہے

غرض کہ اس وقت دہلی کی بساطِ زیست کا ہر گوشہ و امان باغبان و کف گل فروش بنا ہوا نظر آتا تھا۔

محمد شاہ کی رنگیلی طبیعت، اہل شہر کی حسن پرستی اور امرار کی نازک مزاجیوں نے شہر کی دل کشی میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔

سید ہاشمی فرید آبادی نے ”تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت میں عہد محمد شاہی کی دہلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”بادشاہ کا شوقِ تعمیر بھی عیش پرستی کی لذت سے خالی نہ تھا۔ حیاتِ بخش

اور مہتاب باغ اس لیے بنائے تھے کہ افکارِ سلطنت کی بوتلک وہاں نہ آئے  
لیکن یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی پیردی میں دس بارہ سال کے اندر دہلی کے  
باہر بیسیوں باغ تیار ہو گئے۔ باؤلی سے مہرولی تک مشجر کا حاشیہ لگ گیا اور  
یہ قیاس تاریخی شواہد پر مبنی ہے کہ نہ صرف مناظر و مذاق بلکہ شہر کا موسم تک  
بدل گیا تھا۔<sup>۱</sup>

اس عہد کی آرائشی تہذیب کا ایک پہلو اگر حسین و مہین لباس ہے جس کی تن زیبی کو  
بعض اہل خانقاہ تک پسند کرتے ہیں تو دوسری طرف ادبِ بگم " جیسی بعض طوائفیں ہیں۔  
جو حصہ زبیریں جسم پر صرف خوب صورت اور نظر فریب آرائشی گل بوٹوں سے پردہ نظر کا  
کام لیتی ہیں۔

عہد محمد شاہی کی دہلی ایک نئے لسانی اور ادبی مزاج کو اپنا رہی تھی۔ جس کا اندازہ  
ریختہ گوئی کی باقاعدہ تحریک سے بھی ہوتا ہے جس کے لیے سب سے قوی محرک وہ مذاق  
سخن ہے جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچرل اشتراک نے نئے رسوم و آداب کے ساتھ  
دہلی کے ذہنی افق پر قوس قزح کی طرح ابھار دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دہلی کا دیوان  
دہلی پہنچا تو بقول مولانا محمد حسین آزاد —

" اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر بیا، قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے  
دیکھا، لذت کی زبان سے پڑھا، گیت موقوف ہو گئے قوال معرفت کی  
مخلوں میں انھیں کی غزلیں گانے لگے ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے جو  
طبیعت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔<sup>۲</sup>

اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ عہد جو ہر انسانیت جو پسندیدہ لباس پہن کر ہماری  
زبان میں آیا تھا۔ وہ فقرار کے شوق یا تفریح کی ہوا سے اڑ کر آ گیا تھا۔ شاہنامے کے

<sup>۱</sup> تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت : ۲۸

<sup>۲</sup> آب حیات : ۸۷

ڈھنگ سے نہ آیا تھا جو شاہی محمد عیش پرستی کا خون بہاتا اور اہل ملک کو پھر تیموری بابا باری میدانوں میں لاڈالتا یا تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے اکبری عہد کو پھر زندہ کرتا۔ اس وقت کی دہلی کو عیش امروز کا تصور عزیز ہے اس کے سامنے، بڑے زمین و آسمان نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ دہلی غیر معمولی شخصیتوں سے خالی نہیں اس میں شاہ ولی اللہ جیسا مدبر اور معلم بھی موجود ہے جس کا ہاتھ زمانہ کی نبض پر ہے اور جس کی نظر سمرئی افق پر ستارہ شام کے طلوع کی منتظر ہے۔ حضرت شاہ کلیم اللہ جیسے فقراء بھی ہیں جو اصلاح و تربیت کا ایک باقاعدہ نظام قائم کرنے کی مبارک کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ارباب فقر کی خانقاہیں جگہ جگہ موجود ہیں اور اس پھیلتی ہوئی شام کے دھندلے میں جن کا وجود تبدیل رہبانی کا کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ اول نے عہد محمد شاہی کی دہلی کو ان تاریخی لمحات میں دیکھا تھا جب نادر شاہ دہلی کا حملہ (۱۷۳۸ء) ہونے والا تھا۔ وہ آصف جاہ اول کے ہمراہ تھے اور اہل دہلی کے ساتھ خود بھی اس "موج خون" کے شتاور ہوئے جو نادر شاہ کی خون آشام یورش کے ساتھ، دہلی اور اہل دہلی کے سر سے گزری تھی۔ ان کی یادگار زمانہ یادداشتیں اس عہد کی دہلی کی تہذیبی بساط پر نقش کرتی ہوئی پرچھائیوں کے مطالعہ کے لیے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جسے آج "مرقع دہلی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پروفیسر محمد مجیب نے "مرقع دہلی" کے مشتملات کے سلسلہ میں جو لکھا ہے وہ نہ صرف اس مرقع بلکہ تاریخ و تہذیب کی نقش گری اور اس کے مطالعہ کے لیے ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔

"مرقع دہلی میں نہ کچھ الفبائی کی شان ہے نہ کچھ محتسب کی رپورٹ کا شائبہ۔ دراصل وہ ایسے شخص کا بیان ہے، جس نے آنکھ کی دیکھی بات قلم سے لکھ دی بغیر اس بحث کو چھڑے ہوئے کہ لوگ کیا کرتے ہیں اور مذہب کا تقاضہ کیا ہے۔ مرقع اخلاقی نقطہ نظر سے لکھا گیا ہوتا تو اس میں حالات کا ایسا صاف عکس نہ ہوتا۔ اور پڑھنے والے کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا کہ کسی

ناصح نے اپنا غصہ اتارنے کے لیے بے گناہوں کو خواہ مخواہ بدنام نہیں کیا ہے تو کم از کم ایسی باتوں کو جن میں کوئی خاص عیب نہیں ہے، بد اخلاقی کی مثال بنا لیا ہے اپنی موجودہ صورت میں مرقع حقیقت نگاری کی کوشش ہے جسے اعلیٰ اور پست اخلاقی کے مقامات اور مراتب سے کوئی واسطہ نہیں۔  
یہ نتیجہ پڑھنے والا خود نکال سکتا ہے۔“

(جامعہ بابت ماہ جولائی ۱۹۶۳ء: ۳)

## قدم شریف

”برز مینے کہ نشان کفِ پائے تو بود  
سالہا سجدہ صاحب نظران، خواہد بود

پنجشنبہ کے دن یہاں زائروں کے ہجوم کے باعث وہ بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے کہ ایک متنفس بھی طواف گاہ تک مشکل سے پہنچ سکتا ہے۔ ویسے یہاں رات دن مجمع رہتا ہے۔ فقراء اور زائرین دور و دراز علاقوں اور شہروں سے یہاں زیارت کے لیے آتے ہیں اور عرس سراپا قدس کے ایام میں تو طائفوں کی کثرت کی وجہ سے وہ کیفیت ہوتی ہے کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں رہتی جب تک آدمی صبح سویرے سے وہاں نہ پہنچ جائے بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔ ان دلوں میں صاحبان دولت جو کھانے پینے کی چیزیں وہاں بھجوتے ہیں وہ فقراء و مساکین میں تقسیم کرنے کے باوجود بچ جاتی ہیں۔

## قدم گاہِ امام

قلعہ باد شاہی سے تین کوس پر واقع ہے۔ اہل زیارت سعادت آخروی کے حصول کے لیے شبینہ کے روز وہاں حاضر ہوتے ہیں اور مہر اوسلیم کے پھول اپنے خلوص عقیدت کے گوشہ دستار میں سجاتے ہیں۔ اکثر اپنی دلی مرادوں کے حصول کے لیے وہاں نذریں پیش کرتے ہیں اور ان کی آرزوئیں برآتی ہیں۔ محرم کی بارہویں تاریخ کو جو خاص آلِ عبا کی زیارت کا دن ہے، ارباب عزادار محضوں اور چشم گریاں کے ساتھ عزرا پرسی و ماتم داری کے لیے اس مکانِ خلد آشیاں میں جمع ہوتے ہیں اور شرائطِ زیارت پچالاتے ہیں۔ اس روز سب وضع و شریف وہاں حاضر می دیتے ہیں۔ اور سوار یوں کی کثرت کے باعث راستے اور سڑکیں چوٹی کی آنکھ کی طرح تنگ نظر آتی ہیں۔ اہل حرفہ وہاں اپنی اپنی دکانیں لگاتے ہیں اور خوب نفع کماتے ہیں۔ اور چوکی خانہ میں کہ مومنین کے لیے مکان معین ہے منقبت خوانی کرنے والے بلند آہنگی کے ساتھ قصاید عزرا پڑھتے ہیں اور اس بارگاہ معجز پناہ سے منشورِ نجات حاصل کرتے ہیں۔

## درگاہ قطب الاقطاب

ارباب تمنا فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد اس مرقدِ عالی کے طواف کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور گلہائے مراد سے اپنا دامن بھرتے ہیں۔ یہاں زیارت کرنے والے صبح و شام آتے ہی رہتے ہیں۔ خاص طور پر پنجشنبہ کے روز عجیب مجمع ہوتا ہے۔ صاحبان استعداد رات دن دہلی سے زیارت کے ارادے سے یہاں آتے۔۔۔۔ اور اس سعادت کے حصول کے بعد یہاں کے سبزہ زاروں کی سیر کرتے ہیں۔ آپ کے مبارک قدموں کی برکت سے یہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے اور چشمے کٹورہ بنے رہتے ہیں۔ بالخصوص حوض شمسی کا تھروکہ جو یہاں کے تبرک چشموں میں سے ہے۔ اور اہل عقیدت اس سے گونا گوں تمتعات حاصل کرتے ہیں۔

ربیع الاول کی ۱۶ تاریخ کو عرس ہوتا ہے اور ایک دنیا زیارت کی نیت سے بے اختیار یہاں کھنچی چلی آتی ہے۔ لوگ دو روز تک یہاں کی سیر سے لطف اٹھاتے ہیں۔ قوال ہمیشہ دور سے قبر مبارک کے سامنے ایستادہ ہو کر اور کبھی بیٹھ کر مہر اپیش کرتے ہیں۔

### مرقد مبارک سلطان المشائخ حضرت محبوب الہی

اس مرقد فردوس آئین سے کچھ عجیب کیفیات محسوس ہوتی ہیں، جن کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہر چہار شنبہ کو خواص و عوام احرام زیارت باندھ کر یہاں پہنچتے ہیں اور قوال بڑے ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر مہرے کی رسومات بجالاتے ہیں۔ خاص طور پر ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ کو زائرین کا طرفہ ہجوم، اور عجب کثرت ہوتی ہے۔ دلی والے بہت بن سوار کر وہاں پہنچتے ہیں اور مراسم زیارت کی ادائیگی کے بعد ان باغیچوں اور چمن زاروں کی سیر کرتے ہیں جو اس روضہ مبارک کے پاس کثرت سے موجود ہیں۔ اہل حرفہ بہت ترتیب و تزیین کے ساتھ یہاں جگہ جگہ اپنے ڈیرے جماتے ہیں اور تماشاٹیوں کو ان کی مرغوب چیزیں پیش کرتے ہیں۔ مطربوں کے نعمات کی کثرت کے باعث کوئی اور آواز گوش آشنا نہیں ہوتی۔ ہر گوشہ میں نقال اور رقص کرنے والے خوش ادائیگی کی داد دیتے ہیں۔

چہار دہم ربیع الثانی عرس مبارک کا دن ہے جب یہاں کے آس پاس کا علاقہ خیموں اور ڈیروں کی کثرت کے سبب بالکل گھر جاتا ہے۔ تمام رات نوبت بہ نوبت قوال مہرا پیش کرتے ہیں۔ صوفیا اور اہل حال پر وجد طاری ہوتا ہے اور ”پواہیر“ کی مجلسیں تو بہت بہت دیر تک چلتی اور بہت شور و شغب برپا ہوتا ہے اس فرقہ کے لوگ اور دوسرے اہل زیارت تمام رات جاگتے رہتے ہیں اور بیشتر اس قدر مرقد منور کے اطراف میں مراقبے میں مصروف رہتے ہیں اور بعض تلاوت قرآن پاک میں صبح کر لے ہیں۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی

”آپ در حقیقت چراغِ دہلی بلکہ تمام ہندوستان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے مزار

پڑاؤار کی زیارت کے لیے یکشنبہ کا دن ہے۔ خاص طور پر جس ماہ میں دیوالی کا تہوار آتا ہے۔ وہاں طرفہ، نجوم ہوتا ہے۔ اس ماہ دہلی کے رہنے والے حضرت کے مزار پڑاؤار کی زیارت کے لیے وہاں جاتے اور درگاہ کے قریب چشمہ کے کنارے خیمے اور سہارے ایستادہ کرتے ہیں، چشمہ میں غسل کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں بہت سے پرانے مریض شفا پا جاتے ہیں۔ رسوم زیارت کی بجا آوری میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک رہتے ہیں۔

طلوع صبح سے لے کر غروب آفتاب تک زائرین قافلہ در قافلہ وہاں پہنچتے ہیں اور دیواروں کے سایے اور درختوں کے نیچے فرش فرش بچھائے جاتے ہیں۔ محفلیں جمتی ہیں اور من چلے لوگوں کی ٹولیاں خوش دلی کی داد دیتی ہیں۔ عجیب سیر اور طرفہ تماشا ہوتا ہے۔ ہر طرف راگ رنگ کے جلسے اور ہر گوشہ میں کچھ اوج اور مورچنگ کی آوازیں.....“

### مزار مرزا بیدل رحمۃ اللہ علیہ

ان کا مزار مبارک ایک خاص موزونیت کے ساتھ بنا ہے۔ پرانی دہلی میں یہ ایک مختصر سے احاطے میں واقع ہے۔ جیسے مرزا بیدل کے اپنے کلام میں الفاظ کے رنگین حلقے میں ایجاز معنی ماہ صفر کی تیسری تاریخ کو عرس شریف ہوتا ہے جس میں مرزا کے تمام تلامذہ اور موزونان شہران کی روح سے استفادہ کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور مرزا بیدل کے قریب حلقہ مجلس ترتیب دیتے ہیں اور نہایت ہی نفیس خط میں لکھا ہوا ان کا کلیات درمیان میں رکھ لیا جاتا ہے۔ ان کے اشعار سے اس بزم سخن کا افتتاح ہوتا ہے۔ بعد ازاں دوسرے شعرا اپنے اپنے مرتبے کے مطابق کلام سناتے اور اپنے نتائج افکار سے سامعین کو محفوظ کرتے ہیں۔ ایک طرف انبساط اور عجیب لطف والی محفل ہوتی ہے۔

بزرگان دین کے عرس آئے دن ہوتے ہیں۔ ماہ رجب کی تیسویں تاریخ کو حضرت

شاہ ترکمان کا عرس مقدس ہوتا ہے۔ روشنی کی رات میں چراغوں اور قندیلوں کی روشنیوں سے آسمان کا آنگن نور سے بھر جاتا ہے اور پھولوں کی کثرت سے دامن صبا معطر ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ حسن رسول نما کے عرس سراپا قدس کی رسوم ماہ شعبان کی اکیسویں تاریخ کو ادا کی جاتی ہیں۔ مزار شریف کو سجایا جاتا ہے۔ صبح سے شام تک قوالوں کی ٹولیاں آتی اور مجرا پیش کرتی رہتی ہیں۔ شاہ عزیز اللہ کے عرس میں بوڑھے بچے سبھی خوشی خوشی شریک ہوتے اور جھومتے جھومتے وہاں تک پہنچتے ہیں۔ حضرت باقی باللہ کے مزار پر اوزار پر کچھ اس طرح اللہ کی رحمت برستی ہے کہ سخت گرمیوں کے موسم میں جب دھوپ کی تمازت اور لوگی شدت کے باعث آسمان سے آگ برستی اور زمین سے لپٹیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں حضرت کے مزار کرامت آثار کے گرد ٹھنڈک رہتی ہے۔ جو دل کو سکوں اور دماغ کو تازگی بخشتی ہے۔

### جشن ولادت حضور پر نور

عرب کی سرانے میں حضور پر نور کی ولادت کا جشن مقدس دو ازدہم ربیع الاول کو کو اس انداز سے منایا جاتا ہے۔ دو ہزار اعرابی اس مسجد کے صحن میں جو عرب سرانے کے وسط میں واقع ہے۔ جمع ہوتے ہیں۔ تمام شب اس محفل میلاد میں زمزمہ سنجی کرتے ہیں اور آنحضرت کی شان میں شعرائے عرب نے جو نعتیہ اشعار اور قصائد موزوں کیے ہیں انھیں پُر اثر لہجوں کے ساتھ پڑھتے ہیں جس سے اہل تحقیق (صوفیا) پر حالت وجد طاری ہو جاتی ہے ہر طرف سے صدائے درود سلام اور ہر سمت سے تسبیح و تحلیل کی آواز کاؤں میں آتی ہے۔ اور جیسے ہی صبح کے آثار نمودار ہوتے ہیں ختم قرآن پاک میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

اہل شہر خصوصاً صوفیا اور صلیحا تقاضائے دلی کے زیر اثر اس صومعہ مقدس میں



آتے ہیں اور ثوابات اخروی کے حصول اور مقاصد معنوی کے اکتساب میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جو ادراک معنی میں تفاوت کے قابل ہیں وہ اس حال و حال کی مجلس میں سیر ظاہر اور تماثائے باطن میں مصروف رہتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عرب کے صبح و میلح لڑکوں کے دیدار کے لیے اس طرف رخ کرتے ہیں۔

اس وقت کی دہلی میں صرف بزرگان دین اور اہل اللہ ہی کے مزارات پر عرس نہیں ہوتے اہل دول کے مقابر بھی تقاریب عرس منائی جاتی ہیں۔ راک رنگ کی مٹھلیں جمتی ہیں اور مئے و معشوق سے بے محابا دل چسپیوں کے مناظر سامنے آتے ہیں۔ ”خلد منزل“ کے عرس کے موقع پر جو رنگ ریاں ہوتی ہیں ان کی تصویر صاحب ”مرقع“ نے اس رنگ میں پیش کی ہے۔

## عرس خلد منزل

ماہ محرم کی تیسویں تاریخ کو عرس مذکور کی تقریب عمل میں آتی ہے۔ خلد منزل کی قبر حضرت قطب الاقطاب کے روضہ شریف کے جوار میں واقع ہے۔ مہر پرورد جو مرنے والے کی ملکہ ہے ایک ماہ پیشتر سے حیات خاں ناظر کے توسل سے اس کے اہتمام میں لگ جاتی ہے۔ عجیب عجیب طریقوں سے اس مقام کی تزئین کی جاتی اور طرح طرح سے اس کو سجایا جاتا ہے۔ دروازہ شاہی کے چابک دست صنایع اور ہنرمند دست کار طرفہ طرفہ کاری گری دکھلاتے ہیں۔

شب چراغاں میں چمکتے دھمکتے ہوئے چراغ اور برج روشنیوں کا پیغام لے کر آسمانوں کی طرف جاتے اور تجلیوں سے بھرے ہوئے فالوس چپہ چپہ کو گوشہ وادی ایمن سناتے ہیں

من چلے سیلانی اپنے معشوقوں کے ساتھ ہم آغوشی کے انداز میں مٹر گشت کرتے ہوئے پھرتے ہیں۔ اور ... جذبات میں ڈوبے ہوئے لوگ کو چہ و برزن میں ”رقص جہل“ کا منظر پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شراب خانہ شراب کے متوالے

محتب کے اندیشہ سے بے پروا شیشہ و جام سے دل بہلاتے ہیں اور رندان شاہد باز بے محابا شاہد پرستی کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ حسین مردوں اور نوحظوں کا وہ ہجوم کہ اسے دیکھیں تو زہاد کے تقوے ٹوٹ جائیں اور غزالوں جیسی آنکھوں والوں کی وہ ٹولیاں کہ اہل تقوے کو زندگی بھر تو بہ یاد نہ آئے۔ نگاہ اٹھتی ہے تو حسین چہرے نظر کے سامنے ہوتے ہیں اور قدم اٹھتا ہے تو زلف گرہ گیر کے حلقہ فزاک میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ اسباب تعیش کی وہ فراوانی کہ دنیا جہان کے عیش پسند یہاں اپنی دلی مراد کو پہنچتے ہیں اور رنگ رلیاں منانے والے زندگی کی ان بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں کسی کی ہوش کی آنکھیں کھلتی ہیں تو وہ دیکھتا ہے کہ کوئی مرد اسے لنگھیوں سے اشارہ کر رہا ہے اور اس سے پیشتر کہ کسی کی نظر ادھر جائے کوئی کسی اُسے پیام عیش دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہر گوشہ بساط امرار و خواتین سے آراستہ رہتا ہے اور ہر گلی و کوچہ میں فیروں اور دیروزہ گروں کے جھگٹ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ شور و غل ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سازندے اور قوال اتنے کہ کوئی گنا چاہے تو گن نہ سکے اور تماشائیوں کی وہ کثرت کہ خدا کی پناہ۔

مختصر یہ کہ وضع و شریف سبھی یہاں آکر داد عیش دیتے ہیں اور جسمانی لذتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ ایسے ہنگامے میں آنکھیں بند کر لینا عین مسالحت ہے اور نظر اٹھا کر کسی کی طرف نہ دیکھنا سزا سزا بھلائی۔

یہ ہے کہ عرس کی تقریبات کے ایسے مواقع اہل شہر اور عیش پرست لوگوں کے لیے جشن ہائے بے تکلف کا درجہ رکھتے ہیں جن میں شریک ہونے والے دل کھول کر داد عیش دیتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ شراب و کباب کا دور چلتا ہے، بے تکلف ضیافتیں ہوتی ہیں اور رقص و سرور کی محفلیں جمتی ہیں۔ مرقع میں بعض دوسرے عرسوں کے علاوہ میر شرف کے عرس کا ذکر بھی اس انداز کی ایک لفظی تصویر ہے۔

ذکر میر شریف

اس شمع روزگار کی قبر حسرت محبوب الہی کے مزار فاسز الانوار کے قریب ایک

نزہت کدہ میں واقع ہے جس کی ہوا میں نسیم بہشت کی سی تازگی اور طراوت ہے۔ اس باغ کے احاطہ میں پانی کی ایک نہر نہایت دیدہ زیبی اور دل فریبی کے ساتھ بہتی ہوئی گذرتی ہے۔ گل و پیا حسین کی کثرت کے باعث اس کی ہوائیں دل و دماغ کے لیے بڑی فرحت بخش اور سرور افزا ہیں۔ شہر کے رہنے والے خوش معاش اور عیش پسند لوگ برسات کی ہواؤں سے لطف اندوزی کے لیے آتے ہیں۔

شبہنی ہوائیں اس کی طراوت و تازگی سے نوشی کا تقاضا کرتی ہیں اور اس پر فضا مقام کی سیر کو دل بے اختیار تار و طبنور کی صداؤں کی طرف کھینچتی ہے۔ میر گلویہاں طرفہ و تزک و احتشام کے ساتھ تقریب عرس مناتا اور بڑے طمطراق کے ساتھ جشن چراغاں کا اہتمام کرتا ہے۔ روشوں کی تقطیع اور خیابانوں کی تختہ بندی کی جاتی ہے۔ تابدانوں کو بٹھایا جاتا ہے اور نہر کے کنارے جو کافی وسیع ہے، خوب صورت بنگلے، اور برج بڑائے جاتے ہیں۔

عمدہ ہائے شاہی اور ابواب نشاط کو دعوت دی جاتی ہے۔ میر گلویہاں خود جوان العمر ہے اور تمام امیر نادوں سے آشنائی و شناسائی رکھتا ہے۔ اس لیے یہ لوگ اس کی رعایت خاطر کے باعث نشاط و انبساط کے ساز و سامان کے ساتھ یہاں آتے ہیں اور اپنے معشوقوں کو اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ہرے بھرے درختوں کے نیچے خوب صورت گل بوٹوں کے سائے اور تختہ ہائے چمن کے پہلو میں پھولوں جیسے حسین اور رنگارنگ خیمے لگائے جاتے ہیں اور راگ رنگ کی محفلیں جمتی ہیں۔ تمام رات رقص و سرور کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ عطر و پان اور نقل و میوہ سے تواضع کی جاتی ہے۔

طرح طرح کے خوش ذائقہ اور خوشبودار کھانے پکائے جاتے ہیں۔ ہر شخص کے مرتبہ کے مطابق مہمانی کی رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ رات اگر شب برات کی طرح مطلع انوار ہوتی ہے تو صبح، صبح عید کی طرح پر بہار، بازگشت سے پہلے سیر تماشے کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ مہمان خانے کے خیمے جو ”خیمہ دل بادل“ سے مشابہ ہوتے ہیں، پانی کے کنارے ایستادہ کیے جاتے ہیں اور نئے عنوان سے محفل نشاط جو آراستہ کی جاتی ہے۔

ہے۔ ہر طرف فرش فرش لگائے اور مسندیں بچھائی جاتی ہیں اور لوازم ضیافت مہیا کیے جاتے ہیں۔ ارباب نشاط بلا کسی امتیاز کے سرگرم رقص ہوتے ہیں، اور قوال مہمان اور میزبان میں فرق نہ کرتے ہوئے نغمہ پردازیاں کرتے ہیں۔ فقرا اور مشائخ کو ان نعمات پر وجد آتا ہے اور امیرزادے ان سے لطف اٹھاتے ہیں۔ غرض عجیب صحبت اور عجیب بزم بے تکلف ہوتی ہے۔ مشہیات اور مرغوبات میں جو کچھ چاہے، وہاں مہیا ہوتا ہے۔

یہ مزا میر اور لذائذ و لطائف تو خیر خاص خاص مواقع سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں زندگی کی ان مدہوشانہ رنگ رلیوں اور نابخردانہ عیش کوشیوں سے دلچسپی لینے والوں کے یہاں ہر روز، روزِ عید اور ہر رات شبِ بارات ہوتی ہے۔ دہلی کے اس مرقع میں اس کوئے ملامت کے طواف کا بھی ذکر ہے۔ جسے کسل پورہ کہا جاتا ہے۔ جہاں یہ رنگ لیاں سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے تیس دن رہتی ہیں۔

## کسل پورہ

کسل سنگھ امرائے بادشاہی میں سے ہے اور دولت و ثروت کے اعتبار سے اپنے ہم چشموں میں ممتاز ہے۔ اس نے ایک ایسی بستی بنائی ہے۔ اس میں ہر قسم کی ناپنیدہ عورتیں اور کبیوں (مال زادیوں) کو لاکر آباد کیا ہے۔ بڑے لوگوں کو جو ہر قسم کے مسکرات کے عادی ہوتے ہیں، اس کی چھتر چھایا میں یہاں عیش اڑانے کی دعوت عام ہے۔ اس جماعت کی کثرت کے باعث یہاں محتب کا پائے نگاہ بھی نہیں پہنچ سکتا اور اس کے احتساب کی قدرت سلب ہو جاتی ہے۔ اس کے راستہ پر پیشہ ور عورتیں شوخ اور بھرپکیلے رنگوں کے کپڑوں میں بلبوس گھومتی پھرتی اور گلی کوچوں کے موڑ پر اپنے بلا نصیب عاشقوں کو ہم آغوشیوں کی دعوت دیتی نظر آتی ہیں۔

مختصر یہ کہ یہاں کی ہوا جنسی جذبات میں بیجان پیدا کرنے اور یہاں کی فضا لذائذ نفسانی کو بے طرح برا بھلا کرنے والی ہے۔ خصوصاً شام کے وقت یہاں بڑا جنگامہ

رہتا ہے۔ ہر مکان سے ناپنے والوں کے گھنگھروں کی آوازیں آتی ہیں اور ہر جگہ ایک بزم نشاط بھی ہوتی ہے، لہو و لعب میں زندگی گزارنے والے بے روک و ٹوک آتے جاتے ہیں اور ..... بیماریوں سے اپنی عیش کوشیوں کے دامن کو آلودہ کرتے ہیں۔ غرض یہ جگہ بھی ایک طرفہ تماشا اور ایک عجیب کارگاہ ہے۔

## ذکر کیفیت ناگل

ہر ماہ کی تاریخ کو دہلی کی آزاد مزاج عورتیں اور عیش پسند خواتین خوب سنگار پتار کے زیارت کی نیت سے یہاں آتی ہیں، مگر مدعا کچھ اور ہوتا ہے۔ دراصل وہ یہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ آنکھ پھولی کھیلنے آتی ہیں۔ بہت سے کوالے اور غربت پیشہ لوگ اس امید پر کہ کسی کی نگاہ انتخاب ان پر ضرور پڑے گی، بن سوار کہ یہاں پہنچتے اور عشق بازی اور ہوس کاری کے اس کھیل میں اپنا اپنا مقدمہ آزما رہے ہیں۔

اس جگہ کی یہ خاصیت ہے کہ اگر کوئی سات جنوں کا کنوا بھی یہاں پہنچ جاتا ہے تو اس کی دلی آرزو پوری ہو جاتی ہے اور اس کی جوڑی مل جاتی ہے۔ لوگ صبح سویرے وہاں پہنچتے ہیں اور تمام دن عیش کی چھان کہ سر شام وہاں سے واپس لوٹتے ہیں اور واپسی میں ان ہانفوں اور بستانوں کی سیر کرتے ہوئے آتے ہیں جو راستے میں پڑتے ہیں۔ ہم مغلوں کی شام زوال کے ان بڑھتے ہوئے سالیوں کو ان مقامات کے جمیلوں اور میلوں ٹھیلوں ہی میں نہیں دیکھتے، بلکہ خاندانی امراء کی بچی زندگیوں میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ اعظم خاں ایسے ہی عیش پسند امراء میں سے ہے، (جس کی عمریلی کے نام سے آج تک ایک محلہ آباد چلا آتا ہے)۔

ذکر اعظم خاں پرفدوی خاں برادر زادہ خاں جہاں مالگیری.....

ذی شان امیر زادوں میں سے ہے۔ رنگین مزاجی کے اقتضاء اور رنگ سے غیر معمولی دل چسپیوں کے باعث ہندوستان کے مغربوں کا مدد ہے۔ اس کی طبیعت امر پرست واقع ہوئی ہے۔ اس کا دل سادہ رویوں کے عشق میں گرفتار ہے

اور اس کی جاگیر کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس طبقہ کی مزاج داریوں میں صرف ہو جاتا ہے، جیسے ہی اُسے کسی حسین امر کا حال معلوم ہوتا ہے، ہر طرح اس کی رعایت کی کہ وہ اُسے اپنی رفاقت کے پھندے میں پھنسا لیتا ہے۔

اس طبقہ کے بہت سے لوگ اس کے حسن طبیعت کے باعث مناسب منصبوں پر فائز ہو گئے اور اس کے ہر وقت کے ساتھی ہیں۔ یہ لوگ مبارقہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کے جلو میں چلتے ہیں اور آغا یہ حالت ہے کہ جہاں کوئی سبزہ رنگ ملتا ہے وہ اعظم خاں کے نام سے منسوب ہے اور جہاں کوئی نوحہ نظر آتا ہے، اسے اس کی بساطِ عیش کا ٹہرہ تصور کیا جاتا ہے

دن تازہ رویوں کے خیال سے اپنی صبح پیری کو خضاب آلود کرتا ہے اور اس واہمہ میں کہ فرصت زندگی بہت کم ہے۔ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو عیش و شہو میں بسر کرتا ہے۔

## ذکر لطیف خاں

یہ بھی شہر کے امیر نادوں میں سے ہے۔ ہمیشہ اس کی ہمت بزم آدائیوں میں مصروف رہتی ہے۔ وہ ناگ راگینوں کا اس قدر شائق ہے اور اس میں اس وہ مشاق ہے کہ نعمت خاں بھی اکثر اس کے گھروں آتا ہے اور اس کے اندازِ نغمہ سازی کی تعریف کرتا ہے۔ اس کے طرزِ نغمہ کی خوبیوں کی وجہ سے امراء و بہار اس کی باریابی کے معنی رکھتے ہیں اور اس کے کہاں فن سے محظوظا ہوتے ہیں۔

وہ چٹمست کی طرح علی اللہام فقہ میں چمک رہتا ہے اور ماغری کی طرح ہمیشہ میٹا شراب کی پرستش میں موزن نظر آتا ہے۔ وہ اپنی صحبتوں میں رنگین اشعار پڑھتا اور بیچ بیچ میں دلچسپ لطائف کو نقل مجلس بناتا رہتا ہے۔ وہ اہل محفل کی دل جوئی اور مناظرہ میں اتنا اہتمام برتتا ہے کہ جو شخص ایک بار اس کی محفل میں شریک ہو جاتا ہے وہ اسے اپنا ہم دم و یرینہ خیال کرنے لگتا ہے۔

اس کی بزم بے تکلف میں جو بھی شریک ہوتا ہے، وہ مینا و جام سے اس کی تواضع کرتا ہے اور ہر ایک کے سامنے الگ الگ شیشہ ہائے شراب اور نقل و گزک رکھے جاتے ہیں تاکہ ہر شخص بے شاہدہ شرکت شغل مینا و جام سے مسرور و مخطوط ہو سکے۔

یارانِ نغمہ سنج اپنے اپنے مواقع پر خوش نوائی اور خوش ادائیگی کی داد دیتے ہیں۔ بلحاظ مراتب نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ اس پنج میں دلچسپ لطیفوں سے مجلس کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے اور بدیہہ گوئی اور بندہ سنجی سے محفل چمک اٹھتی ہے۔

دو گھڑی دن سے ایک پہرات تک یہ صحبت چلتی ہے۔ نوبہائی اور دوسری طوائفیں اپنے سازندوں اور نوازندوں کے ساتھ اس محفل میں شریک ہوتی ہیں۔

اب کہ اس کی زندگی میں دولت و ثروت کی وہ ریل پیل نہیں رہی۔ اس کی محفلوں میں وہ گہما گہمی تو دیکھنے میں نہیں آتی۔ پھر بھی کچھ خاص خاص لوگ جمع ہوتے ہیں اور بہت سے اچھے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اکثر اس کی زبان پر یہ شعر آتا ہے

در حرم بزم مستان، دورِ صبح و تمام نیست

گردش جام است این جا گردش ایام نیست

مئے و معشوق اور ساز و آواز سے غیر معمولی دل چسپی لیتے والے ان امیرزادوں میں کچھ

ایسے بھی ہیں جو سحر و ظلم سے شغف رکھتے ہیں۔ میرمنو اس کی ایک مثال ہے۔ یہ امیرزادہ

سحر کاری کے فن میں یگانہ روزگار ہے۔ اکثر امیرزادے اس علم کے ضروری احکام

اس سے سیکھتے ہیں اور اس کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔ اس کا گھر شہاد کی بہشت ہے

اور اس کا کاشانہ پری زادوں کے لیے ایک شاخ نشین، اس کی مجلس شاہدوں کا

دارالعیار ہے اور اس کی ہم نشین گلرخوں کے لیے وجہ اعتبار۔

انہیں اصحاب فن میں کچھ اہل سخن بھی ہیں۔ مرزا عبدالحق دارستہ کا یہ ذکر

ملاحظہ ہو:

”آمدنی کے معتدبہ وسائل اور ایک اچھے منصب کے ساتھ ساتھ ایک پربہار

طبیعت اور آزادانہ مزاج رکھتا ہے۔ اس نے ایک بہت خوب صورت عمل بنایا ہے۔ اس کے درو دالان کو مکلف فرش فروش اور رنگین پردوں سے آراستہ کیا ہے اور شیشہ کے ظروف و آلات بڑے سلیقہ سے اس کے طاق و محراب میں سجائے گئے ہیں۔ اس سجاوٹ کے باعث یہ مکان ارباب نظر کے لیے وجہ تماشا اور سبب کشش بن گیا ہے۔ شعرائے رنگین خیال پر ہی زادانِ معنی کی طرح اس شیش محل میں وارد ہوتے ہیں اور دل چسپ اشعار اور پُر لطف لطیفوں سے محل کو گل و گلزار بناتے ہیں۔

مرزائے مذکور کی جانب سے حقے، قہوے، معجون اور عطر و پان سے اُن کی تواضع کی جاتی ہے۔ قدما اور زمانہ موجود کے شعراء کی بیاضیں اور دیوان کھولے جلتے ہیں۔ شرخوانی ہوتی ہے اور ارباب فن کو ان کی خوش گوئی و خوش ذوقی کی داد ملتی ہے۔

عہد محمد شاہی کی دہلی کے یہ رنگین جلسے اور پُر لطف صحبتیں اس کی مقتضی ہیں کہ یہاں ارباب فن کا اجتماع ہو۔ "مرقع دہلی" میں بہت سے فنکاروں کا تعارف موجود ہے جن میں نعمت خاں بین نواز جیسے صاحب فن افراد بھی ہیں۔ جن کا ذکر "ارباب طرب" کے تذکرے میں آیا ہے۔

## ذکرِ نعمت خاں بین نواز

ہندوستان (دہلی) میں اس کا وجود بہت بڑی نعمت ہے۔ نعموں کی لہجہ اور شعبوں کے اختراع میں "ید بیضا" رکھتا ہے اور بڑے بڑے نائکوں کے ساتھ پہلوزنی کرتا ہے۔ کئی راگوں کا موجد اور کئی زبانوں میں صاحب تصنیف ہے۔ ہندوستان بھر کے مغنیوں کا سرتاج ہے۔ بادشاہ جم جاہ کے سوا کسی دوسرے امیر کی محفل میں نغمہ سرائی نہیں کرتا۔ بزرگانِ دین کے مزارات پر ہونے والے عرسوں میں عقیدت کے ساتھ شریک ہوتا ہے اور خود بھی ہر مہینہ کی گیارہویں کو مجلس کرتا ہے۔ اس کی محفل میں اعیان شہر اور امرائے دولت بڑے ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور شائقین کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ تیل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی۔



اس کا بھائی بھی ساز بجانے میں بڑی دست گاہ رکھتا ہے اور چار چار گھنٹے تک نئے نئے رنگ اور آہنگ پیدا کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے اور کسی موقع پر بھی خارج از آہنگ نہیں ہوتا۔ یہ خوبی استعداد اور استادانہ فن کاری ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کا بھتیجہ تار نوازی میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ طرز تازہ کا موجد ہے۔ وہ نئے جو دوسرے عمدہ عمدہ سازوں سے وجود میں آتے ہیں وہ انہیں تار کے تاروں سے پیدا کر دیتا ہے۔ غرض کہ عجائب روزگار سے ہے۔ ان اہل فن میں بیشتر لوگ ایسے بھی ہیں جو اہل فقر سے نسبت و ارادت رکھتے ہیں۔

## تاج خاں قوال

شہر کے ممتاز گویوں میں سے ہے۔ اس کے نعمات کی دل آویزی بلبلی کی دانتان سرایوں سے زیادہ رنگین ہے اور اس کی آواز بڑگ گلی سے سوانازک — اس کا مذاق نغمہ سنجی فقر و دلہی کی چاشنی سے آشنا ہے۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ عین بزم میں اس پر گریہ بے اختیار طاری ہو جاتا ہے۔ ہر ماہ کی تاریخ کو اس کے ہاں اجتماع ہوتا ہے اور اکثر فقراء و مشائخ جو سماع کے عاشق ہیں، ان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ شہر کے بہت سے معتبر قوال اس کی بزم میں حاضر ہو کر اپنے نغمہ سنجیوں کی داد دیتے ہیں اور بچے بعد دیگرے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اپنی اس درویش حراچی اور فقیرانہ طبیعت کی وجہ سے تمام حاضرین میں وجہ تزیح سمجھا جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک دوسرا فن کار "غلام محمد سارنگی نواز" ہے۔ اس فن کے جاننے والے اُسے مستثنیات میں شمار کرتے ہیں اور بہت عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اہل فقر اور فقراء سے نسبت ارادت رکھتا ہے اور اپنے خیال میں نظر فقر سے بہرہ ور ہے۔ فن موسیقی کے ممتاز ماہرین میں "رحیم تالین" کا ذکر صاحب مرقع نے بڑی

دل چسپی کے ساتھ کیا ہے۔ تانسین کے بیروں میں سے ہے اور اس کی مہارت فن اور سائی طبع اس کی نسبت کی سچائی پر گواہی دیتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ تمام مغنیوں کا مخدوم نادر ہے۔ اس کے نغموں کا جادو ہوا کو باندھ دیتا ہے۔ اس کی آواز اتنی مدھی ہوتی ہے اور اس کا گلا اتنا منبھا ہوا ہے کہ وہ چاہے جتنی دیر گائے اس کی صدا کا ظلم نہیں ٹوٹتا اور وہ کبھی غلط آہنگ نہیں ہوتا۔ کبت خوانی میں وہ عجائبات روزگار سے ہے اور دھرپد میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

ایک مرتبہ حسن اتفاق سے استاد رحیم خان حسین خاں ڈھولک نواز کو وہ بھی اپنے فن میں نادر العصر ہے اور حسن خاں ربابی اور گھاسی پکھاوجی ہر ایک اپنے اپنے فن میں بے مثال ہے، ایک ساتھ جمع تھے، خوب مجلس گرم ہوئی اور سطف آگیا۔

## گھاسی رام پکھاوجی

اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا گیا ہے، اس کا ساز چمڑے کے بجائے اگر برگ گل سے تیار کیا جائے تو مناسب ہے۔ اس کے ہاتھ کی جنبش اور پوروؤں کی حرکت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے پھولوں کی پتیاں ہوا میں لہرا رہی ہوں۔“

## حسین خاں ڈھولک نواز

اپنے فن میں عجیب و غریب شخص ہے اور ڈھولک نوازی کے فن کو اس نے میاں کمال تک پہنچا دیا ہے، جس کے آگے آدمی کا خیال بھی نہیں جاسکتا۔ اہل ہند اس پر متفق ہیں کہ سر زمین ہند میں اس سے بہتر ڈھولک نواز پیدا نہیں ہوا۔

## شہباز دہمدھی نواز

اس کا باپ اعظم شاہ کی سرکار میں لوکر تھا اور یہی ساز بھاتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے فن میں اپنی خیر نہیں رکھتا، اور ایسے ایسے کمال دکھاتا ہے جو پکھاوجی

اور ڈھولک نواز کے لیے بھی ممکن نہیں۔ جس راگ کا جو وقت ہوتا ہے، اس وقت میں وہی راگ اپنے اس ساز پر پیش کرتا ہے۔

### شاہ درویش سلوچہ نواز

اس فن میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے اور اس شان سے سلوچہ نوازی کرتا ہے، کہ ڈھولک نوازوں اور پکھاوجیوں کو اس کے آگے پسینہ آجاتا ہے۔ قدر دان جب اسے اپنی محفل میں بلاتے ہیں تو توجیہ دار سواری بکھیچتے ہیں اور اس کی فن کاری پر جھوم اٹھتے ہیں۔ اس نے ایک ایسا ساز ایجاد کیا ہے جو کئی سازوں کا جامع ہے، جس سے ڈھولک کی آواز بھی آتی ہے اور پکھاوج کی صدا بھی نکلتی ہے اور جس کے درمیان سے طبنور کی آواز بھی بلند ہوتی ہے۔

ایک نابینا فنکار اپنے پیٹ کو ڈھولک کی طرح بجاتا ہے اور اس کی ضربیں موسیقی کے دستور و ضوابط کے مطابق ہوتی ہیں۔ اکثر طوائفیں اس کے سازِ شکم کی گمک پر رقص کرتی ہیں۔

باقر طبنورچی، قاسم علی خاں، معین الدین قوال، رہانی قوال، رہانی امیر خاں، رحیم خاں خیالی اور شجاعت خاں وغیرہ کے نام بھی فن کاروں کے ضمن میں آتے ہیں۔ موخر الذکر کبت خوانی میں بڑا دعویٰ رکھتا ہے۔ پگھای اور اس پر بیچ بڑی تزیین و تقطیع کے ساتھ باندھتا ہے۔ اس کی پلکیں ہمیشہ سرمہ سے سیاہ رہتی ہیں۔

ارباب فن کے ساتھ اہل سخن سے بھی اس بباط تہذیب کے بعض گوشے سجے ہوئے ہیں۔ ان میں سراج الدین خاں آرزو اور مرزا جان جانان جیسے اکابر بھی موجود ہیں۔ اول الذکر کے تعارف میں "ذکر اہل ادب" کے تحت لکھا ہے،

### سراج الدین خاں آرزو

وہ موزونان شہر کی اجمن کی روتی ہیں اور نکتہ سخنوں کی محفل کے چشمہ چراغ رہیں۔

تمام سخنوران دہلی ان کے شیفتہ صحبت ہیں اور تمام امرائے بادشاہی ان کی ملاقات کے آرزو مند رہتے ہیں۔ اہل دولت کے ساتھ ان کی صحبت گرم رہتی ہے اور تمام مجموعوں میں ہلال کی طرح ان کی طرف لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں۔ جس محفل میں وہ رونق افزہ ہوتے ہیں، ”مرجا مرجا“ کی آوازیں آتی ہیں اور جس بزم میں ان کا ورود مسعود ہوتا ہے، تحسین و آفریں کی صدائیں بے اختیار بلند ہوتی ہیں۔ اہل اشتیاق کے لیے ان کی صحبت ایک حسن اتفاق ہے۔ مرزا بیدل کے عرس کے دن جس سے وہ نسبت شاگردی رکھتے ہیں، ان کے یہاں بزم سخن منعقد ہوتی ہے اور وہ اہل سخن اور ارباب فن کو اپنے افکار گوہر نثار سے ذلہ باری و گل چینی کا موقع دیتے ہیں۔

### مرزا جان جاناں (منظہر)

نشہ عشق کی چاشنی ان کے ضمیر میں داخل ہے اور آتش شوق کی سوزناکی ان کا مزاج ہے۔ علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد ایما غیبی اور تائید لاریبی کے اشارے پر راہ تحقیق (تصوف) میں گامزن ہو گئے۔ اب ان کی ذات بابرکات، ”مرزائی و درویشی“ کی جامع ہے۔ ایک دنیا ان کی محفل میں باریابی کی مہمئی رہتی ہے جس کو بھی حسن اتفاق سے یہ سعادت نصیب ہو جائے اور بے شمار لوگ اپنے دل میں یہ آرزو لیے رہتے ہیں جس کی بھی قسمت پاوری کر جائے۔ وہ بڑے پر لطف اور بامزہ شعر کہتے ہیں اور ان کے کلام کا نازک نشتر رگ جاں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ امرائے عالی شان ان کی خدمت میں رسائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں، اس پر بھی ان کی صحبت میسر نہیں آتی۔ ان کی متبرک رہائش گاہ دہلی کہنہ میں ہے، لیکن اپنی طبیعت نازک مزاجی کے باعث وہ خوشبو کی طرح سیروسفر میں رہتے ہیں۔ ان کا قیام کبھی یہاں رہتا ہے اور کبھی وہاں، اس لیے ان سے ملاقات کا اتفاق بہت کم ہوتا ہے۔

(بعض اہل سخن تو آج تاریخ ادب کے لیے بالکل غیر معروف شخصیتیں ہیں۔)

## معنی یاب خاں

بادشاہ کے منتخب امراء میں سے ہے۔ غزالانِ افکار کو بید کرنے میں قدرتِ تمام رکھتا ہے اور لطفِ سخن کی ادائیگی میں اس کی طبیعت بہت رسا واقع ہوئی ہے۔ غزل نگاری میں اُسے یدِ بیسنا حاصل ہے اور ایسی طرفگی کے ساتھ غزل پڑھتا ہے کہ سننے والے وجد کرنے لگتے ہیں۔

ماہِ صفر کی تیسری تاریخ کو جو مرزا عبد القادر بیدل کے عرس کا دن ہے، تمام شعرائے دہلی ان کے مزار پر جمع ہوتے ہیں اور ان کے دیوان کو درمیان رکھ کر شہزادوں کا آغاز ان کے اشعار سے کرتے ہیں اور حاضرینِ مجلس سے داد و تحسین کے طلب گار ہوتے ہیں۔ معنی یاب خاں وہ شخص ہے جو سب سے پہلے غزل پڑھتا ہے۔ اس کی پیش کش کا انداز اربابِ معنی کے نزدیک بہت مستحسن (ہوتا ہے)۔ اس کے اشعار ابتداء سے انتہا تک ناخن بدل زن ہوتے ہیں اور نکتہ گیروں کے اندیشہ سے آزاد۔

## میر محمد افضل ثابت

یہ ان کی طبعی نہی اور نجات کا تقاضہ ہے کہ اہل دنیا کی طرف ان کو بالکل رغبت نہیں، وہ زم توکل کے مسند نشین ہیں اور اپنی بلند ہمتی کے سہارے انہوں نے اپنی پائے استقامت کو درویشی کے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور اپنی فطری بے نیازی اور اعلیٰ طبعی کے باعث ہر طرح کی متبذل باتوں سے خود کو الگ کر کے فکرِ شعری اور صوفیانہ مشاغل میں لگ گئے ہیں اور دوسرے کاموں کی طرف توجہ فرما نہیں ہوتے۔ انہوں نے مختلف کتابوں سے انتخاب کر کے علمِ تصوف میں ایک نسخہ عالیہ ترتیب دیا ہے اور اپنا کلام ردیف وار ترتیب دیکر اہل زمانہ کو اپنا ممنون بنا لیا ہے۔

## ابراہیم علی خاں راقم

اس کا دادا عالمگیری امرار میں سے تھا۔۔۔ اس کی شاعری کی شہرت عالمگیر ہے اور تمام اہل سخن سے خراجِ محبتیں وصول کرتی ہے۔ وہ اپنی بدیہہ گوئی کی وجہ سے دوسرے اہل سخن پر فوقیت رکھتا ہے اور لطفِ سخن میں ان سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ کم نصاعتی اور اسبابِ معاش کی تنگی کے باوجود اس کے گھر پر اہل استحقاق کا ہجوم رہتا ہے اور اس زمانہ سازگار کا شکوہ جس سے ہزاروں کا دل خون ہو رہا ہے، اس کی زبان پر کبھی نہیں آتا، بلکہ منعمِ حقیقی کی بخششوں اور عنایتوں کے شکر میں وہ ہمیشہ تر زبان رہتا ہے اور اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ دل جمعی اور خوش اختلاطی کے ساتھ وقت گزارتا ہے اور اپنے خوبصورت خیالوں اور رنگین خوابوں کے سہارے اپنی "زم بے کسی کو بساطِ عیش کی سی رنگینیاں بختا ہے۔"

## میر تقی الدین مفتوں

ناقدِ شناس زمانہ نے جو کچھ اُسے دیا ہے، اسی پر قناعت کرتا ہے اور اپنی احتیاج کے مطابق اہل دولت سے بس ضروری واسطہ رکھتا ہے۔ بزرگانِ سلف کے طریقہ پر مشقِ سخن کرتا ہے۔ اسی لیے اس کے اشعار قدیمانہ رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔

## گرامی کشمیری

خطِ کشمیر بہشتِ نظیر کے شعراء میں سے ہے، مولویت کے باد صفت چاشنی سخن کا ذوق رکھتا ہے۔ اپنے اشعار کا پستارہ اپنی بغل میں دبائے پھرتا ہے اور سخن فہموں کے سامنے کشمیر کے گالے والوں کی طرح بڑے زور و شور سے پڑھتا ہے اور اپنی تازہ گوئی کا اس قدر دعویٰ رکھتا ہے کہ بزمِ مشاعرہ کو مجلسِ مناظرہ میں بدل دیتا ہے۔

## مرزا ابوالحسن آگاہ

بہت رنگین طبع آدمی ہے۔ تمام شعرائے دہلی سے اختلاط رکھتا ہے اور ان کا ہمنوا رہتا ہے۔ مرزا بیدل کے عرس میں ان کے دیوان سے انتخاب کی جانے والی غزل یہی شخص پڑھتا ہے اور خود بھی ہمیشہ فکر سخن میں مشغول رہتا ہے۔

### حلیما

عرب زادوں میں سے ہے۔ اس کا کلام اسحق اطعمہ کے کلام سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ نان و قیرنی کے مضامین بڑی آب و تاب سے باندھتا ہے اور ہمہ وقت اس کی طبیعت کے آتش خانے میں کیا بوقلیہ کا تمام سامان مہیا رہتا ہے۔ متقدمین اور متاخرین کے پچاس ہزار شعر اس کو یاد ہیں۔ اہل سخن میں وہ مرثیہ خواں اور مرثیہ گو بھی شامل ہیں، جنہوں نے اپنے زمانے کے اعتبار سے اس فن کو درجہ کمال تک پہنچایا ہے۔ جن کا تذکرہ صاحب مرقع نے "ذکر مرثیہ خوانان" کے عنوان سے کیا ہے۔

### پسر لطف علی خاں (دیوان جاوید خاں)

منقبت اور مرثیہ کے اشعار وہ اس شان و آن سے کہتا ہے کہ اُسے مختتم وقت کہنا چاہیے۔ ریختہ میں بھی اس کی منقبت گوئی کا انداز بہت خوب ہے۔ مرثیہ عجیب سوز و گداز سے کہتا ہے۔ جاوید خاں کے عاشور خانے کا منتظم ہے۔ زائرین کے ساتھ مراعات سے پیش آتا ہے اور بڑی عقیدت سے تعزیرہ داری کرتا ہے۔

### مسکین و حزیں و غم گین

یہ تینوں بھائی ہیں اور بڑے حسرت خیز اور درد انگیز لہجہ میں زبان ریختہ میں مرثیہ

لکھتے ہیں، تمام شہر میں ان کے کلام کی شہرت ہے، اور سچ یہ ہے کہ تینوں صاحبان بہت اچھا مرثیہ پڑھتے ہیں۔ لوگ ان کی طرف بہت رجوع رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار کی نقلیں اور مسودے بڑی کوشش و کاوش سے حاصل کرتے ہیں اور ان کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ درحقیقت ان عزیزوں کی فرما روائی کا ایک عجیب انداز ہے۔ اور ان میں طرفہ تلاش ملتی ہے۔

مختلف امراء کے یہاں سے ان کی کاوشوں کا اتنا صلہ مل جاتا ہے جو ان کی مدد معاش کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مرثیہ و منقبت کے علاوہ کسی دوسرے موضوع پر فکر نہیں کرتے۔ ان کے مرثیوں کو سن کر عزاداروں پر گریہ طاری ہوتا ہے جو روضۃ الشہدا اور "واقعات بلا مقبل" کے اشعار سے بھی ممکن نہیں۔ مراتب غم کے قدرداں اس کو جانتے اور فوائد ماتم کے رمز شناس اس سے واقف ہیں۔

میر عبد اللہ

ابا عبد اللہ حضرت امام حسین کے تعزیه داروں میں سے ہے۔ ندیم و حزیں کے مرثیوں کو اس قدر حیرت انگیز اور گریہ خیز لہجہ میں پڑھتا ہے کہ سننے والوں پر بے اختیار رقت طاری ہو جاتی ہے اور شور ماتم بلند ہوتا ہے۔ نوحہ و فریاد کا خردش آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا مسرعہ ابھی پوری طرح سے ادا بھی نہیں ہوتا کہ گریہ خلائق فقرہ مستنزد کی طرح اس کے ساتھ موزوں ہو جاتا ہے۔ اور ابھی اس کے لب پر آیا ہوا شعر اختتام کو نہیں پہنچتا کہ نوحہ کا تزیج بند باوجود تکرار کے مضمون تازہ کی طرح سامنے آتا ہے۔

استادان موسیقی اس پر متفق ہیں ہیں کہ اتنے اچھے کسی مرثیہ خواں نے ابھی تک عالم رجماد میں قدم نہیں رکھا۔ محرم کے مقدس و تبرک مہینے میں یہ صاحب جو اپنے کمال فن کی وجہ سے ایک واجب الاحترام شخص سمجھے جاتے ہیں۔ جن عز خانوں میں نوحہ گری کے لیے پہنچتے ہیں، ان مکانات موعود کی طرف لوگ بے اختیار کھینچے چلے آتے ہیں۔



ہیں اور ایک دوسرے پر سہقت حاصل کرتے ہیں۔ یہ جہاں جلتے ہیں، ان کے ساتھ ان کے اعوان و انصار اور خوش جہاں لڑکوں کا ایک جم فیفر ہوتا ہے۔ ماہِ محرم کے علاوہ ان کے گھروں مردوں کا مجمع رہتا ہے۔ ان میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان سے مرثیہ خوانی کے آداب سیکھنے آتے ہیں۔ آداب شاگردانہ کے ساتھ آنے والوں میں کلاونت اور قوال بھی شامل ہوتے ہیں۔

## شیخ سلطان

اس کے باوصف کہ وہ اصلاً تورانی ہیں۔ ادائے تلفظ میں فصحاء ہندوستان کے ساتھ برابری کرتے ہیں۔ بڑی آب و تاب کے ساتھ مرثیہ پڑھتے ہیں۔ عامیانه طریقے اختیار کرنے کے باوجود ان کے اشعار دلوں پر اثر کرتے ہیں۔ ان کی آواز اور گریہ خلایق نے جیسے آپس میں عہد باندھ رکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

## میر ابو تراب

اس کی مرثیہ خوانی کا انداز بے حد گریہ خیز اور ادنیٰ کی مطالب کا ڈھنگ انتہائی درد انگیز ہے، چونکہ فن موسیقی میں مہارت حاصل ہے، اس لیے بھی اس کے مرثیہ پڑھنے کا اسلوب بہت پیارا اور دلوں پر اثر کرنے والا ہے، جس کو سن کر عزاداری کرنے والے بے اختیار بے قرار ہو جاتے ہیں۔ عز خانوں اور ماتم داروں کی مجلسوں میں میر ابو تراب کو بہت مہترک اور واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے۔

## میر دلوش حسین

خامس آل صبا حضرت امام حسین کے عزاداروں میں سے ہے۔ اس کے مرثیہ کو سن کر اہل عزاء پر بے اختیار رقت اور گریہ کا عالم طاری ہوتا ہے اور مجلس میں خود شین ہوتا ہے۔ جاوید خاں کے وابستگان دولت میں سے ہے۔

## محمد نعیم

رقت انجیز الفاظ موزوں کرنے اور غم انجیز استعائے کام میں لانے کی بڑی مہارت رکھتا ہے۔ جن کو سن کر عزا داروں کے سینے چاک ہو جاتے ہیں۔ مرثیہ کے اشعار میں عجیب و غریب اندازے تفسیخ کرتا ہے۔ خصوصاً وحشی یزدی کے مدس کو تفسیخ کرنے میں اُسے یہ بیضا حاصل ہے۔

انہیں مرثیہ خالوں میں "جانی حجام" بھی ہے جس کی درد آلود صدا (صاحب مرقع کے بیان کے مطابق) دلوں میں نشتر شکنی کرتی ہے۔ یہ پہلے کسی امیر کا منظور نظر تھا، طرفہ حسن و جمال رکھتا تھا اور بڑی آن بان سے زندگی گزارتا تھا۔ آدمی بن گیا تھا۔ لیکن ناؤ لوش کے شغل میں یہ دولت اڑادی۔ اب آسمان سے درپے انتقام ہے، لیکن خوش صحبت اور رنگین طبع آدمی ہے۔ امیر زادے اس کے ساتھ مراعات سے پیش آتے ہیں، اور رقص و سرور کی محفلوں میں اسے بلاتے ہیں۔ خیال اور جنگلہ خوب گاتا ہے۔ فی الجملہ اب بھی خوش اوقات ہے۔

ان بیانات اور تعارفات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عزاداری کی رسمیں اور اس کے ساتھ مرثیہ خوانی کا سلسلہ اس عہد کی تہذیبی روایت میں داخل ہیں اور مرثیہ کہنے اور پڑھنے والے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

تشیخ پسندی کے اثرات اور حبت اہل بیت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ دہلی والوں کو ارباب فقر و تصوف سے بھی گہری دل چسپی ہے اور بزرگان دین کے مزارات پر عرس کی حقربہات کے علاوہ خانقاہی آداب و رسم بھی انہیں عزیز ہیں۔ مرشدین طریقت کو بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی خانقاہوں میں اہل ارادت کا ہجوم رہتا ہے۔ مرقع میں ایسے بہت سے خانقاہ نشین بزرگوں کا تعارف اور ان کی تعریف ملتی ہے۔

## ذکر شاہ غلام داؤل پورہ

اہل ارادت کی ایک کثیر جماعت آپ کے دائرہ توکل سے وابستہ ہے۔ ظاہری سطح پر اسباب راحت کے فقدان اور فقر و درویشی کے اس ماحول کے باوجود کہ ہمیشہ آپ کی خانقاہ میں ملتا ہے۔ یہ آپ کے ثبات قدم کی برکت اور استقلال و صبح کا اثر ہے کہ ضعیفوں اور محتاجوں کی ایک بڑی تعداد جو آپ کی خانقاہ کے پاس توکل بر خدا "پڑی رہتی ہے" اس کا رزق برابر پہنچتا ہے۔ جو اہل حاجت صبح سے لے کر شام تک یہاں آتے رہتے ہیں، نذر و فتوح کے فوائد میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ خانقاہ میں جو چیزیں آتی اور پیش کی جاتی ہیں، ان میں سب کا حصہ مساوی ہوتا ہے اور کسی کو بھی محروم نہیں رکھا جاتا۔

ایک پہر رات گزارنے کے بعد خانقاہ سے توسل رکھنے والے تمام افراد کو کھچڑی تقسیم کی جاتی ہے اور سب لوگ بغیر کسی امتیاز کے یہ کھچڑی تناول کرتے ہیں۔ اہل خانہ کے لیے بھی یہی کھچڑی بھجی جاتی ہے۔ قوال بھی اس آستانہ کے فیض و بخشش میں برابر کے شریک رہتے ہیں، بلکہ شریک غالب رہتے ہیں۔ جس طرح سایہ شخص سے جدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی خانقاہ کے ہم وقت کے ساتھی ہیں۔ ان کی وجہ سے یہاں ہنگامہ وجد و حال برپا رہتا ہے۔ عرض یہ کہ یہاں و صبح و شریف اور امیر و غریب سب ہی آتے ہیں اور سب کے ساتھ مساوی سلوک کیا جاتا ہے۔ "دبار شاہی" اور امرائے شہر کی طرف سے بڑے مبالغہ کے ساتھ نذر و فتوح کی پیش کش ہوتی ہے، لیکن قبول نہیں ہوتی۔

## ذکر حافظ شاہ سعد اللہ

لوگوں کے نزدیک وہ بہت ہی پیچھے ہوئے بزرگ ہیں اور بعض کے نزدیک تو قطبیت کے درجہ پر فائز ہیں۔ اکثر راہِ قمر تمنا میں گامزن ہونے والے ان کے آستانہ

ولایت کی طرف راغب اور ذکر و شغل کے وسیلہ سے ”تزکیہ نفس“ اور ”تصفیہ باطن“ کی منزلوں سے گزرتے ہیں اور کسب کمال کے بلند درجوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ سے ارتباط رکھنے کے باعث سماج سے رغبت نہیں فرماتے۔

### ذکر شاہ محمد میر

آپ کی متبرک زندگی کی برکت والی ساعتیں کمالات روحانی کے کسب میں گزرتی ہیں۔ اور آپ کا مزاج مقدس وجد و حال کی کیفیات میں ڈوبا رہتا ہے۔ ابتدا سے صبح تہیز سے آپ ہمیشہ روزہ دار رہتے ہیں اور تمام تر وقت عبادت و ریافت الہی میں گزارتے ہیں۔ ان کے اوقات عزیز نیلیوں سے معمور رہتے ہیں اور ان کی مبارک پیشانی تجلیات نور سے روشن رہتی ہے۔

### شاہ پانصد مہنی

توران کے رہنے والے ہیں۔ بہت گراں ڈیل اور صاحب و جاہت شخص ہیں۔ مغلوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر فقرا ان کے ساتھ رہتے ہیں اور تورانی امراء کی طرف سے بڑی بڑی رنمیں اور بیش قیمت نذریں ان کے دیگ جوش اور خانقاہ کے مصارف کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ آج رات اگر وہ یہاں ہیں تو کل کسی دوسری انجمن میں رونق افروز ملیں گے۔ ان کے ہمراہوں میں صلوٰۃ خوانی درویش اپنے عمامہ کی بزدگی کے لیے مشہور ہیں۔ یہ عجیب و غریب طریقہ سے صاف باندھتے ہیں۔ چونکہ ان کا صاف عجابات روزگار ہے۔ اس لیے عمدہ ہائے شاہی اپنے اس عمامہ کو زنان خانوں میں لے جاتے ہیں اور اس کو وسیلہ تفریح خیال کرتے ہیں۔ خیال ہے کہ اس کا وزن بیس سیر سے کم نہ ہوگا۔

### ذکر میر سید محمد

ان کی شخصیت کا جلال و جبروت ان کی مجلس عالی چھائے ہوئے رعسداہ

سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی زندگی میں داخل کمالِ فقہ و تقاضات کا اظہار ان کی خانقاہ کے درو دیوار سے نمایاں رہتا ہے۔ جن پر روحانیت کا نور رستا رہتا ہے۔ اپنی استقامت میں بے مثال شخص ہیں اور سلاطین و امراء کے سامنے حرفِ حق کے لحاظ سے اپنی بے باکی کے لحاظ سے زبان زدِ خلایق ہیں۔

اہلِ دہلی کی طرف سے خانقاہ کی ضروریات جاہداد و جاگیر کی پیش کش کی جاتی ہے، لیکن منصبِ فقر کی بے نیازی ان کی طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتی۔ نذر و فتوح کو بھی بہت کم شرفِ قبولیت عطا ہوتا ہے۔ آپ کا محاذ بہت شیریں اور آپ کی گفت گو بے حد دل نشیں ہوتی ہے

## ذکرِ شاہ کمال

عالمِ فقر و درویشی میں بہت رنگین طبع اور مرزا منش واقع ہوئے ہیں اور اپنے ملبوس کی سب دھج اور خرقہ پوشی کے مخصوص انداز کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ان کا لباس بہت نفیس اور مہین پڑے سے تیار کیا جاتا ہے۔ غذا کے معاملہ میں بھی طرفہ تکلف اور صفائی کا خیال رکھتے ہیں۔ سماع و مزامیر اور وجد و حال کے لیے بے حد شائق ہیں۔ صوفیاء کی اصطلاحات اور مشائخ کے استعاروں کو رنگین عبارتوں اور دل نشین اشارتوں میں ادا کرنے کا ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ عرس کی محفلوں میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ان کی صوفیانہ حرکات اور وجد و حال کے انداز سے اہل محفل بہت محظوظ ہوتے ہیں اور ریختہ کے مناسب حال اشعار سے لطف اٹھاتے ہیں۔

## ذکرِ شاہ غلام محمد

ہر سہ شنبہ کو آپ کے یہاں مجلسِ سماع منعقد ہوتی ہے اور شہر کے تمام قوال اور دیگر اربابِ ذوق حاضر ہوتے ہیں۔ آپ کا بیشتر وقت سیر و سلوک کے مراحل کی سیر

میں صرت ہوتا ہے اور اکثر آپ پر حالت مراقبہ طاری رہتی ہے۔ دبدو سماع سے خاص ذوق رکھتے ہیں۔ تاج خاں قوال کے گھر پر ہر مہینے کی نوں تاریخ کو جو مجلس سماع منعقد ہوتی ہے، اس میں آپ بھی رونق افروز ہوتے ہیں۔

### ذکرِ شاہِ رحمت اللہ

شہر کے امراء اور ذی عزت لوگ بیشتر ان سے عقیدت و ارادت رکھتے ہیں اور ان کے سلسلہ عالیہ سے مربوط ہیں۔ ان کا علقہ ذکر ہمیشہ معمور رہتا ہے۔ یہ ان کی محفل کرامت منزل کا ایک لازمی جزو ہے۔ ہر چند کیفیت معنی سے بے نذر ہتے ہیں، لیکن ساغر کشی سے شوق رکھتے ہیں۔ غالباً یہ کسی مصلحت کے باعث ہوگا۔ ورنہ ظاہرہ طور پر اس میں کوئی حکمت ہونی چاہیے۔

### ذکرِ جنونِ نانک شاہی

یہ شخص بے حد کمزور اور نحیف الجثہ ہونے کی وجہ سے اپنے نام کا صحیح مصداق ہے اور اپنی ایک خاص وضع کے اعتبار سے بہت مشہور ہے۔ اس کا آستانہ دریائے جمنہ کے کنارے ہے اور اپنی وضع قطع میں بہت خوبصورت ہے۔ یہ نانک شاہی فقیر ایک خاص وقت میں اپنی خلوت گاہ سے برآمد ہوتا ہے اور طالبان دیدار کو باریابی کا موقع ملتا ہے۔ اکثر ہندو اور مسلمان اس کے درشن کرنے کے لیے اس پر فضا مقام تک پہنچتے ہیں اور بہت تعظیم و تکریم کے ساتھ اس سے ملتے ہیں۔ وہ اپنی مسند پر براجمان ہوتا ہے تو ایک خاص جگہ پر ایستادہ دو آدمی اُسے مورچیل جھلتے رہتے ہیں۔ قسم قسم کی مٹھائیاں پھول اور پھل اس کو نذر کیے جاتے ہیں۔ وہ ان میں سے تبرک کے طور پر سب کو بانٹ دیتا ہے۔ یہ فقیر اس انداز تمکنت کے ساتھ بیٹھتا ہے کہ کسی کو اس کے سامنے لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی اور یہ خود بھی بہت کم بولتا ہے، لیکن قوالوں کی آمد و رفت کا یہاں تا نانا بندھا رہتا ہے، اور

نغمہ سرود کے نذرانے پیش ہوتے رہتے ہیں۔ شہر کے مہتموں لوگ اسے گرانقدر تحائف اور نذرانے پیش کرتے رہتے ہیں اور بہت لوگ ہیں جو اس کی صلہ بخششوں کے باعث آرام سے گزاران کرتے ہیں۔

ضرورت مند اور اہل احتجاج بھی یہاں آتے رہتے ہیں اور اس کی عطا اور بخشش سے اپنے اپنے مقدر کے مطابق کامیاب ہوتے ہیں۔ یلی کی طرح محفل میں رہنے والی پردہ نشین عورتیں بھی میانوں میں سوار ہو کر یہاں آتی ہیں اور اپنی ساریوں کو سایہ دار درختوں کے نیچے کھڑا کر یہاں کے کنحوں اور حین بندیوں کی سیر کرتی ہیں۔ وہ تنہائی میں اس درویش سے ملاقات کرتی ہیں اور اپنے دل میں چھپے ہوئے بھیدوں اور آرزوؤں کو اس کے سامنے ظاہر کرتی ہیں اور اس سے دعا اور توجہ کی طلب گار ہوتی ہیں۔

شاید یہ شعر اسی شخص کے لیے کہا گیا ہو گا:

بشے مجنوں بہ لیلے گفت اے معشوق بے پردا

ترا عاشق شود پیدا و لے مجنوں نہ خواہد شد

بہار کے موسم میں اس تیکہ گاہ کی فضا اور بھی پر کیف ہو جاتی ہے اور سیر و تماشا

کے لیے یہاں آنے والوں کو عجیب لطف و انبساط کا ماحول میسر آتا ہے۔

ماہ محرم کی دسویں تاریخ کو خامس آل عبا کے علموں کی غسل دہی کا دن ہوتا

ہے اور اس روز زائرین کا طرفہ، بحوم دیکھنے میں آتا ہے۔

مختصر یہ کہ مشرب صلح کل کے اعتبار سے یہ جگہ قابل سیر ہے اور یہ نانک شاہی فقیر اس

لائق ہے کہ اس کی صحبت میں کچھ وقت گزارا جائے۔

## ذکرِ ریتی

فن کشتی سے دل چسپی رکھنے والے بچیلے رنگیلے جوان جوق در جوق یہاں آتے ہیں،

اور اظہارِ قوت کے کرشمے اور پہلوانی کے کرتب دکھاتے ہیں۔ ہر ایک جوان زور و قوت میں

اپنے سطلین کسی دوسرے پہلوان سے زور کرتا ہے اور عجیب عجیب داؤ پچ اور طرفہ طرفہ کرتے دکھائے جاتے ہیں جس سے تماشائی محظوظ ہوتے اور ان کے فن کی داد دیتے ہیں۔ یہاں ہر گوشہ میں ایک مجمع رہتا ہے اور ہر سمت خوش مزاجوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی خوش گیسواں کرتیں اور یاران بے تکلف کی صحبت کا سطف اٹھاتی ہیں۔ یہاں شہر کے طرحدار لوگ آتے اور نظر بازان کے دیدار سے دامان نگاہ کو حسن کے پھولوں سے بھرتے ہیں۔

### چوک سعد اللہ خاں

یہ چوک قلعہ معلیٰ کے محاذ میں واقع ہے اور جلو خانہ شاہی کے سامنے کی فضا اس کے رُشور ہنگاموں کی آماجگاہ ہے۔ سبحان اللہ یہاں مجمعوں اور ان کے تماشائیوں کی وہ کثرت ہوتی ہے کہ نظر ان کے ہجوم میں کھو جاتی ہے اور اس قدر گونا گوں مناظر دیکھنے میں آتے ہیں کہ تمنائے دید آئینہ خانہ حیرت میں گم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ خوش ادا مردوں کا رقص اس کی فضا کو قیامت آباد بنائے رکھتا ہے۔ اور ہر سمت افسانہ خالوں کے شور کے باعث یہ میدان محشرستان صوت و صدا دکھائی دیتا ہے۔ زادیان معتبر اصحاب جہ و عمامہ کی طرح لکڑی کی منبر نما کرسیاں بچھائے ہوئے ہر پہننے اور ہردن کی مناسبت سے تقاریر و مواظبا میں مشغول نظر آتے ہیں۔ مثلاً ماہ رمضان المبارک میں وہ روزہ داری کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ ذی الحجہ کے مہینہ میں حج و عمرہ کے مناسک و مراسم کا بیان ہوتا ہے اور محرم کے ماہ مقدس میں رونق شہداء کے مختلف مقامات و بیانات اپنی فصیح و بلیغ تقریروں کی سورت بس پیش کر کے عوام کے دلوں پر گریہ طاری کرتے ہیں اور ایک اچھی خاصی رقم ان سے بطور نذر و پیش کش وصول کرتے ہیں۔ بے جا ادھر ادھر کے لوگ بڑی عقیدت و ابادت کے ساتھ ان جموں میں شریک ہوتے ہیں اور سادہ طبیعت عوام ان واعظین کرام کے گد حلقہ بنا کر بیٹھتے ہیں اور بہت ذوق و شوق سے انکی باتیں



سنتے ہیں اور دو گھڑی رات تک ذکر و عطا کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

بخومی درتال جو ابلہ فریبی میں کمال رکھتے ہیں۔ وہ الگ قرعہ اندازیوں، اور  
یہ ساریوں کا ہنگامہ گرم رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عالم غیب کی مخفی باتیں بتاتے ہیں، اور  
اس طرح دوسروں کو مخفی قوت بناتے ہیں۔ لوگ ان کے پاس آکر اپنی قسموں کا حال  
لوچھتے ہیں اور ان کی جھوٹ موٹ کی باتوں پر خوش ہو کر انہیں کچھ نہ کچھ دے جاتے  
انہیں مجمع رگانے والوں میں کچھ حکمت پیشہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو جگہ جگہ چھڑکاؤ  
کر کے فرش اور جاہنم بچھاتے ہیں اور ان پر رنگ رنگے خریطوں میں بھری ہوئی  
قسم قسم کی دوائیوں کو بڑے سلیقہ سے رکھتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ان کی تھیلیوں میں خاک  
کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، مگر یہ بڑے مٹھاٹھ ہاٹ کے ساتھ دکان لگا کر بیٹھتے ہیں اور بعض  
بعض تو بگڑی سرپیچ سے اپنے سروں کو آراستہ کیے رہتے ہیں۔ اپنی ان دواؤں کے  
بائے بس ایسی لچھے دار تقریریں کرتے ہیں کہ لوگ بیوقوف بن جاتے ہیں اور ان  
دواؤں کی خریداری میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں اور اس طرح ان کی  
دکانوں کے خاک بھی اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

ہر طرح کے سفوف، قرص، معجون، جوب اور ضما د وغیرہ ان کے پاس موجود رہتے  
ہیں۔ مانگے دال جس نوع کی دوائی کا طالب ہوتا ہے، وہ اسے دی جاتی ہے۔ جہاں  
جسسی امراض کے علاج معالجہ کے ماہر دعویدار بیٹھے نظر آتے ہیں، وہاں پاجیوں اور  
رذالوں کا بڑا مجمع ہوتا ہے۔ یہاں جگہ جگہ معدنیات کے کشتے بنا کر نیچے جاتے ہیں اور  
ان سات دھاتوں کا کشتہ بنا کر نیچے والوں کی کٹھالیوں سے جو دھواں اٹھتا ہے، وہ  
تو آس مانوں کو بادلوں کی طرح گھیر لیتا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اپنے مقصد  
دلی کو پالے۔ کیلکڑے اور اسی قبیل کے بعض دوسرے ایسے ہی جانوروں کے تیل کو  
ان دواؤں کا جزو اعظم کہنا چاہیے۔ یہاں اور وہاں جائے تو ان جانوروں کی برشتہ  
لاشیں ان دوا فروشوں کے پاس آپ کو ملیں گی اور یہ کاروبار کرنے والے لوگ خواہشمندوں  
کی خدمت کرنے کے لیے وہاں موجود ہوں گے۔

اسلمہ فروش ہر قسم کے ہتھیار یہاں لاکر بنے پردہ و نیام رکھتے اور خریدار کے جوہر احتیاج کو پرکھتے ہیں۔ پارچہ فروش وضع وضع کے رنگین کپڑوں کے تھان اس طرح ہاتھوں میں لیے اور کاندھوں پر ڈالے پھرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے یہاں کی فضا شفق کے پھولوں کی طرح رنگ رنگ ہو جاتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خریدنے والے کی نگاہ انتخاب کس پر پڑتی ہے۔

دحوش و طیور کا بازار دیکھ کر تو طائر ہوش وحشت آباد کی طرف پرواز کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اتنی رنگ رنگ کی چڑیاں، جڑہ باز، کبوتر، بلس اور دوسرے پرندے یہاں بکنے آتے ہیں کہ ان میں انتخاب کرنا مشکل ہوتا ہے، بجز اس کے کہ کسی نے منطق السطیر پڑھی ہو اور وہ شخص حضرت سلیمانؑ اور آصف برقیہ کی صحبت میں رہا ہو۔ دشت و کوہ کی دنیا کو ویران کر کے ہر روز ان گنت چڑیاں یہاں پکڑ کر لائی جاتی ہیں جنہیں ان کے شیدائی خریدتے ہیں۔ خاص طور پر نوخیر مردوں اور بے پروا جوانوں کا یہاں بڑا مجمع ہوتا ہے۔ تجربے کار صیاد ان بھولے بھلے شکاریوں کی گھات میں بیٹھے رہتے ہیں اور قفس عنصری سے زیادہ خوش نما بھجروں میں ان کو پیش کر کے منہ مانگے دام وصول کرتے ہیں۔

قصہ مختصر تمام انسانی ضرورتوں اور نفسانی خواہشوں کی تکمیل کا سامان یہاں مہیا رہتا ہے۔ چونکہ یہ جگہ قلع کے بالکل سامنے ہے اور امرائے شاہی کا یہاں سے گزر ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں ہر روز قیامت کا سا ہنگامہ پیار ہوتا ہے۔

## چاندنی چوک

یہ شہر شاہ جہاں آباد کا سب سے زیادہ حسین و نگین چوک ہے اور اس کا ماحول شہر کی سب سے زیادہ ساری گذرگاہوں سے زیادہ رکشش ہے۔ "یہ مورونان" شہر کی تماشا گاہ ہے۔

دہلی کے نازک مزاج اور مرزا منش لوگ سیر و تفریح کی غرض سے یہاں آتے

ہیں۔ اس کے راستوں پر لگی اور سچی ہوئی دکانوں میں طرح طرح کے عمدہ کپڑے بچھے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہر نوع کا بیش قیمت سامان یہاں چشم خریدار کا منتظر رہتا ہے۔ دنیا جہاں کی نفیس و نادر چیزیں خریدنے والوں کے دردِ دل پر دستک دیتی ہیں۔ اس کا راستہ نیک بخت لوگوں کی پیشانی کی طرح کشادہ پُر نور ہے اور اس کے دریاں سے گذرتی ہوئی نہر کا پانی موتی کی سی آب رکھتا ہے۔

یہاں ہر دوکان پر بدخشاں کی طرح لعل و جواہر کے ڈھیر نظر آتے ہیں اور ہر کارگاہ میں بحرِ عمان کے دامن کی طرح موتیوں کا انبار ملتا ہے۔ ایک طرف جوہری ہیں کہ بڑی شان بے نیازی کے ساتھ نیکہ لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور ان کے دلال اپنی چرب زبانی سے خریداروں کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں اور ترغیب و تحریس کا باعث بنتے ہیں۔ دوسری طرف پارچہ فروش اور دوسری اشیاء کے تاجر ہیں، جو اپنی سچی سچائی دکانوں میں خریداروں کو بار بار بلاتے ہیں اور وہ عالم ہوتا ہے۔

بشنود یا تشنود ما گفتگوئے می کینم

طرح طرح کے عطریات اور خوشبودار چیزوں سے اڑتی ہوئی دکان داروں اور دلالوں کے کچھ کہے بغیر بابِ خواہش کے مشام جاں کو معطر کرتی ہیں۔ اسی طرح دوسری نفیس اشیاء کی موجِ شوخی بنا کسی بیخ و شرک کی ہمت کے آرزوئے حسوں کی ہلاکت جنباتی کرتی ہے۔ ایسی ایسی خوشنما تلواریں جن کو دیکھے تو معشوقوں کی ابروئے خمدار جھونک کھا جائے اور غفلت کے ساتھ ان کے قبضہ پر ہاتھ پڑ جائے تو مصلحت سے دست کشی کے لیے ”برہان قاطع“ بن جائے۔ نئی نئی وضع کے کنار جو زبان یار کی طرح حریف کے جو یا نظر آتے ہیں۔ ان سے نگاہ بچار گندنا ہی بڑی دانائی ہے۔ چینی کے برتن ایسے ہی حسین و خوش وضع کہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا خوصلہ کے شیشہ خلتے ہیں پتھر پھینکنے کے برابر ہے۔ شیشے کے حقے، سونے چاندی کے نازک کام کے ایسے پتھروں کہ فلکِ حقہ باز کی آنکھوں نے بھی ان کی نظیر نہ دیکھی ہوگی۔

ادھر دیکھیے تو جام جہاں نما شراب کے پیالے اس خوش و سخی کے ساتھ دوکانوں میں آراستہ نظر آئیں گے کہ ان کی طرف نگاہ اٹھائے تو زاہد صد سالہ کا تقویٰ لوٹ جائے۔ یہاں لوگ بیچنے کے لیے ایسے قیمتی کپڑے ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں کہ ایسے خوبی و لطافت والے پارچہ جات بڑے بڑے امیروں کے یہاں کم ہی ملیں گے، مگر انہیں یہاں کے دوکاندار اپنی دوکانوں پر سجانا اور بیچنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

ان باتوں سے قطع نظر شام کے وقت یہاں رنگارنگ جلوؤں کی وہ کثرت ہوتی ہے کہ ان کو دیکھ کر شفق شام بھی جوشِ رشک سے موجِ خون میں نہا جائے، اور دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے وہ بہارِ آفریں نطائے ہوتے ہیں کہ ان کی نیرنگیاں چمن کدوں کی سیر میں بھی کہاں میسر آتی ہیں۔

یہاں کے قہوہ خانوں میں جو عین فضائے چوک میں واقع ہیں۔ شعر و سخن کے رسیار ہر روز جمع ہوتے ہیں اور بذلہ سخی و سخن درسی کی داد دیتے ہیں۔ عالی مرتبت امرار اپنے غلوے جاہ کے باوصف یہاں سیر سپاٹے کی غرض سے آتے ہیں۔ یہاں ہر روز ایسی ایسی نفیس و نادر چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ اگر کسی کے پاس قارون کا خزانہ ہوتا، تب بھی وہ ان سب کو خریدنے اور حاصل کرنے کی آرزو نہیں کر سکتا۔ ایک نو عمر امیر زادہ اس چوک کی سیر کی ہو، اس اپنے دل میں رکنا مٹھا۔ اس کی ماں نے اُسے بہت کچھ سمجھا، بچھا کہ اُسکے باپ کی چوڑی ہوئی دولت میں سے آیا۔ لاکھ روپیہ دیا اور کہا جانِ مادر! ہمارا پہلے جیسا زنا اب نہیں رہا، اس رقم میں سے جو ضرورت کی چیزیں ہتھیں اچھی لگیں خرید لینا۔

## ذکر کیفیتِ بسنت

جس ماہ میں بسنت کا جشن ہوتا ہے، اس ماہ کی چاند رات کو قدم شریف (قدم گاہ جناب رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) میں عجیب مجمع دیکھنے میں

اتاپ اور طرف ہنگامہ ہوتا ہے۔ اس روز صبح سویرے اہل سنہر بہت بن سنہر کرتے ہیں اور اس بہارستان فیض کے راستوں میں دو طرفہ رنگازنگ فرش فرش پچھاتے اور مکانوں کو طرح طرح سے آراستہ کرتے ہیں۔ بالخصوص اس بہشت کدہ کے صحن میں اور اس کے آس پاس خوشبوؤں اور مسترتوں کی بساط بجانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور قوالوں، مجرایوں اور زیارت کے واسطے آنے والوں کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔

اسی اثنار میں قوالوں اور نغمہ سرانی کرنے والوں کے طوائف بڑی تزیین اور آرائش کے ساتھ قسم قسم کے پھولوں کے گلہ سستے لیے اور گل دریا حین کو خوب صورتی کے ساتھ کوزوں میں سجائے ہوئے کہاں جوش عقیدت کے ساتھ نغمہ سنجی اور زمزمہ سرانی کرتے ہوئے اس مقدس و مطہر جگہ کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ انہیں کے ساتھ زیارت کے لیے اس سعادت گاہ کی سمت بصد حلوں و عقیدت آنے والوں کی جماعت ہوتی آنے والوں پر عرق گلاب اور عطریہ مشک چھڑکا جاتا ہے،

رنگین و حسین شیشیوں میں بھرے ہوئے عطریات اور خوشبودار اشیاء سے لوگ ایک دوسری کی تواضع کرتے ہیں۔ عصر بیزی و گلاب پاشی کے اس ماحول میں خوشبوؤں سے بھری اس فضا میں پری جمال حسیناؤں اور حور شمائل نازنینوں کے ہاتھوں میں بید مشک و گلاب اور بہار آفریں خوشبوؤں کے حسین و نازک سیٹھے دیکھ کر تماشا بینوں کے حوصلوں کے شیشہ خانے سنگ بلائے عشق سے چور چور ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور نگاہ دور ہیں اور عقل مصلحت اندیش کا تو جیسے یہاں گذر ہی نہیں ہوتا۔

ان لمحوں میں مشک و گلاب میں بسی ہوئی اس بارگاہ قدسی کی فضا بے حد جنوں انیکر ہو جاتی ہے، اس ہوش ربا حالت کو دیکھ کر طبیعت بے اختیار مائل بہ فریاد ہوتی ہے اور جہاں آباد کے سینوں کے جلوے تماشا بینوں کے اجزائے حواس کو خاک گرد و بار کی طرح بکھر دیتے ہیں۔ ایک سمت نوخیز نغمہ نواز اور شیریں ادا مطرب

اپنی مسح کر دینے والی خوش ادائیگی کے ساتھ صغیں باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں، اور ساز و آواز کے ساتھ اس شفاعت گاہ میں رسم مجرا بجالاتے ہیں۔ تو دوسری طرف عمر قوالوں کے طائفے سر عقیدت خم کیے ہوئے نذرِ نغمہ پیش کرتے ہیں اور نغمہ و سرود کے نذرانے کو اپنی دانست میں عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ انہیں میں وہ سنجیدہ زائرین اور ثقہ حضرات بھی ہوتے ہیں جو حضور و خشوع کے ساتھ سر جھکائے ہوئے درود و سلام کی ڈالیاں پیش کرتے ہیں۔

طلوعِ صبح سے لے کر عصر کی نماز کے وقت نواسنجوں اور نغمہ طرازوں کی ٹولیاں نوبت یہ نوبت حاضری کی سعادت حاصل کرتی اور مراسم مجرا بجالانے میں بڑی آداب شناسی کرتی ہیں۔ قریب شام کو یہ لوگ اپنے دامنِ مراد کو قبولیت کے پھولوں سے بھر کر اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔

دہلی کی زندگی کے جشنوں، جلوسوں، میلوں، جھیلوں کی رونق ان کے سوا کچھ اور اربابِ محفل بھی ہیں جو قوال ہیں، نقال ہیں، بھگت باز ہیں، رقص و سرود کی محفلوں اور عیش و نشاط کی مجلسوں کو جھتے جاگتے کردار عطا کرنے والی طہوالفیس اور ڈومیناں ہیں۔

## اربابِ نشاط

اس کے حسین روپ دل آویزاں اداؤں کے مشاہدہ سے چشمِ تمنا روشن ہوتی ہے اور اس کے جمالِ دل آرا کے پرتو سے افسردہ خاطر رشکِ چمن بن جاتے ہیں۔ اس کی آواز کی ہمت آفرینی نسیمِ سبا کی طرح بہار آفریں ہے اور اس کے نغموں کی صدا غنچوں کے چٹکنے کی آواز کی طرح مشامِ جاں کو عطر آگیں کرتی ہے۔ اس کے رقص کی شیرینی حرکات سے رنگ بھرتے ہیں اور اس کے معشوقانہ ناز و غمزے دیکھنے والوں کو اپنے خوبصورت جمال میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ وہ اسبابِ وجد و حال کی محفلوں کی شمعِ حسین اور اربابِ جاہ و جلال کی مجلسوں کی فانوسِ رنگین ہے۔ اس کے حسن کی کرنیں دیکھنے والی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہیں اور اس کے جلوؤں کے نورانی آپنچ

عقل کی آنکھوں پر طلسمی پردے ڈال دیتے ہیں۔

بغیر کسی وسیلے کے اس تک رسائی کی صورت نہیں اور اس کی ملاقات کی صورت کا حصول بغیر مناسب مخالفت اور تواضعات کے بہت مشکل ہے۔ خدا کرے جیسا میرا دل چاہتا ہے، اس کے مطابق اس کے حسن کی جلوہ گاہ کی سیر ممکن ہو سکے اور دست شوق اس کے دامنِ تمنا تک پہنچ سکے۔

## نوربائی

نازوادا کے چمن کی حسین کٹی اور دلِ عشق منزل کی قندیل آرزو کی روشنی جس کا نام نوربائی ہے۔ دہلی کی مشہور ڈومنی رقصہ و مغنیہ ہے۔ اس کی شان و آن کا کیا ٹھکانہ ہے کہ بڑے بڑے امراء اس کے دیدار و ملاقات کی تمنا اپنے دل میں رکھتے ہیں اور کچھ اُس کے دولت کدہ پر جاچتے بھی ہیں۔ اس کا گھراہل دولت کے محلات کی رح ہزار ساز و سامان سے آراستہ رہتا ہے۔ درو دیوار سے رنگینیاں برستی ہیں۔ اس کا رنگ تجمل اور اس کی سواری کی آن بان کا کیا کہنا۔ چادش و چوبدار اس سواری کے آگے چلتے ہیں۔ بیشتر وہ ہاتھی پر سوار ہو کر گزرتی ہے اور امراء کے یہاں اس کی سواری آتی ہے تو ایک رقم جو اہر سے اس کی تواضع کی جاتی ہے۔

— پیش قیمت سامان اور نقد روپیہ اس کے گھر بھیجا جاتا ہے، جو دراصل قبولیت کی خوشی میں ہوتا ہے۔ رخصت کے وقت کی پیش کش کو بھی اس سے قیاس جاسکتا ہے۔ اس کی محبت کا مزا تو خانہ خرابی ہے۔ جو بھی اس کا ذوق رکھتا اور اس کی آشنائی کا نشہ جس کے سر پر سوار ہوتا ہے، وہ بے تابانہ اپنی دولت و غبار کی طرح اڑا دیتا ہے۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے اپنی ثروت کو اس کے پس پچھاؤں کر دیا ہے اور کتنوں کے صبر و قرار کو اس شکر نے لوٹ لیا ہے۔

ی شخص کی جیب روپوں سے بھری ہے وہ اس کی صحبت سے لطف اٹھا سکتا ہے جب تک کہ کسی کے پاس زر و نقد موجود ہے، اس کا نخرہ گوہر تمکین کے ساتھ

ہم ترازو ہے اور اس کا رنگ و روپ پھولوں اور کلیوں کے حسن و رنگ کو شرماتا ہے۔ وہ اپنی سخن فہمی کے اعتبار سے بے نظیر ہے اور خوش گفتاری کے لحاظ سے بے مثال۔ اس کے روزمرہ کی لطافت سامع کو کوثر و نسیم کی موجوں میں ڈبو دیتی ہے اور ادلے محاورہ میں کیا کہوں کہ اس کی زبان کیا گل کرتی ہے۔

ایسا رنگین طبع معشوق اگر مل جائے تو سب ادیکر بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ مفت ہاتھ آیا اور ایسے شوخ مزاج کی ہمدی اگر میسر آجائے تو گویا ساری دنیا کی راحتیں مل گئیں۔ اس کی مجلس کے آداب رسوم ایسے ہیں کہ بڑے بڑے ادیب اس سے سبق لیں اور تمام حاضرین بزم نشاط کے لیے اس کی خاطر داریاں کچھ ایسی ہیں کہ بڑے بڑے دعویداران تہذیب و اخلاق اس سے شائستگی کے اطوار سیکھیں۔ اس کی نغمہ سنجیاں بھی لطف و انبساط سے خالی نہیں۔ ارباب موسیقی اسے پسند کرتے اور اہل نغمہ اسے دوست رکھتے ہیں۔

غزل اور ٹھہری جو اس وقت دہلی میں بے حد مقبول ہے، اس نے خوب مشق اس کی بہم پہنچائی ہے۔ وہ اپنے طائفے کے ساتھ کہ ان میں سے ہر ایک بیگم اور خانم کہلاتی ہے شریک بزم نشاط اور محفل آرائے انبساط ہوتی ہے اور ہر ایک کی طبیعت کی مناسبت سے سفارش کرتی ہے۔ چوں کہ ہر محفل میں اس کی خاطر داریوں کو عزیز نہ رکھا جاتا ہے، اس کے لیے جو کچھ وہ گاتی ہے، اس پر قبولیت کے زرد گوہر نثار کیے جاتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ نور بانئی جو کچھ ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، سننے سے نہیں۔ فیر کو بھی ایک بار اس کی صحبت سے لطف اٹھانے کا موقع ملا ہے۔

## چمنی

دہلی کی مشہور طوائف اور ایسی گانن ہے جس کی رسائی بادشاہ تک ہے، اور فن موسیقی میں کمال حاصل کرنے کے باعث اس کا شمار اس دور کے بہت ممتاز اہل فن میں ہوتا ہے۔ ہر جگہ اس کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، مگر اس کی



محبت بغیر کافی روپیہ خرچ کیے میسر آجائے، یہ ممکن نہیں۔ اس کی موجودگی لطفِ محفل کو بڑھا دیتی ہے۔ اس کا روزمرہ سن کر طبیعت کھل اٹھتی ہے۔ اس کے کلام میں بڑی پختگی ہے۔ چوں کہ اس کی جوانی کی رات اب بھیگ چلی ہے اور صبح پیری کے آثار نمودار ہو چکے ہیں: اس لیے اب اس کی صحبت کے وہی لوگ مہتمن رہتے ہیں جو ذوقِ لغت رکھتے ہیں اور صدائے حسین سے محفوظ ہوتے ہیں۔ شاہِ سلامت بھی کبھی کبھی یاد کرتے اور اس کی طرف التفات فرماتے ہیں۔ اس کے دل آویز نغمے طائرِ ہوش کو پر نل پر داز کرتے ہیں اور اس کی آواز کا سحر بہتی ہوئی ندی کو روک دیتا ہے اور اس کی ترانہ سبجوں نے جیسے دوسرے موسیقاروں کے منہ میں زبان نہیں چھوڑی۔ ایک بار میں نے بھی اس کی محفل میں صبح کی ہے۔

### ادبِ کیم

دہلی میں ان کے باپے میں مشہور ہے کہ پاجامہ نہیں پہنتیں اور جسم کے زیریں حصہ کو قلم نقاش کی رنگ آمیزیوں سے اس طرح سجاتی ہیں کہ معلوم ہو پائے، جامہ پہننے ہوئے ہیں اور حقیقت یہ کہ وہی تمام گل بوٹے جو رومی کخواب میں ہوتے ہیں، قلم سے انہیں کمالِ زیبائی کے ساتھ جسم پر منقش کر دیا جاتا ہے۔ وہ امراء کی محفلوں میں جاتی ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے پائے جامہ نہیں پہنایا سب سے قلم کی رنگ آمیزیاں ہیں۔ اس پردہ دری کے ساتھ کبھی کبھی ان کی بے پردگی نہیں ہوتی اور کوئی شخص اس صناعت کی ہتہ تک نہیں پہنچتا۔ چونکہ نظر کے یہ دھوکے ندرت سے خالی نہیں، اس لیے دلوں کو بہت مرغوب ہیں۔

### بھینانے قبیل سوار

(چوں کہ یہ ہاتھی پر بیٹھ کر کوچہ و بازار سے گذرتی ہے، اس لیے قبیل سوار کہلاتی ہے) دہلی کی مشہور رقاصوں میں سے ہے اور ڈیرہ دار طوائفوں میں بڑا درجہ رکھتی ہے۔

چوب دار اس کے گھر پر نوکر ہیں۔ امرار کے ساتھ اس کے تعلقات برابری اور ہم چشمی کے ہیں۔ ان کو سفارشی رقعے لکھتی ہے اور وہ اسے قبول کر کے گویا احسان مند ہوتے ہیں۔ اس سے پیشتر اعتماد الدولہ سے اس کا خاص تعلق تھا۔ وہ اس کے گھر جاتے تھے۔ ایک مرتبہ رسم تواضع کے طور پر، نادر نوش کے ظروف و آلات جس سے مراد پیالے اور گلابی وغیرہ ہیں، اس کے یہاں بھیجے گئے۔ چوں کہ وہ سب کے سب نرصح تھے اور ان بیش قیمت ظروف کا مول ستر ہزار روپے تھا۔ اسی سے اس کے تموں کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔

## خوش حال رام حتمی

اعتماد الدولہ کی سرکار سے وابستہ ہے۔ عجیب آن بان کی طوائف اور کٹھنسی کی مغنیہ ہے۔ جس محفل میں رقص کرنے کے لیے جاتی ہے۔ وہاں اعیان شہر اور امرے دربار اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ناز نخرے کا یہ عالم ہے کہ یہ کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتی اور کسی سے بات نہیں کرتی۔ اس کی نغمہ سرائی کا انداز بے حد دل کش ہے اور اس کی ادائیں بہت ہی بھلی لگتی ہیں۔ اس کمال شہرت کے ساتھ ساتھ محفلہائے نشاط میں اُسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور خود ارباب نشاط اور اہل موسیقی میں اس کی بڑی آؤ بھکت ہوتی ہے۔ کبت خوانی میں اس کا انداز قدیم کلاؤنوں جیسا ہے اور اس میں بڑا اچھا ہے اور اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ داستان فن کی طرح بہت مربوط اور باضابطہ ہے۔ اس کے نغمے ہر جگہ مرغوب ہیں اور اس کا رنگ و آہنگ ہر محفل میں دلوں پر سحر کرتا ہے۔ چونکہ اس کی عمر پختہ ہو چکی ہے۔ اس لیے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے دلوں پر اس کے حسن کی برجھائیاں دھندلی پڑتی جا رہی ہیں، لیکن جو فن کے قدردان ہیں وہ آج بھی اس پر جان دیتے ہیں اور یہ ہے کہ وہ شائستہ عزت ہے بھی۔

## چاک مک دمانی

اپنی جوانی کی بہاروں کے دنوں میں بھی بڑی شوخ طبع تھی اور چاہنے والے اس کی ایک ایک آواز پر جان دیتے تھے۔ خود بادشاہ جم جاہ بھی اس پر فریفتہ تھے۔ اور چاک مک دمانی کا خطاب انہیں کا بخشتا ہوا ہے۔ اب اس کے شباب کا سورج نیشب کی وادی کی طرف ڈھل گیا ہے۔ اب وہ بات تو باقی نہیں رہی تاہم اس کے نعموں کا گداز ہنوز سماع نواز ہے۔ اور اس کی آواز کا جادو اب بھی دلوں پر چلتا ہے۔ کبھی تو یہ دور تھا کہ ہزاروں اس کی تواضع پر صرف کیے جاتے تھے، تب وہ شب مراد آتی تھی کہ اس کی صحبت سے کوئی لطف اندوز ہو۔ اور زرد گوہر اس پر بچھا دے۔ لیکن اب بھی کافی رقم صرف کیے بغیر اس کے نعموں سے لطف اندوزی مشکل ہے اور اس سے آشنائی پیدا کرنا بڑی منتوں کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

بھگت بازوں میں تھی شجودہ طر آزان ہندوستان کا سرخیل ہے۔ شاہ دانیالی نقالی اور لطیف بازی میں بے مثال شخص ہے۔ قوالوں کے زمرہ میں رحیم خاں، دولت خاں، گیا خاں اور جٹا قوال ارباب وجد و حال کے مجموعوں کی زینت ہیں۔

غرض کہ محدث شاہی عہد کا یہ مرقع اس دہلی کا فانوس خیال ہے، جس کے بائے میں میر نے کہا تھا،

دلی کے نہ تھے کوچے اور اق مصور تھے  
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی!





